Scanned with CamScanner

گل مینہ

زیف سیّد

رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز

Scanned with CamScanner

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : گُل مینہ
مصنف : زیف سید
اہتمام : ارشد ملک
زیرِ نگرانی : وسیم عباس
پروجیکٹ کوارڈینیٹر : عادل حسین مغل
کمپوزنگ / ٹائٹل : خاوری
پروف ریڈنگ : رفاقت راضی
موسمِ اشاعت : جنوری 2019
مطبع : فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی

قیمت 700 روپے

[illegible]

رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز
اقبال مارکیٹ اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی Ph: 051-5551519

051-5531610
اشرف بک ایجنسی
کمیٹی چوک، اقبال روڈ، راولپنڈی

کتاب چھپوانے کے لیے رابطہ کریں 051-5551519

لبوں پہ لکنتوں کی برف جم گئی
طویل ہچکیوں کا ایک سلسلہ
فضا میں ہے
لہو کی بو ہوا میں ہے

(شہریار)

1

گل مینہ نے بارہ بار گھڑیال کی ٹن ٹن سنی اور جب ایک بار پھر رات خاموشی میں ڈوب گئی تو وہ سانسیں روکے ہوئے اتنی آہستگی سے لحاف اٹھا کر اپنی چارپائی سے اتری کہ ذرا بھر چرچراہٹ نہیں ہوئی۔ سیلوں سے چلنے والا یہ گھڑیال ایک رشتے دار نے پچھلے سال کراچی سے واپسی پر تحفے میں دیا تھا اور یہ ہر گھنٹے کے علاوہ پندرہ، تیس اور پینتالیس منٹ کی بھی خبر دیا کرتا تھا۔ نرم و گرم لحاف سے نکل کر وہ کچھ دیر چارپائی کے پاس کھڑی رہی پھر آہستگی سے چادر کندھوں پر درست کی۔ رات وہ سویٹر پہن کر اور چادر اوڑھ کر لیٹی تھی۔ اس نے جھک کر چارپائی کے نیچے سے گٹھڑی نکالنے کی کوشش کی۔ ساتھ والی چارپائی پر بھتیجا کسمسایا۔ وہ وہیں منجمد ہو کر رہ گئی۔ جب دو تین منٹ کے بعد گل مینہ کو اطمینان ہوا کہ وہ بدستور سو رہا ہے تب اس نے دھیرے سے گٹھڑی اٹھا کر بغل میں دابی، پھر لحاف کے اندر سے تھری ناٹ تھری بندوق نکال کر کندھے پر ٹکائی اور پنجوں کے بل اندازے سے دروازے کی طرف چلی۔ بستر میں اس کے بدن سے حرارت پا کر بندوق کی نال ابھی تک گرم تھی۔ بھابھی کی چارپائی پر مکمل خاموشی طاری تھی۔ وہ ویسے تو اندر کمرے میں بھائی کے ساتھ سوتی تھی لیکن دو دن پہلے ان کی لڑائی ہو گئی جس کے بعد اس نے اپنی چارپائی یہاں منتقل کر دی تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی لیکن گل مینہ کی ساری زندگی انھی چار دیواروں کے بیچ میں گزری تھی اس لیے وہ چپے چپے سے واقف تھی۔ دروازے کی کنڈی کھولتے کھولتے اسے پانچ منٹ لگ گئے۔ کواڑ کھلتے ہی سرد ہوا کا جھونکا تھپیڑے کی طرح اس کے بدن سے ٹکرایا اور اسے سر سے پاؤں تک لرزا گیا۔ اندر کے گھپ اندھیرے کی نسبت باہر دودھیا سا دھندلکا چھایا ہوا تھا اور آلوچے کی پنکھڑیوں جتنے برف کے چپ چاپ گالے آس پاس گر رہے تھے۔ اس نے کل شام دیوار کے ساتھ ایک گول پتھر رکھا تھا جو ابھی تک وہیں پڑا تھا، البتہ اس

Scanned with CamScanner

کے اوپر برف کی آدھ انگل تہہ جم گئی تھی اور وہ خود بھی برف کی سل جیسا ٹھنڈا تھا۔ اس نے پتھر دروازے کے آگے رکھ دیا تا کہ وہ ہوا سے کھل نہ سکے۔

گٹھڑی ایک کندھے پر ڈال کر اور رائفل دوسرے پر لٹکائے جب وہ بغلوں میں ہاتھ داب کر نیچے دریا کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر مڑی تو گھر کے اندر سے گھڑیال کے سوا بارہ بجانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ چونک کر رہ گئی کہ اس پر یہ دورانیہ کئی گھنٹوں کی طرح گزرا تھا۔

گھر سے بیس قدم کے فاصلے پر شوال ندی تھی جس کا بہاؤ گرمیوں میں اس قدر تیز ہوا کرتا تھا کہ دیودار کے دیوقدتنوں کو بہالے جاتا تھا لیکن اس وقت گل بینہ چھوٹے چھوٹے پتھروں پر قدم رکھتے ہوئے آسانی سے اس کے پار چلی گئی اور دوسری طرف جا کر گٹھڑی اور رائفل نیچے رکھ دیں اور خود ایک چٹان کے چھجے کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔ اس کے بھائی اوپر پہاڑ پر جا کر جلانے کے لیے لکڑیاں کاٹ کر لاتے تھے اور اس چھجے دار چٹان کے نیچے سوکھنے کے لیے رکھ دیتے تھے۔ بچپن میں گل بینہ اور دوسرے بچے بڑی کوشش کر کے اس کے اوپر چڑھا کرتے تھے۔ خشک کائی سے ڈھکی ہوئی سلیٹی چٹان کے اوپر انسانی پاؤں کی شکل بنی ہوئی تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ لنگڑے دیو نے راجہ رسالو سے لڑتے لڑتے شیرمل پہاڑ کی برفانی چوٹی سے یہاں چھلانگ لگائی تھی جس سے اس کا ایک پاؤں یہاں چٹان کے اوپر دھنس گیا۔ گل بینہ کو اس کی اوٹ میں سکون ملا۔ قریب ہی ندی ایک ہلکی سی سرگوشی کے ساتھ بہہ رہی تھی، برف کے گالے غیر محسوس چھپاکے سے پانی میں گر گر کر تحلیل ہو رہے تھے اور زرجانان کا کہیں اتہ پتہ نہیں تھا۔

پتہ نہیں قصور کس کا تھا۔ بڑے بھائی کا جو پچاس ہزار روپے لے کر اسے اگلے جمعے بڈھے کھوسٹ ملک عطاءاللہ جان کے کھونٹے سے باندھنا چاہ رہے تھے، جس کے چند بچے کھچے دانت نسوار کھا کھا کے پیلے پڑ گئے تھے، اور جو ہنستا تھا تو لگتا ہے کہ کھانس رہا ہے اور جب کھانستا تھا تو لگتا تھا ہنس رہا ہے۔ 'ساری زندگی ملکیانی بن کر راج کرے گی، راج' سب یہی کہتے تھے۔ لیکن

وہ خود سے بڑی عمر کے بیٹوں اور بیٹیوں کی اماں بن کر راج نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دادا کا تصور تھا کہ وہ تین دن پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے، یا پھر ان رسوم کا دوش تھا جن کی بنا پر اسے اپنی زندگی کے فیصلے کے بارے میں بولنے کا اختیار نہیں تھا، یا پھر خود اس کا، جو یوں رات کے اندھیرے میں گھر کی عزت داؤ پر لگا کر چلی آئی تھی۔

اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ صبح تک کسی کو اس کے غائب ہونے کا پتہ نہیں چلے گا۔ صبح بھابھی جب اسے اٹھانے کے لیے آواز دے گی اور چارپائی سے کوئی جواب نہیں ملے گا تو وہ آ کر لحاف الٹ دے گی۔ اس وقت پتہ چلے گا وہ گھر میں نہیں ہے۔ شاید وہ سمجھے کہ گل بینہ ندی کے دوسری طرف درختوں میں گئی ہے جہاں گاؤں کی عورتیں جایا کرتی ہیں، لیکن جب خاصی دیر تک اس کا اتہ پتہ نہیں ملے گا تو وہ بڑے بھائی کو جگا کر اسے بتائے گی۔ بھائی گلی میں اور ندی کے اس طرف دیکھے گا، اور جب وہ نہیں ملے گی تو گھر لوٹ آئے گا۔ اس وقت انھیں احساس ہو گا کہ وہ گھر سے چلی گئی ہے۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ بھابھی بڑے بھائی سے کہے گی، 'لو دیکھ لیا اپنی لاڈلی کا کارنامہ، اور سر پہ چڑھاؤ اسے! میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ اس کا جلد کوئی بندوبست کر دو، یہ ہاتھ کے تلے رہنے والی نہیں ہے۔ یہ نیا چاند چڑھا دیا ہے اس نے!' بھائی ڈانٹ کر بھابھی کو خاموش کرا دیں گے۔ وہ بال نوچے گی، چھاتی پیٹے گی، دھیمی آواز میں بین کرے گی، 'ہائے، ہم لٹ گئے، برباد ہو گئے، ناس ماری نے کہیں کا نہ چھوڑا' وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ دونوں کیا کریں گے؟ بڑا بھائی حجرے میں جا کر چھوٹے کو جگا لائے گا اور دونوں ایک بار پھر کسی کو بتائے بغیر اسے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان کی آنکھوں میں خون سوار ہو گا، اور وہ انھیں مل گئی تو اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

لیکن اب بھی وقت ہے۔ وہ اب بھی واپس جا سکتی ہے۔ کھٹ پٹ سے کوئی جاگ بھی گیا تو وہ کہہ دے گی کہ جھاڑیوں میں گئی تھی۔ کسی کو شک نہیں ہو گا۔ پتہ نہیں زرجانان اس کے ساتھ بعد میں کیا سلوک کرے۔ ابھی تو وہ اس سے بڑی محبت کرتا ہے لیکن کون جانتا ہے کہ آگے

Scanned with CamScanner

چل کر کیا ہوگا۔ کہیں وہ اس کے اس طرح گھر سے نکلنے کے بلغنے نہ دینا شروع کر دے؟ لیکن ملک عطا؟ جس نے اس کی پیاری مس فرزانہ کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی بیوی بننے سے تو سب کچھ بہتر ہے۔ موت بھی۔

گل مینہ اس قدر بے چین ہوگئی کہ اس سے بیٹھا نہیں گیا۔ وہ رائفل ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے سر اور کندھوں پر گالوں کی تتلیاں تھرکتی ہوئی آ آ کر بیٹھنے لگیں۔ اتنے میں اسے ندی کے موڑ کی طرف سے ایک ہیولا آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سٹ کر چٹان کے ساتھ لگ گئی۔

زرجانان نے بدن موٹے اونی پٹکا یہ سے ڈھانپ رکھا تھا اور اس کے ایک کندھے پر بیگ تھا جب کہ دوسرے پر کلاشنکوف لٹک رہی تھی۔ 'زرجانان، کہاں تھے تم؟' گل مینہ نے سرگوشی کی، 'مجھے سخت ڈر لگ رہا ہے۔ انھوں نے ہمارا پیچھا کیا تو کیا ہوگا۔ میرا بڑا بھائی غصے کا بہت تیز ہے۔ وہ ہمیں جیتا نہیں چھوڑے گا۔'

'مینو، مینو، مینو، ڈرنے ورنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔' زرجانان نے مینو کے کندھے پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ سٹ کر پیچھے ہٹ گئی۔ 'سب ٹھیک ہو جائے گا، بس تم مجھ پر بھروسہ رکھو۔'

'جیپ کہاں ہے؟' گل مینہ نے پوچھا۔

'جیپ؟ وہ تو میں درے کے اس طرف شاکوٹ میں ایک دوست کے پاس چھوڑ کر آیا ہوں۔ بارش کی وجہ سے سڑک اتنی خراب ہے کہ جیپ نہیں آسکتی تھی، اور اب تو ویسے بھی درہ برف سے بند ہو گیا ہوگا۔ اگر جیپ لے آتا تو وہ ہفتے دس دن کے لیے یہیں بند ہو جاتی۔'

'تو پھر کیسے جائیں گے؟'

شاکوٹ تک پیدل جانا پڑے گا۔ دو ڈھائی گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ جیپ میرے دوست کے گھر کے آگے کھڑی ہے۔ وہاں سے آگے میران شاہ تک جیپ میں جائیں گے۔ میرے پاس تم سے رابطے کا کوئی طریقہ نہیں تھا ورنہ پہلے بتا دیتا۔'

زرجانان اور گل مینہ ندی کے ساتھ پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ گل مینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ 'یہ کم بخت برف سارا بھانڈا پھوڑ دے گی، وہ ہمارے قدموں کے نشانوں پر چلتے ہوئے ہم تک پہنچ جائیں گے۔'

'نہیں نہیں، برف تو ہماری ساتھی ہے، یہ ابھی تو گرنا شروع ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ساری رات گرتی رہے گی اور بہت جلد قدموں کے نشان تو کیا پگڈنڈی کا بھی سراغ نہیں ملے گا۔ تم جلدی کرو۔ اپنی گٹھڑی مجھے دے دو اور بس چل پڑو۔'

اس نے گٹھڑی اور رائفل اپنے پاس ہی تھامے رکھیں۔ وہ کھیتوں کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ملک عطا کے باڑے کی مٹی سے لپی ہوئی دیواروں کے گرد گھوم کر گاؤں سے باہر جانے والی سڑک پر ہو لیے۔ باڑے کے پیچھے گاؤں کا حجرہ تھا جہاں گل مینہ کا بھائی اور کئی دوسرے نوجوان رات کو آ کر سوتے تھے۔ گل مینہ نے ڈر کر ادھر دیکھا۔ اگر وہاں کوئی جاگ رہا ہو تو کیا ہوگا؟ ادھر سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی تو وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ زرجانان نے مڑ کر دیکھا۔ 'اس وقت ادھر کوئی نہیں آئے گا بھئی، بس چلتی رہو،' اس نے سرگوشی کی۔ جلد ہی وہ گاؤں کے آخری گھر کے آگے سے گزر کر درے کی طرف جانے والی کچی سڑک پر آ گئے۔ گل مینہ نے مڑ کر گاؤں کو دیکھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کہیں کسی لالٹین یا کسی دیے کی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ گل مینہ کا حلق آنسوؤں سے نمکین ہو گیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کا ہر قدم اسے گاؤں سے سو میل دور لے جا رہا ہے اور وہ شاید اس ندی، اس جنگل، اس گول پہاڑی کے موڑ کو جیتے جی دوبارہ نہیں دیکھ سکے گی۔

اب سڑک چیڑ کے چھدرے درختوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ کبھی کبھار برف کا کوئی ننھا سا گولا درخت کے سوئی دار پتوں سے پھسل کر ان کے سامنے ٹھس سے آ گرتا اور چکنا چور ہو جاتا اور شاخ کی لچکیلی کمان اس کے بوجھ سے آزاد ہو کر جیسے جھرجھری لے کر دوبارہ سیدھی ہو جاتی۔ چڑھائی بتدریج بڑھتی گئی۔ گل مینہ کو معلوم تھا کہ سڑک تین تنگ موڑ مڑ کر پہاڑ پر چڑھے گی

Scanned with CamScanner

اور پھر کاہو والے درے میں سے ہو کر وادی میں بل کھاتے ہوئے دوسری طرف اترنا شروع ہو جائے گی۔

اب وہ گاؤں سے کم از کم ایک میل اوپر آ گئے تھے۔ گل مینہ گٹھڑی کندھے پر لٹکائے خاموشی سے زرجانان کے پیچھے چلی جا رہی تھی۔ تیسرا اور آخری موڑ مڑنے کے بعد گاؤں نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ گل مینہ نے موڑ سے پہلے ایک بار پھر دور نیچے گاؤں پر نظر ڈالی۔ گرتے ہوئے گالوں کی دھند میں سے گاؤں کا بس تاریک اور گم صم ہیولا ہی دکھائی دیا۔ وہ دوبارہ چلنے ہی لگی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے نیچے گاؤں میں روشنی کی ایک پتلی لکیر نظر آئی، تھوڑی دیر بعد اس لکیر نے حرکت کرنی شروع کر دی۔ پھر ایک اور روشن لکیر نمودار ہوئی اور پہلی روشنی کے قریب پہنچ گئی۔ پھر یہ دونوں روشنیاں تیزی سے دائیں بائیں ہلتی ہوئی سڑک کی طرف بڑھنے لگیں۔ زرجانان نے بھی یہ سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ اس نے لپک کر کلاشنکوف کندھے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ اب نیچے گاؤں کے باہر ایک اور روشنی بھی پہلی دو میں شامل ہو گئی تھی۔

'ہمیں سڑک سے ہٹنا پڑے گا۔ وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔' یہ کہہ کر زرجانان نے گل مینہ کا ہاتھ تھاما اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ دو تین سو گز دور ایک پگڈنڈی سڑک سے الگ ہو کر مشرق کی سمت شیرل چوٹی کی طرف جاتی تھی۔ زرجانان اسی پر ہو لیا۔

2

جنوبی وزیرستان ملیشیا کا حوالدار نیاز بین خان سولہ دوسرے مقامی افسروں کے ہمراہ وانہ قلعے کے مشرقی دروازے کے قریب افسر میس کے باہر آسمان باش کی پوزیشن میں کھڑا تھا۔ کمانڈانٹ میجر گائے رسل میس کی سیڑھیاں اتر کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آیا اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیچھے چار انگریز افسر بھی تھے جو لان کے کنارے پر آ کر ہاتھ پشت پر باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

سورج مغرب میں نیالی پہاڑیوں کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اب ہوا کسی قدر گوارا ہو گئی تھی۔ پچھلے ایک مہینے سے بارشیں نہیں ہوئی تھیں اس لیے آج دن بھر دھوپ تیز تھی۔

نیاز بین کو احساس تھا کہ کوئی انہونی ہو گئی ہے یا ہونے والی ہے۔ کیا؟ اس کا صحیح صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اپنی پانچ سالہ نوکری میں اس نے انگریز افسروں کو کبھی اس قدر سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ میجر رسل کے علاوہ صرف کیپٹن ٹریل پشتو بول سکتا تھا۔ نیاز بین نے اس کی طرف دیکھا کہ کچھ سراغ مل جائے، لیکن اس کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا اور نظریں سامنے پہاڑی پر مرکوز تھیں۔

پانچوں انگریزوں میں صرف میجر رسل نے وردی پہن رکھی تھی۔ لیفٹیننٹ بارکر اور لیفٹیننٹ ہنٹ نیکر اور آدھی آستینوں والی قمیصوں میں ملبوس تھے۔ آدھا گھنٹہ پہلے نیاز بین نے انھیں میس کے پیچھے ٹینس کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔

میجر رسل کے ہاتھ میں پائپ تھا، اس نے ایک بھرپور کش لیا اور مقامی افسروں کی قطار کے آگے ٹہلنے لگا۔ پھر وہ وسط میں آ کر رک گیا اور قطار پر ایک بھرپور نظر ڈال کر دھیمی آواز میں اپنی مخصوص لہجے والی وزیری پشتو میں کہنا شروع کیا:

Scanned with CamScanner

'وفادار ساتھیو اور دوستو، میں ایک ایسی خبر سنانے جا رہا ہوں جس پر شاید آپ کو شروع میں یقین نہیں آئے گا، لیکن میں تمام تر سنجیدگی سے یہ بات بتانے جا رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اسے اتنی ہی سنجیدگی سے لیں۔ مجھے اب سے تھوڑی دیر پہلے حکم ملا ہے کہ ہمیں وانہ کا قلعہ چھوڑ کر جنوب میں سینڈی مین قلعے تک جانا ہے۔ ہمیں یہاں سے ہر چیز نکال کر ساتھ لے جانی ہے، جو کچھ ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا، اسے ضائع کر کے جانا ہے، چاہے وہ اسلحہ ہے، ساز و سامان ہے، خوراک ہے، یا جانور ہیں۔'

نیاز بین منہ کھولے ہوئے یہ سب کچھ سنتا رہا۔ اس نے کچھ افواہیں تو سنی تھیں کہ افغان فوجیں ہندوستان میں داخل ہو رہی ہیں، اور شمال کی طرف پشاور کے قریب انگریزوں اور امیرِ افغانستان کی فوج میں جنگ ہو رہی ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سلطنتِ برطانیہ کے سامنے امیر کی حیثیت وہی ہے جو ہاتھی کے سامنے چیونٹی کی ہوتی ہے۔ وہی سلطنتِ برطانیہ جس نے ابھی تازہ تازہ جرمنوں اور ترکوں کو شکستِ فاش دی تھی، جس کا رسوخ دنیا کے سارے براعظموں میں تھا، اس کے سامنے بھلا کابل کی کیا وقعت؟ اس لیے اس نے کابل کے ہندوستان پر حملے کی خبروں کو معمولی سرحدی جھڑپوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن میجر رسل کی تڑختی ہوئی آواز، اس کے سپاٹ لہجے اور ستے ہوئے چہرے سے اندازہ ہونے لگا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی گمبھیر ہو چلا ہے۔

'افغان فوج کے چودہ ڈویژن جنرل نادر خان کی قیادت میں درۂ کائنو عبور کر کے وزیرستان میں داخل ہو گئے ہیں اور ہم سے صرف پچیس میل دور موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہاتھیوں پر لدی ہوئی اڑتالیس بھاری توپیں ہیں۔ مزید خدشہ یہ ہے کہ یہ خبر سن کر قبائلی بغاوت کا جھنڈا اٹھا لیں گے اور ہم اپنے اس قلعے میں بری طرح محصور ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ قلعہ اکا دکا قبائلی جتھوں کی سرکوبی کے لیے تعمیر کیا گیا تھا، کسی باقاعدہ فوج سے لڑنے اور بھاری آرٹلری کا مقابلہ کرنے کی غرض سے تو بالکل بھی نہیں۔ قلعے کی مٹی کی دیواریں افغان توپوں کی پہلی باڑ بھی نہیں

سہار سکیں گی اور مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جائیں گی۔

'اس لیے ہمارے پاس انخلا کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ لیکن میں آپ کو پہلے ہی سے خبردار کر رہا ہوں کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا، اور مجھے نہیں معلوم کہ جتنے لوگ اس وقت یہاں کھڑے ہیں ان میں سے کتنے منزل تک کامیابی سے پہنچ پائیں گے۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ اس قلعے کے علاوہ ہماری کل چھ ذیلی چوکیاں بھی ہیں، جہاں مختلف تعداد میں دستے تعینات ہیں، ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم انھیں بھی حفاظت سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائیں۔ دو شرقی چوکیوں، ٹیلی کچھ اور سرویکئی، کو پہلے ہی انخلا کر کے براہِ راست مرتضیٰ گیریژن پہنچنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ جہاں تک مغربی چوکیوں، توئی کھلا، خراب کوٹ، حنئی، اور کھجوری کچھ کا سوال ہے تو انھیں ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔'

نیاز بین شروع ہی سے میجر رسل کے تیز ذہن اور منصفانہ مزاج کا قائل تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں کو نوکر اور ماتحت کی بجائے رفقائے کار سمجھتا تھا اور تمام قبائلی افسران اس کی دل سے عزت کرتے تھے۔ میجر نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میری شادی تو فوج سے ہو گئی ہے، اور ویسے بھی وزیرستان میں تو افسروں کی بیگمات کو آنے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے میں یہاں ہوتا اور میری بیوی کہیں مری یا شملہ میں بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتی اور ایک دن مجھے چھوڑ کر چلی جاتی۔

'ہم آج رات گیارہ بجے یہاں سے نکلیں گے، اور سیدھا توئی کھلا چوکی کا رخ کریں گے، وہاں موجود تمام دستوں کو ساتھ لے کر ژوب ملیشیا کے مغل کوٹ قلعے کی طرف مارچ کریں گے، اور وہاں موجود سپاہیوں کے ہمراہ وزیرستان سے نکل کر بلوچستان کے علاقے میر علی خیل تک پہنچ جائیں گے۔ کیپٹن ٹریل ساٹھ پیادہ جوانوں اور دس سواروں کو لے کر آدھا گھنٹہ پہلے یہاں سے خراب کوٹ کی طرف روانہ ہو گئے ہیں، جہاں سے وہ چوکی پر مامور عملے کو لے کر توئی کھلا میں ہمارا انتظار کریں گے، جب کہ لیفٹیننٹ بارکر کھجوری کچھ چوکی میں تعینات عملے کا انخلا کر کے انھیں

Scanned with CamScanner

اپنے ساتھ مغل کوٹ لے آئیں گے، جہاں سے ہم سب مل کر میر علی خیل کی طرف بڑھیں گے۔ وہاں اگر حالات ٹھیک ہوئے تو ہم مزید احکامات کا انتظار کریں گے، ورنہ فورٹ سینڈی مین وہاں سے صرف چودہ میل دور ہے۔ لیکن یہ سب آپ کی مدد اور تعاون کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ آپ ابھی اپنی پلٹنوں میں جائیں اور جوانوں کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کریں اور سفر کی تیاری کریں۔ اگر کسی کے ذہن میں کوئی سوال ہے تو ابھی پوچھنے کا اچھا موقع ہے۔'

تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ سلطنتِ برطانیہ کا قبائلی علاقوں سے انخلا ایسی خبر تھی جسے ہضم کرنا آسان نہیں تھا۔ میجر رسل نے دوبارہ کہا، 'کم آن، مجھے پتہ ہے کہ آپ کے پاس بہت سے سوال ہوں گے۔'

چھجے دار داڑھی والے صوبیدار میجر نذیر خٹک نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ 'میجر صیب، ہم نے آپ کی ساری بات توجہ سے سنی ہے۔ لیکن آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جب ہم یوں سر جھکا کر بھاگیں گے تو ہمارے قلعے کے آس پاس بسنے والے مقامی قبائلی کیا تاثر لیں گے؟ وہ سمجھیں گے کہ افغان فوج کے آنے سے پہلے ہی ہم بزدلوں کی طرح مقابلہ کیے بغیر یہاں سے فرار ہو رہے ہیں۔ بھاگتے ہوئے خوفزدہ دشمن کو نشانہ بنانا دنیا کا آسان ترین کام ہے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہمیں آسانی سے اس علاقے سے نہیں نکلنے دیں گے۔ مجھے ہر طرف شدید خطرہ نظر آ رہا ہے۔'

میجر رسل نے اپنے پائپ سے ایک بھرپور کش لے کر دھویں کا مرغولہ ہوا میں چھوڑا۔ 'صوبیدار خٹک، میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں، اس لیے میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ یہ کام مشکل اور خطرناک ہے، لیکن یہ بہادری اور بزدلی کا معاملہ نہیں ہے۔ مجھے پولیٹیکل ایجنٹ میجر کروستھ ویٹ او بی ای کی جانب سے ہدایات موصول ہوئی ہیں، جنھیں پشاور میں آنریبل چیف کمشنر سر جارج روز کیپل نے براہِ راست انخلا کا حکم دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک گھنٹہ پہلے بنوں میں میرے کمانڈنگ افسر ساتویں بریگیڈ کے جنرل او جی لوکس کی جانب سے بھی تار ملا ہے،

انھوں نے بھی فوری انخلا کا حکم دیا گیا ہے، اس سے سرتابی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'

نیاز بین کے دماغ میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔ میجر رسل نے خاصی مزاحیہ طبیعت پائی تھی اور وہ کوئی چٹکلہ چھوڑنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ کہیں یہ سب کچھ کسی منظم عملی مذاق کا حصہ تو نہیں؟ لیکن نہیں، مذاق کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے ہاتھ اٹھایا۔ میجر رسل نے کہا، 'حوالدار نیاز بین، تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟'

نیاز بین ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ 'میجر صیب، میں صوبیدار صیب کی بات سے متفق ہوں کہ قبائلی ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ لیکن مجھے ایک اور بات کا ڈر ہے، اور وہ یہ کہ ہمارے جوانوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ پہلے ہی اس سال ہمارے سترہ جوان اپنے اسلحے سمیت بھگوڑا ہو چکے ہیں۔ ماضی میں بھگوڑوں کے اسلحے کی قیمت ان کے قبیلے سے وصول کی جاتی رہی ہے، لیکن جب ہم سب کچھ اس طرح چھوڑ چھاڑ کر جا رہے ہیں تو اکثر لوگ یہ سمجھ بیٹھیں گے کہ انگریز اس علاقے سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہے۔ اس لیے جوانوں پر قابو رکھنا آسان نہیں ہوگا۔ مجھے ڈر ہے کہ بہت سے سپاہی ہمارے انخلا کی خبر سن کر نہ صرف بھاگ جائیں گے، بلکہ وہ دوسروں کے بہکاوے میں آ کر ہمارے خلاف ہتھیار بھی اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے میں بھی صوبیدار میجر صیب کی طرح یہی کہوں گا کہ ہمیں ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ بھاگنے سے ہم سب مارے جائیں گے۔'

میجر رسل نے کہا، 'نیاز بین خان، مجھے آپ پر اور اپنے بہادر جوانوں پر پورا پورا بھروسہ ہے، مجھے یقین ہے کہ ہم افغانوں کا بھرپور مقابلہ کر سکتے ہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے یہ وقت بہت نازک ہے۔ افغانوں نے یہ موقع جان بوجھ کر چنا ہے۔ انھیں علم ہے کہ لام ابھی ابھی ختم ہوئی ہے، برطانوی فوج انسانی تاریخ کی سب سے بڑی اور سب سے خونریز جنگ جیتی ضرور ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر لڑی جانے والی جنگ میں فاتح بعض اوقات مفتوح سے زیادہ زخم خوردہ ہوتا ہے۔ برٹش انڈین آرمی کے بیشتر یونٹ ابھی ہندوستان واپس پہنچے ہی نہیں۔

Scanned with CamScanner

اگر کوئی ڈویژن واپس آیا ہے تو اس کا سامان ابھی راستے میں ہے، بہت سے سپاہی زخمی ہیں، یا سالہا سال محاذ پر رہنے کے بعد چھٹیوں پر چلے گئے ہیں۔ مغربی سرحد پر جو بچی کھچی فوج تھی وہ سب کی سب خیبر ایجنسی میں افغان فوج سے لڑنے میں مصروف ہے۔ اوپر ٹل میں ایک اور محاذ کھلا ہوا ہے، اس لیے ہماری مدد کو کہیں سے ایک سپاہی اور کمک کے لیے ایک گولی بھی نہیں آئے گی۔'

یہ تنگ پگڈنڈی اوپر گھنے جنگل تک جاتی تھی جہاں سے گاؤں کے لوگ لکڑیاں کاٹ کر لاتے تھے۔ وہ جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے چوٹی کی طرف بڑھنے لگے۔ اب اندھیرا خاصا گہرا ہو گیا تھا لیکن نہ جانے زرجانان کو کیسے راستہ نظر آ رہا تھا کہ وہ تیزی سے چوٹی کی طرف چڑھے چلے جا رہا تھا۔ گل مینہ پہاڑی راستوں کی عادی تھی لیکن یہاں اس قدر چڑھائی تھی کہ تھوڑی دیر بعد اس کی سانسیں پھول گئیں اب رائفل بہت بھاری لگنے لگی، جس کا پٹہ کندھا چھیلے دے رہا تھا اور اسے بار بار رک کر رائفل ایک کندھے سے دوسرے پر منتقل کرنا پڑتی تھی۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ برف اب زیادہ تیزی سے گرنا شروع ہو گئی تھی اور بار بار گل مینہ کے کندھوں پر جمع ہو جاتی تھی جسے وقفے وقفے سے جھٹکنا پڑتا تھا۔

شیرل چوٹی شاہ بلوط کے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ عین چوٹی پر گھاس کا میدان تھا، جس کے بیچ میں شاہ بلوط کا ایک صدیوں پرانا درخت تھا جس کی ٹیڑھی میڑھی شاخیں بے ڈھنگے پن سے ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں جیسے لنگڑے دیو نے نیچے وادی میں چھلانگ لگانے سے قبل غصے میں آ کر اسے جھنجھوڑ دیا ہو۔ اس پیڑ کے عین نیچے پست دیواروں والی ایک کوٹھڑی تھی جس کے اندر نور پیر بابا کی کئی گز لمبی قبر تھی۔ گل مینہ جب چھوٹی سی تھی تو ایک بار اپنی ماں اور گاؤں کی چند دوسری عورتوں کے ساتھ قبر پر منت مانگنے اور شاہ بلوط کی شاخوں پر رنگ برنگے کپڑے کی جھنڈیاں باندھنے آئی تھی۔ مزار کا احاطہ ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا اور مشہور تھا کہ رات کو شیر آ کر اپنی دموں سے یہاں جھاڑو دیتے ہیں۔

زرجانان خاموشی سے اس کے آگے آگے چلا جا رہا تھا، کبھی کبھی وہ رک کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کسی کھڈ یا پتھر پر چڑھنے میں مدد دیتا تھا۔ اس نے تین چار بار گٹھڑی اٹھانے کی پیش کش کی

Scanned with CamScanner

لیکن گل مینہ نے ہر بار اسے سختی سے اسے اپنے ہاتھوں میں دابے رکھا۔

زرمینہ کو معلوم تھا کہ کچھ آگے چل کر راستہ دو شاخوں میں تقسیم ہو جائے گا، ایک راستہ اوپر مزار کی طرف چلا جائے گا، دوسرا مغرب کی طرف کالی چٹان کے پیچھے سے ہوتا ہوا گزرے گا اور پہاڑ کے پیچھے سے بل کھاتا ہوا کرم کی طرف نکل جائے گا۔ زرجانان نے مغربی راستے کا انتخاب کیا۔ گل مینہ کے دل میں خیال آیا کہ وہ زرجانان سے کہے کہ دونوں مزار پر تھوڑی دیر رک کر اپنے اچھے مستقبل کے لیے دعا مانگیں لیکن پھر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

ابھی وہ کالی چٹان سے تھوڑی دور تھے کہ دور نیچے سے کئی مردوں کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گل مینہ نے سسکاری لے کر زرجانان کا ہاتھ تھام لیا۔ زرجانان نے رک کر کان نیچے وادی کی طرف لگا لیے۔ پھر درختوں کی شاخیں میں غصیلی سرسراہٹ ہوئی جیسے یک لخت ہوا کا تیز جھکڑ چلا ہو۔ فائر کی آواز کچھ لمحوں کے بعد آئی جس نے کب کے سوئے ہوئے پہاڑوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیا اور وہ کئی لمحوں تک اس آواز کو مختلف آہنگوں میں دہراتے رہے۔

زرجانان کے منہ سے ایک موٹی سی گالی نکلی۔ اس نے لپک کر گل مینہ کے ہاتھ سے گٹھری چھین کر اپنے کندھے پر ڈال لی۔ 'تیز چلو تیز، انھیں پتہ چل گیا ہے، پتہ نہیں کیسے، مگر اب ہمیں تیز چلنا ہوگا۔' چڑھائی عمودی تھی، اور پگڈنڈی کو لوگوں کے قدموں اور بار بردار گدھوں کے سموں نے چل چل کر ایک ایک فٹ زمین میں دھنسا دیا تھا اور اب وہ برف سے آدھی بھری ہوئی تھی۔

آدھا بھاگتے آدھا چلتے ہوئے بہت جلد گل مینہ کی سانسیں قابو سے باہر ہونے لگیں۔ جوں جوں وہ چڑھائی چڑھتے جا رہے تھے، زمین پر پڑی برف کی موٹائی اور اوپر سے برسنے والی برف کی تندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب وہ اتنی بلندی پر آ گئے تھے کہ چیڑ کے درخت رفتہ رفتہ ختم ہوتے گئے اور دیار کا جنگل شروع ہو گیا۔ برف کے گالے اس کے چہرے سے ٹکرا رہے تھے لیکن اسے ٹھنڈ کا قطعاً کوئی احساس نہیں تھا۔ احساس تھا تو صرف یہ کہ بس ابھی کوئی لال دہکتی ہوئی گولی

سرد ہوا میں تیرتی ہوئی آئے گی اور اس کی کمر میں پیوست ہو جائے گی۔ ادھر نیچے ان کے پیچھے آنے والی آوازیں بلند تر ہونے لگیں، اور کبھی کبھی کوئی گولی بھی درختوں کو چیر کر نکل جاتی تھی۔ کالی چٹانوں سے گزر کر جب وہ برلام نرئی میں داخل ہوئے تو تیز ہوا کے جھکڑ نے دریائے شوال میں اچانک آنے والے برساتی پانی کے ریلے کی طرح گل مینہ کے قدم اکھاڑ دیے اور اسے گرنے سے بچنے کے لیے گٹھڑی پھینک کر ایک درخت کے تنے کا سہارا لینا پڑا۔ برف کے گالے اب اوپر سے نہیں بلکہ سامنے سے لہراتے ہوئے آ رہے تھے اور آنکھوں میں مرچوں کی طرح پڑتے تھے۔ اب ان میں پہلے کی طرح سکون اور نرمی نہیں بلکہ شدت اور تیزی تھی۔ گل مینہ نے نیچے بیٹھے بیٹھے کہا، 'مجھ سے اب نہیں چلا جا رہا زرجانان، میرے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔'

'ہم رک نہیں سکتے گل مینہ، بس تھوڑی سی ہمت کرو۔ وہ ہمیں کبھی نہیں پکڑ پائیں گے۔ میں تمھیں اٹھا لیتا ہوں۔'

اتنے میں ان کے بہت قریب سے چیڑ کے ایک درخت کے پیچھے سے سرسراہٹ ہوئی، اور پھر کسی چیخنے کی آواز آئی، 'کاکا، یہاں ہیں وہ، میں نے انھیں گھیر لیا ہے، جلدی اوپر آؤ۔'

زرجانان نے ایک وحشیانہ آواز نکالی اور گل مینہ کو کندھوں سے پکڑ کر ایک پتھر کے پیچھے کر دیا اور کلاشن کوف کندھے سے اتار کر آواز کی سمت ایک برسٹ داغ دیا۔

ادھر سے دو تین گولیاں آئیں اور زرجانان بھی گل مینہ کے ساتھ پتھر کی اوٹ میں آ گیا۔ اس کا بدن گرم تھا اور وہ جذبات کی شدت سے ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا، 'حکم نور، میری تمھارے ساتھ کوئی لڑائی نہیں ہے، لیکن اگر تم ایک قدم آگے بڑھے تو نقصان ہو جائے گا، تم میرا نشانہ اچھی طرح سے جانتے ہو۔'

'گل مینہ کو یہیں چھوڑ کر چلے جاؤ، باقی فیصلہ جرگہ کرے گا،' گل مینہ کے چچا کے بڑے بیٹے نے کہا۔

'گل مینہ میری منگ ہے، اس کا رشتہ دادا نے خود مجھے دیا تھا۔ تمھارا یا کسی اور کا کوئی حق

Scanned with CamScanner

نہیں ہے کہ اس فیصلے کو منسوخ کر سکے۔ وہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہے، بالغ اور سمجھ دار ہے اور اپنا فیصلہ خود کر سکتی ہے۔ وہ کسی صورت واپس نہیں جائے گی، تم نیچے چلے جاؤ، ورنہ خون خرابہ ہو جائے گا۔'

'یہ کیا بکواس ہے؟' حکم نور نے کہا۔ 'دادا نے کب رشتہ دیا تھا، کس کے سامنے دیا تھا؟ کوئی لکھت، پڑھت، کوئی گواہ ہے تمھارے پاس؟'

'میرا گواہ میرا اللہ ہے اور یہ گل مینہ ہے۔ تم اسی سے پوچھ لو۔'

'اس سے ہم بعد میں پوچھیں گے، تم زرجانان، اپنے آپ کو سیدھے سیدھے ہمارے حوالے کر دو، تمھارے ساتھ رواج کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر ہم پکڑ کر تمھارا وہ حشر کریں گے کہ سات نسلیں یاد رکھیں گی۔'

'دادا نے مجھے رشتہ لے کر آنے کو کہا تھا لیکن میرے آنے سے پہلے ہی چل بسے۔ میں نے شرافت سے اس کا ہاتھ مانگنے کی کوشش کی تھی لیکن تم نے میرے باپ کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا، اس کے بعد میرے لیے کیا راستہ بچا تھا؟ یہ میری منگ ہے۔'

'یہ کیا منگ وونگ کی بک بک لگا رکھی ہے تم نے؟ تم ہماری عزت لے کر آ گئے ہو، خون تو بہے گا، یہ برف سرخ ہو کر رہے گی،' حکم نور نے چیخ کر کہا۔

گل مینہ کا بدن کچھ سردی سے اور کچھ خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کا تو خیال تھا کہ وہ اور زرجانان کھسن میں سے بال کی طرح نکل کر چلے جائیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ اس نے اپنی طرف سے راتوں کو جاگ جاگ کر ہر ہر پہلو پر غور و فکر کیا تھا، نئی جگہ پر کیسے حالات پیش آ سکتے ہیں، زرجانان کا رویہ کیا ہو گا، گل مینہ کے اپنے خاندان والے کیا ردِعمل دکھائیں گے۔ لیکن اس کے کسی منظر نامے میں یہ نہیں آیا تھا کہ وہ اور زرجانان اس شیرل چوٹی کے دامن میں برستی برف میں اس طرح گھر کر رہ جائیں گے، کہ نہ آگے جانے کے قابل نہ پیچھے ہٹنے جوگے۔ اسے کچھ کرنا چاہیے، لیکن وہ کر بھی کیا سکتی ہے، کیا وہ پتھر کی اوٹ سے نکل کر ان کی طرف

چلی جائے تو وہ اس کی اور زرجانان جان بخشی کر دیں گے؟

نہیں، کسی صورت میں نہیں! وہ مجھے مار کر یہیں کہیں گاڑ کر واپس چلے جائیں گے۔ زرجانان مقابلہ کرتا رہے گا، لیکن کب تک، گولیاں ختم ہو جائیں گی تو وہ اسے بھی مار ڈالیں گے۔

ان سے کچھ ہی دور کالی چٹان تھی جس سے نیچے ہزاروں فٹ گہری کھائی تھی۔ کئی سال پہلے گل مینہ نے ایک بار وہاں سے دیکھا تو اس کا سر یوں چکرانے لگا تھا جیسے کسی نے اسے تیز تیز چکر دے کر زمین پر کھڑا کر دیا ہو۔ مشہور تھا کہ پرانے زمانے میں مجرموں اور گناہ گاروں کو یہاں سے نیچے دھکیل کر سزا دی جاتی تھی۔ تو کیا وہ نادانستگی میں اپنے انجام تک آ پہنچے ہیں اور انھیں اب اپنے کیے کی سزا ملنے والی ہے؟

زرجانان نے پتھر کے دائیں طرف جا کر حکم نور کی آواز کی سمت گولیوں کا برسٹ مارا۔ نیچے سے ایک حیوانی چیخ کی آواز آئی، جو تا دیر آس پاس کی چٹانوں سے ٹکرا کر گونجتی رہی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر حکم نور دوبارہ چیخا، 'کاکا! کہاں مر گئے ہو تم؟ مجھے گولی لگ گئی ہے!!!'

زرجانان ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا گل مینہ کا ہاتھ پکڑ کر جھکے جھکے آگے بڑھنے لگا۔ اس نے مغرب کی سمت جانے کی بجائے مزید چڑھائی چڑھنا شروع کر دی تھی۔ گل مینہ نے سر جھکائے رکھا تا کہ آنکھوں میں برف کی مرچیں نہ پڑیں۔ ویسے بھی اسے نہ راستے کا پتہ چل رہا تھا نہ سمتوں کا احساس رہا تھا اور نہ وقت کا۔ اس کے بدن کے ساتھ ساتھ دماغ بھی سن ہو گیا تھا اور وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد زرجانان سے چمٹی اس کے سہارے چلی جا رہی تھی جیسے وہ صرف اس کی آنکھیں ہی نہیں، اس کے بازو یا پاؤں ہی نہیں، بلکہ تمام تن بدن ہو۔ راستے میں کئی بار وہ توازن کھو کر لڑکھڑائی لیکن ہر بار زرجانان نے اسے تھام لیا۔

اس کے ساتھ ہی برف باری کی شدت میں اضافہ ہو گیا، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی گالے بیلچوں سے اٹھا اٹھا کر ان پر پھینک رہا ہے۔ طوفانی ہوا بدمست بھینسوں کے ریوڑ کی طرح چیختی چنگھاڑتی اردگرد کے درختوں اور پتھروں سے سر مار رہی تھی۔ چھوٹے درخت یوں جھول رہے

Scanned with CamScanner

تھے جیسے طوفان سے بچنے کے لیے زمین سے پیر چھڑا کر نیچے وادی کی طرف بھاگ جانا چاہتے ہوں۔ بڑے پیڑ صدیوں پرانی بردباری کا دامن مضبوطی سے تھامے جھکڑ گزر جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہوا اوپر سے گرنے والی برف کے علاوہ زمین پر پڑی برف کو بھی ادھر ادھر بکھیر رہی تھی۔

اب طوفان اس قدر شدید ہو گیا کہ چند گز سے زیادہ دور دیکھنا ناممکن ہو گیا۔ گل مینہ برف باری کی خوب عادی تھی لیکن اس سے قبل اسے کبھی اتنی سردی نہیں لگی تھی۔ اس کی انگلیاں اور کانوں کی لویں سردی سے اس قدر سن ہو گئیں کہ جیسے جلنے لگیں۔

نہ جانے کتنے لمحوں، منٹوں، گھنٹوں کے بعد زرجانان نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور زمین پر زور زور سے پاؤں مار کر بدن پر جمی برف ہٹانے لگا۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا۔ گل مینہ کو محسوس ہوا کہ اب برف نہیں گر رہی اور نہ ہی ہوا زوروں کی چل رہی ہے۔ شاید وہ کسی چھت کے نیچے تھے۔ زرجانان نے کلک کی آواز کے ساتھ ٹارچ روشن کر دی۔ گل مینہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ نہ جانے وہ کیسے پہاڑوں میں گھومتے گھامتے پیر نور بابا کے مزار کے اندر پہنچ گئے تھے۔ یا شاید زرجانان جان بوجھ کر ادھر آیا ہے؟ نیچی چھت والی کوٹھڑی کا فرش سیمنٹ کا تھا۔ حسب معمول صاف ستھرا۔ ایک کونے میں پیر کی لمبی قبر تھی جس کے اوپر ریشمی کپڑے کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ کوٹھڑی کی مغربی دیوار ڈھے چکی تھی، اور باقی دیواریں بھی ایسا لگتا تھا کہ بس ایک ٹھوکر کی منتظر ہوں۔ گل مینہ کے کپڑے، جوتے، جرابیں، سویٹر اور شال مکمل طور پر بھیگے ہوئے تھے۔ ٹوٹی ہوئی دیوار میں سے ہوا کے جھونکے آ کر اس کے بدن کو لرزا رہے تھے۔ اس کے دانت کٹ کٹ بجنے لگے۔ زرجانان نے اپنا بیگ اور کلاشن کوف اتار کر الگ رکھے اور گل مینہ کو بیگ کے اوپر بیٹھنے کو کہا۔ اسی دوران باہر کوئی کھٹکا ہوا۔ زرجانان نے لپک کر ٹارچ بجھا دی اور کلاشن کوف اٹھا کر باہر نکل گیا۔

گل مینہ یونہی کوٹھڑی بنی بیگ اوپر آنکھیں موندے بیٹھی رہی۔ خاصی دیر کے بعد زرجانان واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں روشن ٹارچ تھی۔ گل مینہ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف

دیکھا۔ 'کچھ نہیں، شاید کوئی گیدڑ دیدڑ تھا۔ وہ دوسرے گیدڑ بہت پیچھے رہ گئے ہیں، ادھر آنے کی ہمت نہیں ہے ان میں۔ تم فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'

زرجانان کا پاؤں گل مینہ کی گٹھڑی میں الجھ گیا۔ اس نے گٹھڑی اٹھا کر کہا، 'اس میں کپڑے ہیں تمھارے؟' گل مینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا، جو معلوم نہ کہ زرجانان کو نظر آیا یا نہیں لیکن اس نے کہا، 'اٹھو، خشک کپڑے پہن لو، نہیں تو ٹھنڈ لگ جائے گی۔'

گٹھڑی میں کل تین جوڑے تھے، ایک چادر اور بس۔ گل مینہ نے گٹھڑی کھول کر درمیان سے سفید جوڑا نکالا جو بھیگنے سے بچ گیا تھا۔

اس نے زرجانان کی طرف منھ موڑ کر دیکھا۔ وہ بولا، 'اچھا بھئی میں ٹارچ بند کر دیتا ہوں، اس اندھیرے میں بھلا مجھے کیا نظر آئے گا!' یہ کہہ کر اس نے کمرے میں اندھیرا کر دیا۔

گل مینہ ویسے کی ویسی کٹھڑی رہی۔

'ارے بابا، میں خود کپڑے تبدیل کر رہا ہوں، اگر میں نے تمھاری طرف دیکھا تو تم میری طرف دیکھ کر حساب برابر کر دینا، ٹھیک؟ میری بات پر اعتبار نہیں ہے؟' گل مینہ کچھ نہیں بولی۔ 'اچھا اچھا بھئی، اس سردی میں مجھے باہر بھیج رہی ہو، ٹھیک ہے بھئی، ہمارا کیا ہے، چلے جاتے ہیں۔' زرجانان اپنی کلاشن کوف اٹھا کر ٹوٹی ہوئی دیوار پر سے کود کر باہر چلا گیا۔

گل مینہ کو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اندازہ ہو گیا کہ باہر طوفان تھم گیا ہے بلکہ شاید برف گرنا بھی رک گئی ہے۔ اس نے قمیص اتارنا شروع کی، اور پھر ایک خیال کے اس کے ہاتھ منجمد کر دیے۔ نور بابا! وہ چند قدم دور اپنی قبر میں لیٹے ہوئے ہیں اور ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ کیا عجب وہ اس گھپ اندھیرے میں بھی دیکھنے کے قادر ہوں؟ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر زرجانان کے واپس آ جانے کے خدشے کے پیش نظر منھ دوسری طرف کر کے زمین پر بیٹھ گئی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ اس نے قمیص اتار کر نیچے رکھی اور اپنے ہی ہاتھ کا سلا ہوا سفید سوتی کپڑے کا کسا ہوا سینہ بند اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔ فیتوں کی گرہ بھیگ

Scanned with CamScanner

جانے کی وجہ سے سخت ہوگئی تھی اور اس کی انگلیاں سن تھیں اس لیے اسے کچھ دیر ان سے الجھنا پڑا۔

اس وقت گل مینہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس رات سے ایک زمانہ بعد ایک فوجی مخبر کا خم دار پھل اس کے اسی قسم کے اپنے ہاتھ سے سلے ہوئے سینہ بند کو ایسے کاٹ کر اس کے بدن سے الگ کر دے گا کہ جلد پر گہری خراش بھی ڈال دے گا۔

اسے باہر سے کھٹ پٹ محسوس ہوئی تو اس نے جھٹ ویسے ہی قمیص پہن لی۔

4

پاؤ جان موسیٰ نیکہ کے بازار اپنے دوست غلامے کی نسوار کی دکان پر بیٹھا ہوا گپیں ہانک رہا تھا۔ غلامے لکڑی کے بھاری موصل سے اوکھلی میں دھاد ھم نسوار کوٹ رہا تھا۔ دس فٹ چوڑی کیچڑ بھری گھوڑوں اور خچروں والی سڑک کے اس پار محبت خان کباب کی دکان تھی جس کا بڑا کڑاہ آدھا سڑک پر آیا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے محبت خان اپنے موٹے موٹے ہاتھوں سے قیمے کی ٹکیاں بنا بنا کر کھولتے ہوئے تیل میں مہارت سے دھکیل رہا تھا۔ اس کے پیچھے چارپائی پر چند تاجر بیٹھے تھے جو سرحد پار کر کے غزنی جا رہے تھے۔ ان کے خچر بازار کے سرے پر واقع الف نور موٹے کی سرائے میں بندھے ہوئے تھے۔ جب بھی پیاز کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے اٹی ہوئی ٹکیہ کڑاہ میں جاتی، ایک اشتہا انگیز چس س س کی آواز گلی کے آر پار تیر جاتی تھی۔ پاؤ جان نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح غلامے کی جیب ڈھیلی کر کے اس سے ایک آنہ نکلوا لے تاکہ اس سے کباب کی ایک ٹکیہ خریدی جا سکے، لیکن وہ بھی ایک ہی کائیاں تھا، اس نے پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیا۔

'پاؤ جان، یہ کون لوگ ہیں؟ لگتا ہے افغانستان کی طرف سے آئے ہیں،' غلامے نے کہا۔

'ارے بات بدلنے کی کوشش نہ کر، میں تجھ سے کیا کہہ رہا ہوں،' پاؤ جان نے جھنجلا کر کہا۔ لیکن پھر گھوڑوں کی ٹاپوں نے اسے مڑ کر باہر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ پانچ سات گھوڑوں کا قافلہ دکان کے سامنے سے گزر رہا تھا، جن پر لمبے کُلوں والے لوگ سوار تھے۔ یہ لوگ مسجد کی طرف بڑھ گئے۔ ان میں سے کسی نے اعلان کیا، 'کابل سے مولوی صاحب آئے ہیں، نماز کے بعد لوگوں سے خطاب کریں گے۔'

Scanned with CamScanner

پاؤجان نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن نتیجہ جوں کا توں۔ اس نے سوچا کہ غلامے کی جیب سے تو آنہ نکلوانا مشکل ہے، چلو مسجد چل کر دیکھتے ہیں، ممکن ہے کوئی دلچسپ بات سننے کو مل جائے۔ ویسے بھی مغرب کی اذان شروع ہو چکی تھی۔

پاؤجان نے وضو بنانے میں خاصی پھرتی دکھائی لیکن پھر بھی ایک رکعت چھوٹ گئی۔ مئی کا مہینہ شروع ہو چکا تھا لیکن پانی میں اب بھی کاٹ باقی تھی۔ مسجد کی طرف آتے ہوئے اس نے سر پر سے کونجوں کی ایک ڈار گزرتے دیکھی تھی جو قلقاریاں مارتی ہوئی خواجہ خضر کی چوٹی کے بائیں طرف سے ہوتی ہوئی سرحد کے پار افغانستان چلی گئی۔ دو چار دن پہلے ہی پاؤجان نے بازار میں پاوندوں کا پہلا قافلہ گزرتے ہوئے دیکھا تھا جو ہندوستان کے گرم میدان چھوڑ کر بلند کے یخ بستہ پہاڑوں کی طرف جا رہا تھا۔ پاؤجان کی عادت تھی کہ وہ بہت جلدی جلدی نماز پڑھ لیتا تھا، اس لیے جب تک ملا دعا ختم کرتا، اس وقت تک وہ چھوٹنے والی رکعت ادا کر چکا تھا۔ ملا نے دعا کے بعد کہا کہ سنت پڑھنے کے بعد کوئی گھروں کو نہ جائے کیوں کہ کابل سے مولانا حسن گل صاحب امیر افغانستان کا خصوصی پیغام لے کر آئے ہیں۔

پاؤجان دو سنتیں پڑھنے کے بعد آلتی پالتی مار کر انتظار میں بیٹھ گیا۔

جب سب لوگ سنتیں پڑھ چکے تو ملا ایک بار پھر اجتماعی دعا کروانے کے بعد الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ پہلی صف میں ملا کے عین پیچھے بیٹھا ہوا ایک عمر رسیدہ لمبی سفید داڑھی والا شخص اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اگلی صف میں کئی لوگ ایسے تھے جنھیں پاؤجان نے موسیٰ نیکہ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شاید یہ لوگ اسی قافلے میں آئے ہوں گے۔

سفید داڑھی والے نے سر پر بہت بڑی سیاہ پگڑی باندھ رکھی تھی جس میں سے اس کے سفید بال نکل کر گردن تک آ رہے تھے۔ اس نے کھنکار کر چند آیات پڑھیں، جس کے بعد پاٹ دار بھاری بھرکم آواز میں خطاب شروع کر دیا۔

'میرے جیالے نڈر قبائلی ساتھیو، میں آج آپ کے لیے سرحد پار سے بہت بڑی اور

بہت اچھی خبر لے کر آیا ہوں، ایک ایسی خبر جس سے آپ کی دنیاوی زندگی تو کیا، آخرت تک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل جائے گی۔

'جیسا کہ آپ کے علم میں ہوگا، افغانستان کے نئے حکمران امیر امان اللہ خان نے اپنے پیش روؤں کی جانب سے افغان عوام کے گلے میں ڈالا ہوا غلامی کا طوق کاٹ کر پھینک دیا ہے اور ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ آج سے دس دن قبل دو شعبان 1337 ہجری کو بہادر افغان غازیوں کے ایک لشکرِ جرار نے غزوۂ ہند کے پہلے مرحلے میں درۂ خیبر عبور کر کے لنڈی کوتل کے قریب برطانوی قصبے باغ پر قبضہ کر لیا ہے اور پشاور کی جانب اس کی پیش قدمی تیزی سے جاری ہے۔ دوسری طرف ایک اور افغان لشکر نے کرّم کی طرف سے بلہ بول کرنل کے قصبے کے گرد گھیرا ڈال دیا ہے، اس کے علاوہ جنوب میں بولان کی طرف سے بہادر افغانوں نے ایک اور حملہ کر کے برطانوی فوج کو سرحد سے پیچھے دھکیل دیا ہے۔

'یہی نہیں، خود آپ کے اس وزیرستان میں درۂ گومل سے شہزادہ نادر شاہ اپنی قیادت میں بہت بڑی فوج لے کر سرحد پار کر چکے ہیں اور ٹوچی دریا کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر روس کی حکومت نے افغانستان کا بھرپور ساتھ دینے کا عہد کیا ہے جب کہ ترکوں کی خلافتِ عثمانیہ نے تو پہلے ہی انگریز اور اس کے اتحادیوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے رکھا ہے۔'

مسجد کے فرش پر شاید تازہ تازہ چیڑ کے خشک سوئی دار پتے بچھائے گئے تھے جو پاؤجان کے کولھوں میں چبھ رہے تھے۔ اس نے کروٹ بدلی لیکن اس سے بھی فرق نہیں پڑا تو آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ مسجد میں موزنج سے بنی ہوئی ایک صف بھی تھی لیکن وہ امام کے پیچھے پہلی قطار میں بچھی ہوئی تھی اور اس پر پہلے ہی قافلے والوں اور گاؤں کے سفید داڑھیوں والے بڑے بوڑھے براجمان تھے۔

'ایک طرف تو یہ حالات چل رہے ہیں، دوسری طرف عربوں نے عدن کی بندرگاہ پر

Scanned with CamScanner

قبضہ کر کے انگریز کا سمندری راستہ کاٹ دیا ہے، اب ولایت سے ہندوستان کمک پہنچنے میں چھ ہفتوں کی بجائے چھ ماہ لگا کریں گے۔ ان کی فوجوں کا اسلحہ، گولہ بارود دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جائے گا، یہ توپیں، یہ مشین گنیں، یہ رائفلیں کمک کے بغیر ایک دو ہفتے کے بعد خاموش ہو جائیں گی۔

'دوسری طرف، آپ تک شاید خبر نہ پہنچی ہو لیکن ایک ماہ پہلے ہندوستان کے شہر امرتسر میں جنرل ڈائر نامی ایک وحشی انگریز جرنیل نے گولیاں برسا کر ہزاروں نہتے ہندوستانیوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس کھلی بربریت نے ہندوستان میں آگ لگا کر رکھ دی ہے۔ انگریزوں کی فوج میں شامل مسلمان ہندوستانی سپاہیوں کی پلٹنوں کی پلٹنیں بغاوت کر کے انگریز کا ساتھ چھوڑ رہی ہیں۔ ادھر انگریز کو ترکوں اور جرمنوں نے ولایت میں لام کے دوران ہزاروں کچوکے لگا لگا کر لہولہان کر دیا ہے، اب اس لڑکھڑاتے، ڈگمگاتے دیو کو زمین کی دھول چٹانے کے لیے بس ایک آخری وار کی ضرورت ہے۔'

پاؤ جان کے ساتھ موسیٰ نیکہ کے کئی اور نوجوان بھی بیٹھے ہوئے تھے، جن میں ابراہیم لمبو اور یار محمد تو اس کے خاص یار تھے۔ محبت خان کبابیا صرف جمعے کی نماز پڑھتا تھا لیکن وہ بھی پاؤ جان کو پیچھے بیٹھا نظر آ گیا۔ ان نوجوانوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر نعرے لگانے شروع کر دیے، 'امیر کابل زندہ باد، انگریز مردہ باد۔'

ملا حسن جان نے ہاتھ کے اشارے سے نعروں کو روکا اور اپنی بات جاری رکھی: 'اس سلسلے میں وزیرستان کے غیور قبائل کا بہت اہم کردار بنتا ہے۔ میں آپ سب کے لیے امیر امان اللہ خان کا پیغام لے کر آیا ہوں کہ میرے بھائیو اٹھ کھڑے ہو اور وزیرستان میں جگہ جگہ قائم انگریزوں کی چوکیوں پر قبضہ کر کے وہاں سے اسلحہ اور رسد حاصل کرو اور ان کی مدد سے ہندوستان پر ہلہ بول دو۔ یاد رکھو میرے دینی بھائیو، جنت اپنے اندر تمام آسائشیں سموئے ہوئے بس دو قدم کے فاصلے پر تمھاری منتظر ہے۔ تم نے صرف دو قدم چلنا ہیں۔ لڑائی میں غازی رہے تو جنت، شہید

ہوئے تو کیا کہنا، لیکن اگر صرف گھر سے لڑنے کے ارادے ہی سے نکلے تب بھی جنت کہیں نہیں گئی۔'

میرے بھائیو، تم خوش نصیب ہو کہ تمھیں اتنی آسانی اور سہولت سے یہ موقع مل رہا ہے کہ تم صرف ایک قدم بڑھا کر بہتے ندیوں کے باغوں والی جنت، ہیرے اور موتیوں کے محلات والی جنت، غلافی آنکھوں والی حوروں والی جنت میں قدم رکھ سکتے ہو۔'

پاؤ جان نے اکثر اپنی مسجد کے مولوی کو جنت کے بارے میں بات کرتے ہوئے سنا تھا لیکن اس مولوی صاحب کی خطابت اور روانی ایسی تھی کہ اسے سرور آنے لگا۔

'میرے بھائیو، اس جنت کی خواہش میں ہم جیسے ملا ساری ساری زندگیاں مصلے پر گھسا دیتے ہیں لیکن پھر بھی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خدا کسی ایک غلطی سے ناراض ہو جائے اور سب محنت اکارت چلی جائے۔ دوسری طرف تم ہو کہ تمھیں اللہ اور اس کے رسول کے دربار کے ساتھ دنیا میں بھی بیک وقت سرخ رو ہونے کا یہ سنہری موقع نصیب ہو رہا ہے۔ یاد رکھو، اس میں کسی قسم کی دیر اور کوتاہی سے تمام امت کو ناقابلِ تلافی نقصان ہو جائے گا۔'

پاؤ جان نے اس سے چند مہینے قبل ہی ایک گورکھا سپاہی سے تھری ناٹ تھری ہتھیائی تھی۔ اسے یہ بھی ایک معجزہ نظر آنے لگا کہ اس اہم موقعے پر اسے خاص طور پر وہ رائفل سونپی گئی ہے کیوں کہ اس نے اس سے بڑے کام لینے ہیں۔

'میں جب یہاں موسیٰ نیکہ آ رہا تھا تو مجھے بتایا گیا کہ آج سے ہزار سال پہلے سلطان محمود غزنوی اسی راستے سے گزر کر ہندوستان گیا تھا اور وہاں کے سب سے بڑے مندر سومنات کے سب سے بڑے بت کو پاش پاش کر کے آیا تھا۔ آج تمھارے پاس موقع ہے کہ اپنے اسلاف کی راہ پر چلتے ہوئے ایک اور طاغوتی بت کو پاش پاش کر دو۔ یاد رکھو، قدرت کا بخشا یہ وقت نکل گیا تو پھر ساری زندگی ہاتھ ملتے رہتے جاؤ گے۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔'

یہ کہہ کر مولانا حسن گل بیٹھ گئے۔ مسجد میں ہر شخص نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔

Scanned with CamScanner

ہر کسی کی خواہش تھی کہ وہ ابھی اور اسی وقت اٹھ کر جنگ میں حصہ لینے پہنچ جائے۔ پاؤ جان، ابراہیم اور یار محمد نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ وہ ہر محاذ پر شانہ بشانہ لڑیں گے۔

اگلا دن جمعے کا تھا۔ ملا حسن جان تو منہ اندھیرے ہی واپس چلے گئے تھے، لیکن صبح ہی سے موسیٰ نیکہ میں گرد و نواح سے جنگجو آ آ کر اکٹھے ہونے لگے۔ دوپہر تک ان کی تعداد ڈھائی سو کے قریب پہنچ گئی۔ ان میں سے ایک ٹولے نے ملک جم خان کے حجرے کے باہر کھلے میدان میں اتن رقص شروع کر دیا۔ انھوں نے کمروں پر رنگے دوپٹے باندھے ہوئے تھے، اور دونوں ہاتھوں میں بھی ایک ایک رومال تھا، جنھیں وہ لہرا لہرا کر دائرے میں گھومتے جاتے تھے۔ جس کو رومال یا دوپٹہ میسر نہیں آیا، وہ ویسے ہی میدان میں کود پڑا۔ اسی دوران گاؤں میں واحد ڈوموں کے گھر سے علی جان اور اس کا بیٹا کرم جان ڈھولک اٹھا کر آ گئے اور شاخنیوں سے اتن کی مخصوص دھن پر ڈھول پیٹنا شروع دیے۔ اسی دوران کچھ لوگ جذبات سے بے قابو ہو کر وقفے وقفے سے ہوائی فائرنگ بھی کرتے تھے جس سے آس پاس کی پہاڑیاں گونج اٹھتی تھیں۔ پاؤ جان اتن کا بڑا شوق رکھتا تھا لیکن اس وقت اس کے پاس نہ تو رومال تھے اور نہ دوپٹہ۔ وہ اپنی تھری ناٹ تھری رائفل اٹھا کر ناچنے والی ٹولی میں شامل ہو گیا اور اسی کو ڈھول کی تھاپ پر رومال کی طرح ہلا ہلا کر اپنا حصہ ڈالنے لگا۔

پاؤ جان کے بھائیوں نے اس کے وانہ چھاؤنی پر بلہ بولنے کے لیے تشکیل پانے والے لشکر کے ساتھ جانے کے فیصلے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور اپنے اپنے کاموں میں جٹے رہے۔ بڑے نے نیا نیا خچر خریدا تھا، اور ہمہ وقت اس کی ناز برداری میں لگا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس کی مالش کرتا رہا۔ منجھلا سر جھکائے موچی کے تھیلے بنتا رہا۔ یہ تھیلے وہ بازار میں ایک دکان پر

رکھوا دیتا تھا جس سے اسے تھوڑی بہت آمدن ہو جاتی تھی۔ البتہ اس کی ماں دوپٹے میں منہ چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ پاؤ جان کو روکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

پاؤ جان آخری دستے کے ساتھ تھا۔ وہ قدم گھسیٹتا اور بار بار مڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ آخر جب اسے ایسا لگا کہ وہ مایوس ہو کر موت کے منہ میں جا رہا ہے، اسے مسجد کے پیچھے ایک چھت پر زرینہ کا سبز آنچل لہراتا ہوا نظر آ گیا۔ پاؤ جان نے سرخوشی کے عالم میں یکے بعد دیگرے تین ہوائی فائر کیے اور ایک نعرۂ مستانہ لگا کر لشکر کے پیچھے پیچھے نیزہ مزئی درے کے راستے پر چڑھنے لگا۔

Scanned with CamScanner

5

صبح جب گل مینہ کی آنکھ کھلی تو اسے اس بات کا تعین کرنے میں چند لمحے لگ گئے کہ وہ کہاں ہے۔ جب رات کے واقعات یاد آئے تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا بدن زرجانان کی شاڑی میں لپٹا ہوا تھا اور وہ نور بابا کی قبر کی پائنتی لیٹی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کے باہر آنکھوں میں چبھتے ہوئے نیلے آسمان تلے دور تک چمک دار دھوپ میں نہائی ہوئی وادی پھیلی ہوئی تھی۔ زرجانان ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے نیچے دور کہیں دیکھنے میں محو تھا۔ گل مینہ کی آہٹ سن کر اس نے گردن گھمائی۔ 'ارے، تم اٹھ گئیں؟ تھوڑی دیر اور سو جاؤ، رات دیر سے سوئی تھیں۔'

لیکن اتنی دیر تک گل مینہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر کر اپنی چادر اچھی طرح لپیٹ کر اوڑھی، اور پھر کچھ کہے بغیر گھاس کا میدان عبور کر کے پچھلی طرف درختوں میں چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو زرجانان فرش پر جھکا ہوا پھونکیں مار مار کر آگ جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گل مینہ آگ کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور ہاتھ تاپنے لگی۔ زرجانان نے اپنی خورجین میں سے ایک خشک روٹی برآمد کی اور آگ پر تھوڑا سا گرم کرنے کے بعد گل مینہ کو پیش کر دی۔ اس کے پاس گڑ، کشمش اور مونگ پھلیاں بھی تھیں۔ گل مینہ کو زیادہ بھوک نہیں تھی، اس نے چند نوالے لینے کے بعد روٹی زرجانان کو واپس کر دی۔ اس کا چائے پینے کو بہت دل کر رہا تھا لیکن یہاں چائے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

'زرجانان، اب کیا ہوگا؟ ہم کہاں جائیں گے؟ ہم سے بڑی غلطی ہوئی ہے، ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ لوگ ہمیں کبھی جیتا نہیں چھوڑیں گے۔'

'ارے ان کی فکر مت کرو، گل مینہ۔ وہ ہمیں زندگی بھر چھو بھی نہیں سکیں گے۔'

'لیکن کیسے؟ ہم جائیں گے کہاں؟ جہاں بھی جائیں، وہ ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے۔'

'بتایا نا، وہ ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ یہ سامنے پہاڑ نظر آ رہا ہے؟'

گل مینہ نے گردن گھما کر دیکھا۔ دور درختوں سے ڈھکا ہوا پہاڑی سلسلہ نظر آ رہا تھا جو برف سے سفید ہو رہا تھا۔

'اس کے پیچھے کرم ایجنسی ہے۔ ہم وہیں جا رہے ہیں۔'

'وہاں ہم کیا کریں گے؟'

'بھئی، وہاں میرے دوست رہتے ہیں، وہ مدد کریں گے۔ مجھے وہاں کوئی نہ کوئی کام مل جائے گا۔ وہاں ہم آرام سے رہیں گے، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔'

گل مینہ یہ سن کر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ کرم ایجنسی کی سرحد وہاں سے دس بارہ میل سے زیادہ دور نہیں ہوگی۔

'لیکن راستے میں کوئی ہمارے انتظار میں گھات لگائے بیٹھا ہوا تو؟' گل مینہ نے پوچھا۔

زرجانان ہنس پڑا۔ 'ارے بھئی، ہم راستے سے تھوڑی جائیں گے۔ ہم تو وہ سامنے جو درہ ہے وہاں سے ہو کر جائیں گے۔ کسی کے فرشتوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ چلو اب اٹھو، دیر ہو رہی ہے، ہمیں سہ پہر سے پہلے درہ عبور کر لینا چاہیے۔'

گل مینہ نے اپنی گٹھڑی کس کر باندھی، رائفل اٹھا کر کندھے پر ڈالی اور چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ دروازے سے باہر نکلتے نکلتے وہ رکی، اور بابا کی قبر کی طرف منہ کر کے دعا مانگنے لگی: 'بابا، تو اللہ کا نیک بندہ ہے، تو سب کچھ دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے، میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اب میں اور زرجانان جس مصیبت میں پھنسے ہیں، اس سے تو ہی ہمیں نکال سکتا ہے۔۔۔'

'جلدی کرو گل مینہ، ہمیں دیر ہو رہی ہے،' زرجانان نے باہر سے آواز دی اور گل مینہ جلدی سے دونوں ہاتھ منہ پر پھیر کر مزار سے باہر نکل آئی۔

راستہ آسان نہیں تھا۔ پہلے تو انھیں کئی میل نیچے کھائی میں اترنا پڑا، پھر ندی پھلانگ کر

Scanned with CamScanner

دوبارہ چڑھائی کا سفر شروع ہو گیا۔ زرجانان گھات کے خطرے کے پیشِ نظر راستوں اور پگڈنڈیوں سے ہٹ کر چل رہا تھا اس لیے سفر کئی گنا مشکل ہو گیا تھا۔ مسلسل چڑھائی اور برف کی موٹی تہہ نے اسے اور مشکل بنا دیا تھا۔ برف میں چلنے سے زرمینہ کی اونی جرابیں بار بار گیلی ہو جاتی تھیں اور اسے انھیں اتار کر نچوڑنا پڑتا تھا۔ ادھر بندوق کے بوجھ نے اس کے شانے شل کر رکھے تھے۔

ظہر کے وقت وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ زرجانان رک گیا تھا۔ گل مینہ بھی ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور سانسیں ہموار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ جنوب میں ہلکے بادلوں کی دھاریوں کے علاوہ اب سارا آسمان شفاف ہو گیا تھا اور اس کی گہری نیلاہٹ آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی تھی۔

'گل مینہ' زرجانان نے کہا۔

'جی؟'

'ایک بات پوچھوں؟'

'جی۔'

'تمھاری آنکھوں میں آسمان کا عکس نظر آ رہا ہے یا یہ ہیں ہی اتنی نیلی؟'

گل مینہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ زرجانان اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

'ارے بھئی، تم تو شرما گئیں۔ میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ خیر، میں کہنا دراصل یہ چاہتا تھا کہ مجھ پر پورا بھروسہ رکھنا، بس کسی ٹھکانے تک پہنچ جائیں تو میں زندگی بھر، کبھی بھی، کسی بھی صورت میں تمھیں کسی قسم کا دکھ نہیں پہنچنے دوں گا۔ سمجھ گئیں نا؟'

'بھروسہ کیا ہے جبھی تو اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے' گل مینہ نے منہ بدستور دوسری طرف رکھا۔ نیچے وادی میں ندی پنسل سے بنی سرمئی لکیر کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس نے نظریں سامنے والے پہاڑ کی طرف کیں جہاں سے وہ آئے تھے۔ اس نے کوشش کی کہ وہ راستہ تلاش کر لے

جہاں سے وہ گزر کر آئے تھے۔ پھر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ پتھر سے سرک کر نیچے ہو گئی۔ زرجانان اپنی چادر نیچے ڈالے بیٹھا دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ گل مینہ کی چیخ سن کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ 'کیا ہوا گل مینہ؟'

'نیچے ہو جاؤ، نیچے، جلدی' گل مینہ نے کہا۔ زرجانان برف پر ہی بیٹھ گیا۔ گل مینہ نے انگلی سے اشارہ کیا۔ 'کیا ہے، مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا' اس نے کہا۔

'وہ دیکھو، جہاں وہ بڑا خشک درخت ہے، اس کے پیچھے گھاٹی میں' گل مینہ زرجانان کے منہ کے قریب ہو کر بازو لمبا کر کے دکھایا۔

اب زرجانان نے بھی دیکھ لیا تھا۔ یہ پانچ آدمی تھے جو اتنے فاصلے سے چیونٹیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بظاہر رکے ہوئے معلوم ہوتے تھے لیکن خاصی دیر تک تکنے سے پتہ چلتا تھا کہ چل رہے ہیں۔ ان میں سے ایک آدمی نے پیلی قمیص یا جیکٹ پہن رکھی تھی جو ایک دھبے کی مانند نظر آ رہی تھی۔ اسی کی وجہ سے گل مینہ انھیں دیکھ پائی تھی ورنہ برف میں ان کا پتہ نہ چلتا۔

'لازمی نہیں کہ یہ وہی لوگ ہوں۔ چنکارہ کے شکاری بھی ہو سکتے ہیں، اس موسم میں چنکارہ مارنا آسان ہوتا ہے' زرجانان نے کہا۔

'نہیں نہیں، مجھے پتہ ہے، یہ ہمارے پیچھے آ رہے ہیں، انھوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا ہو گا' گل مینہ رونے لگی۔ زرجانان گل مینہ کے قریب ہو گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا 'پہلے تو یقینی نہیں کہ وہی ہیں، اگر یہ وہی ہوں تب بھی ہم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے انھیں کم از کم پانچ چھ گھنٹے لگیں گے۔ اتنی دیر میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ چلو اٹھو' اس نے سہارا دے کر گل مینہ کو اٹھایا اور دونوں جھکے جھکے درختوں کے اندر سے ہوتے ہوئے دوسری طرف چوٹی کی اوٹ میں اتر گئے۔

زرجانان یہی کہتا تھا کہ وہ پہلے اس طرف آیا تو ضرور ہے لیکن وہ موسم اور تھا، اب

Scanned with CamScanner

برف کی وجہ سے اسے ہر چیز بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ڈیڑھ میل چلنے کے بعد وہ کھلا راستہ آجائے گا جس پر سمگلروں کے خچر گزرتے ہیں، لیکن چلتے چلتے سورج پہاڑوں کے پیچھے غائب ہوگیا اور اس راستے کا سراغ ملنا تھا نہ ملا۔

جلد ہی رات آگئی۔ آسمان جمی ہوئی برف کی شفاف سل کی طرح ٹھنڈا تھا۔ تاروں کی روشنی اس قدر تھی کہ پورا آسمان جگمگا رہا تھا جس کی وجہ سے انھیں چلنے میں کوئی دشواری نہیں تھی لیکن ٹھنڈ تھی کہ سارا بدن اکڑائے جا رہی تھی۔

گل بینہ میکانکی انداز میں زرجانان کے پیچھے پیچھے اس کے قدم پر قدم رکھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کبھی کبھی رک کر سستوں کا تعین کرنے کی کوشش کرتا اور پھر چل پڑتا۔ گل بینہ بغیر کچھ کہے اس کے ساتھ رکتی اور پھر دوبارہ چل پڑتی۔ ان کی منزل عالم کوٹ گاؤں تھا جہاں زرجانان پہلے ایک بار آچکا تھا۔

'گاؤں میں کوئی عورت پوچھے تو یہی کہنا کہ ہم میاں بیوی ہیں اور پاڑا چنار رشتے داروں کے ہاں جا رہے ہیں، بس راستے میں خراب موسم کی وجہ سے بھٹک گئے۔ بس اتنا ہی کہنا، مردوں کو میں سنبھال لوں گا۔'

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس عالم کوٹ کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ زرجانان یہی کہتا تھا کہ بس اس گھاٹی کے دوسری طرف وادی میں ہے، وہاں رات کا ٹھکانہ مل جائے گا، لیکن جب وہ اس گھاٹی تک پہنچتے تو اس کے دوسری طرف اور گھاٹیاں، ٹیلے اور کھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔

آخر جب زرجانان نے کچھ کہنا چھوڑ دیا اور گل بینہ کے ذہن سے وقت اور فاصلے اور تھکن کے احساسات مٹ گئے تو کہیں بہت دور سے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی اور پہاڑوں سے گونج کر دم توڑ گئی۔ زرجانان نے اس کا ہاتھ زور سے تھام لیا 'یہی ہے، یہی عالم کوٹ ہے جس کا میں تم سے کہہ رہا تھا۔ چلو آؤ۔'

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ انھیں اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ دو اطراف

اونچے نیچے پہاڑ تھے۔ اب زرجانان نے جیب سے ٹارچ بھی نکال لی اور اس کی مدد سے راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

پھر اس نے گل بینہ کو ایک پتھر کی اوٹ میں بٹھا دیا۔ 'تم ادھر ہی رہو، میں ابھی راستے کا پتہ کر کے آتا ہوں۔' گل بینہ اکیلے وہاں بیٹھنے پر بالکل تیار نہیں تھی لیکن بے حد تھکن اور زرجانان کے اصرار کی وجہ سے آنکھیں بند کر کے وہیں دبک گئی۔ پتہ نہیں کتنی دیر گزری کہ زرجانان کی آواز آئی، 'گل بینہ، چلو اٹھو۔'

'راستہ مل گیا؟' گل بینہ کو نہ جانے کس وقت جھپکی آگئی تھی۔

'نہیں، لیکن رات گزارنے کا ٹھکانہ ضرور مل گیا ہے۔'

زرجانان کے پیچھے پیچھے پندرہ بیس منٹ چلنے کے بعد وہ ٹھکانہ آگیا۔ پہاڑ کے دامن میں کسی گہرے زخم کی مانند کھلا ہوا۔ 'یہ؟ یہ تو غار ہے؟' گل بینہ نے کہا۔

'ہاں، غار ہے اور بہت زبردست غار ہے۔ رات گزارنے کے لیے اس سے بہتر جگہ نہیں ملے گی یہاں۔' زرجانان نے ٹارچ کی روشنی ڈال کر اسے غار کا اندرون دکھایا۔ یہ اندر سے خاصا کشادہ تھا اور اس میں دس بارہ لوگ سما سکتے تھے۔ باہر کے مقابلے پر غار کے اندر ٹھنڈ خاصی کم تھی۔ عقبی دیوار کے قریب کالک سے اٹے ہوئے تین پتھر پڑے تھے جن کے اوپر ایک مٹی سے اٹی، زنگ آلود دیگچی رکھی ہوئی تھی۔ 'دیوار میں سے سانپ بچھو نکل آیا تو؟'

'اس سردی میں سانپ بچھو کا کیا کام بھئی؟ وہ صرف گرمیوں میں زمین سے باہر آتے ہیں۔'

زرجانان نے غار کے اندر پڑی خشک گھاس اکٹھا کر کے اسے ڈھیر کی شکل میں بچھا دیا۔ 'اچھا ہے کہ ٹھکانہ مل گیا، ورنہ میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ آج کی رات کیسے کٹے گی۔' پھر اس نے اپنی شاڑی اتار کر گھاس کے ڈھیر پر پھیلا دی۔ 'چلو اب سو جاؤ۔ صبح پھر چلنا پڑے گا۔ میں آگ جلانے کے لیے لکڑیاں دیکھتا ہوں۔'

Scanned with CamScanner

'نہیں نہیں، آگ کی ضرورت نہیں، یہاں ٹھنڈ زیادہ نہیں ہے۔ تم بھی آرام کرو، بہت تھک گئے ہو۔'

گل بینہ کی رات بے آرامی سے گزری۔ بار بار آنکھ کھل جاتی تھی۔ غار کے دہانے کے باہر تیز ہوا کا شور اسے کبھی بھیڑیوں کی پکار معلوم ہوتا، کبھی لگتا کہ بہت سے لوگ باہر جمع ہو رہے ہیں۔ زرجانان بھی اس کے قریب گٹھڑی بنا پڑا تھا۔ گل بینہ کو اندازہ نہیں ہو سکا کہ آیا وہ سو تا رہا یا اس کی نیند بھی شکستہ رہی۔

صبح گل بینہ کا بند بند یوں درد کر رہا تھا جیسے کسی نے اسے چھڑی سے خوب پیٹا ہو۔ زرجانان کے سامنے کراہیں روکنے کے لیے اسے اپنے آپ پر جبر کرنا پڑ رہا تھا۔ آج آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا البتہ بارش کا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹھنڈ مزید بڑھ گئی تھی۔ اب سارا سفر اترائی کا تھا جو جانگوں میں اکڑن کی وجہ سے بہت مشکل ہو گیا تھا۔ گل بینہ کو لگ رہا تھا جیسے اس کے گھٹنے ربڑ کے بنے ہوئے ہیں اور کسی بھی لمحے اس کے بدن کا بوجھ اٹھانے سے جواب دے دیں گے۔ آخر اس نے رائفل کندھے سے اتار دی اسے ٹیک ٹیک کر اترنے لگی۔ پہاڑ کی چوٹی پر درخت چھدرے اور ٹھنگنے تھے لیکن اب رفتہ رفتہ قد کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد اور اونچائی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وادی کا دامن اوپر سے قریب نظر آ رہا تھا لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے کئی گھنٹے لگ گئے۔ اب وہ گھنے جنگل سے گزر رہے تھے۔ درخت برف سے لدے پھندے کھڑے تھے۔ کبھی کبھی کسی درخت کی شاخ سے برف پھسل کر دھپ سے نیچے گرتی تو اس کے شور سے گل بینہ چونک جاتی اور مڑ کر دیکھتی کہ کہیں کوئی پیچھے تو نہیں آ رہا۔

گل بینہ کے دیکھتے دیکھتے ایک درخت کی ڈالی کڑکڑائی اور اس پر جمی برف کی کئی انچ موٹی تہہ شرشری آواز کے ساتھ پھسلتی ہوئی نیچے جا گری۔ اس کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا اور گل بینہ کو ایسے لگا جیسے زمین اس کے قدموں کے نیچے سے اچھل کر اوپر چلی گئی ہے اور آسمان ٹوٹ کر نیچے آ گرا ہے۔ اور پھر یوں اندھیرا چھا گیا جیسے کسی نے پھونک مار کر سورج بجھا دیا ہو۔

دانہ قلعے کے افسر میس کے باہر میجر رسل نے اپنی بات جاری رکھی: 'دوسری طرف ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ سات دنوں کا راشن موجود ہے، اس کے بعد کیا ہوگا؟ مجھے معلوم ہے کہ انخلا کے دوران راستے میں ہمیں مشکلات پیش آئیں گی، لیکن ہم کسی صورت اس قلعے میں نہیں رہ سکتے۔ بہادری صرف مرنے مارنے کا نام نہیں ہے، بلکہ میرے نزدیک ناموافق حالات کے پیش نظر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانیں بچانا زیادہ بڑا کارنامہ ہے۔ اس وقت میرے کندھوں پر ایک ہزار سے زیادہ جوانوں کی زندگیوں کا بوجھ آ پڑا ہے۔ مجھے ہر حال میں کوشش کرنی ہے کہ ان میں سے زیادہ سے زیادہ کو زندہ نکال لے جاؤں۔ یہاں رہنے کی صورت میں ان میں سے کسی کے بچنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ فیصلہ پہلے ہی سے ہو چکا ہے، اور جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، یہ فیصلہ میں نے نہیں بلکہ مجھ سے کہیں سینیئر افسروں اور اعلیٰ حکام نے کیا ہے، جس کی حکم عدولی کا صرف ایک ہی مطلب ہے، تاجِ برطانیہ سے غداری، اور مجھے آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ غداری کی سزا کیا ہوتی ہے۔'

تمام مقامی افسر پشتوں پر ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ میجر رسل نے کہا، 'مجھے ساٹھ جوانوں کی ضرورت ہے جو صوبیدار میجر نذیر خٹک کی قیادت میں فالتو ایمونیشن اور دیگر سامان کو ٹھکانے لگائیں گے۔ ہمارے پاس اسلحہ خانے میں چھ لاکھ گولیاں ہیں، لیکن فی جوان ایک سو راؤنڈ چھوڑ کر ہمیں باقی سارا ذخیرہ ضائع کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ خزانے میں چاندی کے ساٹھ ہزار روپے پڑے ہیں، وہ اونٹوں پر لاد کر ساتھ لے جانا ہوں گے۔ حوالدار مسعود یوسفزئی، آپ یہ دیکھیں کہ کھانے پینے کے لیے کیا سامان ساتھ لے جایا جا سکتا ہے، حوالدار نیاز بین، آپ کو تیس منٹ کے اندر اندر اصطبل کی رپورٹ پیش کرنی ہے، کتنے اونٹ اور خچر ساتھ لے جانے ہوں گے

Scanned with CamScanner

اور کتنوں کو یہیں پر ختم کر کے جانا ہے، باقی تمام حضرات اپنے اپنے متعلقہ یونٹوں کو روانگی کے لیے تیار کریں۔'

بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ حوالدار نیاز بین دوسرے جے سی اوز کے ساتھ اپنی اپنی پلٹنوں کی طرف چل پڑا۔ اس کا ذہن مکھیوں کے چھتے کی طرح مصروف تھا۔ دانہ میں مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے جنوبی وزیرستان ملیشیا کے 1115 جوان تھے، جن کی ترتیب کچھ یوں تھی:

آفریدی:	480
خٹک:	150
وزیر:	130
یوسفزئی:	90
گدون:	90
شیرانی:	90
اورکزئی:	45
بھٹانی:	40

نیاز بین کو کیمپ کے جنوب مغرب میں واقع وزیر ملیشیا کی بارک کی طرف پہنچتے پہنچتے یقین ہونے لگا تھا کہ افغان فوج کی وزیرستان آمد اور انگریز فوج کے یوں رات کی تاریکی میں فرار کی وجہ سے پورے علاقے میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ سرکش محسود قبائل، جنھیں انگریز فوج میں نمائندگی نہیں دی گئی تھی، پچھلے ستر برسوں کا حساب بے باق کرنے کے لیے کسی صورت میں انھیں یوں نہیں ٹکنے دیں گے۔ لیکن اسے سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش تھا کہ وہ اس صورتِ حال میں اپنے وزیری جوانوں کو کس طرح ساتھ رہنے پر آمادہ کر پائے گا۔

وہ جب بارک میں پہنچا تو سورج کی آخری کرنیں بڑی تیزی سے قلعے کے میدان سے

رخصت ہو رہی تھیں۔ انخلا کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور پوری بارک میں زبردست ہیجان کا عالم تھا۔ جوان ٹولیوں کی صورت میں ادھر ادھر کھڑے زور زور سے بول رہے تھے۔ نیاز بین کے پہنچنے سے ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی لیکن اس کے بعد جوانوں نے پھر زور و شور سے بحث شروع کر دی۔ نیاز بین نے ہاتھ اٹھا کر انھیں خاموش کروانے کی کوشش کی لیکن ایک ٹولی خاموش ہوتی تھی تو دوسری میں سے کوئی بولنا شروع کر دیتا تھا۔ اس شور شرابے میں نیاز بین کے کانوں میں جو آوازیں پڑیں وہ یہ تھیں کہ 'ہم بے غیرت نہیں ہیں کہ رات کی تاریکی میں پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں'، 'انگریز نے وزیرستان امیر کو لکھ کر دے دیا ہے، اب یہاں امیر کا سکہ چلے گا'، اور 'انگریز بھاگتا ہے تو بھاگے، یہ ہمارا وطن ہے، ہم کیوں گیدڑوں کی طرح بھاگیں؟' اتنے میں باہر سے تڑاتڑ گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں، پھر ایک ہینڈ گرینیڈ کا دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی تمام وزیری پلٹن بندوقیں اٹھائے ہوئے بارک سے باہر نکل آئی۔ نیاز بین ایک کونے میں کھڑا انھیں روکنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن اس پر کسی نے توجہ نہیں دی۔

آدھے گھنٹے بعد ایک خٹک سپاہی آیا۔ 'میجر رسل بلا رہے ہیں۔' نیاز بین آہستگی سے چلتا ہوا میجر کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے کمرے کی دیوار سے تصویریں اتار کر بیگ میں ڈال رہا تھا۔

نیاز بین خاموشی سے میجر کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ 'نیاز بین، رپورٹ؟'

'سر، وہ ہوا جس کا ڈر تھا۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔'

'کتنے؟'

'ایک سو تیس، سر۔'

'کل کتنے وزیر جوان تھے؟'

Scanned with CamScanner

'ایک سو تیس۔'

'ایک سو تیس کے ایک سو تیس؟' میجر رسل نے پوچھا۔

نیاز بین سر ہلا کر رہ گیا۔

'ہوں ں ں' میجر رسل نے میز کی دراز کھول کر اس میں خطوں کا ایک پلندہ اٹھایا اور اسے بھی بیگ میں ڈال دیا۔ 'اور اصطبل کی کیا پوزیشن ہے؟'

'سر، اصطبل کی طرف فی الحال کسی کا دھیان نہیں گیا۔ میں نے دس خشک وہاں پہرے پر لگا دیے ہیں۔ اس وقت وہاں گیارہ اونٹ اور چوالیس خچر موجود ہیں۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ ہمیں اس وقت ان میں سے صرف آدھے جانوروں کی ضرورت پڑے گی۔'

'ٹھیک ہے، بتایا جانوروں کو ضائع کرنا ہوگا۔ لیکن ان حالات میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آخر میں کتنے لوگ ہمارے ساتھ جائیں گے۔'

'یقین جانیں سر، میں نے انھیں روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن کسی نے میری ایک نہیں سنی۔ میں نے انھیں باپ بن کر پالا تھا، لیکن اسلحہ خانے پر آفریدیوں کے حملے کے بعد ان میں سے ایک بھی نہیں رکا، اور وہ سب کے سب مجھے دھمکیاں دیتے ہوئے اور انگریزوں کا غلام کہتے ہوئے قلعے کی دیواریں پھلانگ کر بھاگ گئے اور اپنی بندوقیں بھی ساتھ لے گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ محسود اور وزیر چاروں طرف سے اکٹھے ہو رہے ہیں، وہ سب کو ذبح کر دیں گے۔'

لیفٹیننٹ ہنٹ اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

اسی دوران مغربی دیوار کی طرف سے ایک زبردست دھماکے کی آواز آئی۔ میجر رسل کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ لیفٹیننٹ ہنٹ اور نیاز بین بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے۔ دھماکے کی آواز سٹور کی طرف سے آئی تھی جس کے ایک کونے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ ویری لائٹ کے کارتوس آتش بازی کے گولوں کی طرح دانہ کے سرخی مائل آسمان میں سبز، سرخ اور زرد قوسیں بناتے ہوئے غائب ہو رہے تھے۔ یہ کارتوس رات کے وقت دور دراز کی

چوکیوں کو سگنل دینے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے، لیکن اب ان کی طرف سے بھیجے جانے والے پیغامات دیوانے کے خیالات کی طرح بے ربط تھے۔

'سر، قلعے کے باہر قبائلی جتھے جمع ہو رہے ہیں،' لیفٹیننٹ ہنٹ نے کہا۔ نیاز بین انگریزی بول تو نہیں سکتا تھا لیکن انگریزوں کے ساتھ رہتے رہتے بات کا مفہوم کسی حد تک سمجھ لیتا تھا۔ 'ابھی میں نے مغرب کی طرف پہاڑی پر خاصی بڑی نقل و حرکت دیکھی ہے، اندھیرا پھیل گیا ہے اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ افغان فوج ہے یا قبائلی لشکر، لیکن دونوں صورتوں میں ہمیں جتنی جلدی ممکن ہو، قلعے سے نکلنا ہوگا۔ گیارہ بجے تک کا انتظار کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔'

اتنے میں صوبیدار میجر نذیر خٹک بھاگتا ہوا آیا اور میجر رسل کو سلیوٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور سینہ تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ نیاز بین کو وہ کبھی پسند نہیں آیا تھا کیوں کہ گرگِ باراں دیدہ صوبیدار میجر ہمیشہ ہی سے وزیریوں کے خلاف تھا اور انھیں فساد کی جڑ سمجھتا تھا۔

'صوبیدار میجر، کیا رپورٹ ہے؟' میجر نے پوچھا۔

'سر بہت بری خبر ہے،' نذیر خٹک نے کہا۔ 'صوبیدار مالک دین خیل آفریدی نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مرکزی سٹور پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اب سارا اسلحہ، خزانہ، راشن، سب کچھ اس کے قبضے میں چلا گیا ہے، اس سے بھی بری بات یہ ہے سٹور کے ساتھ والے کنویں پر بھی اس کے آدمیوں نے قبضہ جما لیا ہے اور وہ اس طرف کسی کو نہیں آنے دے رہے۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ میرے سپاہی اپنے ہی ساتھیوں سے لڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں نے مالک دین سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے میرے اوپر فائر کھول دیا، گولیاں میرے کندھے کے اوپر سے گزر کر گئی ہیں۔ ہمارا پندرہ برس کا ساتھ رہا ہے، اس کی طرف سے مجھ پر فائر نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے سر۔'

نیاز بین نے میجر رسل کو ہمیشہ بہت پرسکون دیکھا تھا۔ گذشتہ برسوں میں کئی بار مشکل

Scanned with CamScanner

حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن میجر ہمیشہ ہنستا مسکراتا رہتا تھا، لیکن اس وقت اس کا تمتماتا ہوا سرخ چہرہ اس قدر پیلا پڑ گیا تھا جیسے اس میں سے سارا خون نچڑ گیا ہو۔ 'ٹھیک ہے نذیر، تم جاؤ۔ اب منظم انخلا تو نہیں ہو سکتا، بس سپاہیوں کو اکٹھا کر کے جیسے تیسے نکلنے کی تیاری کرو۔'

'گل مینہ، گل مینہ، تم ٹھیک ہو؟ گل مینہ!'

گل مینہ نے کوشش کر کے آنکھیں کھولیں۔ زرجانان اس کے اوپر جھکا ہوا اسے شانوں سے پکڑ کر ہلا رہا تھا۔ اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔ گل مینہ نے کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی لیکن زرجانان نے اسے روک دیا۔ وہ اس کے پاس ہی زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ٹوپی، بھوری داڑھی اور شاڑی پر برف کے ذرے اٹکے ہوئے تھے۔ گل مینہ کو احساس ہوا کہ خود اس کا بدن بھی برف سے اٹا ہوا ہے۔

'زرجانان کیا ہوا ہے؟ وہ آ گئے نا؟ مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔' وہ رونے لگی۔

'نہیں نہیں، وہ یہاں نہیں آ سکتے۔ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟ چوٹ تو نہیں آئی؟' زرجانان نے سرگوشی کی۔

گل مینہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

'اتنا بڑا دھماکہ کسی رائفل یا بندوق کا نہیں ہو سکتا۔ آدھا درخت کٹ کر نیچے جا گرا ہے۔ شاخیں ہر طرف بکھری ہیں۔ اس علاقے میں سرداروں کی آپس میں جنگیں چلتی رہتی ہیں۔ شاید کسی نے غلطی سے درشکا کا گولہ داغا ہے، تم یہیں لیٹی رہو، یہاں سے ہلنا نہیں، میں حالات کا پتہ کرتا ہوں۔'

گل مینہ نے زرجانان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ 'نہیں، وہ دیکھ رہے ہوں گے۔ ابھی کہیں مت جاؤ۔'

زرجانان پہلے تو کسمسایا لیکن پھر وہیں پڑا رہا۔ اس کی انگلی کلاشنکوف کی لبلبی پر تھی۔ انھیں اسی حالت میں پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ دور سے ایک آواز آئی، 'تم ٹھیک تو ہو

Scanned with CamScanner

بھائی؟ چوٹ تو نہیں لگی؟'

گل مینہ نے دوبارہ زرجانان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ خاموش رہا۔ وہی آواز دوبارہ آئی،

'وہاں سے ہلنا نہیں، اس علاقے میں خانہ خراب کافر کا بچہ روسی نے مائن لگایا ہوا ہے۔'

اس کے بعد کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ زرجانان نے کلاشنکوف کا رخ آواز کی طرف کرلیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی کی ٹانگیں نمودار ہوئیں۔ 'بھائی، بندوق تو دوسری طرف کرو؛ اس نے کہا۔ 'ادھر قریب گاؤں ہے، گوگے خیل، میں ادھر سے آیا ہوں، سنگین خان نام ہے میرا۔ جنگل سے خرگوش پکڑنے آیا تھا۔'

زرجانان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی انگلی اب بھی لبلبی سے نہیں ہٹی تھی۔ گل مینہ بھی اٹھ گئی اور منہ دوسری طرف کر کے کھڑی ہوگئی۔ سنگین خان بولا، 'ارے، ارے، تمھارے ساتھ تو زنانہ بھی ہے۔ چوٹ ووٹ تو نہیں آیا؟'

'یہ گولہ کس نے پھینکا ہے؟ زمین میں گڑھا کھود کر رکھ دیا ہے؛ زرجانان نے پوچھا۔

'گولہ نہیں بھائی۔ یہ مائن تھا، مائن، جس کو بارودی سرنگ بولتا ہے۔'

'بارودی سرنگ؟'

'ہاں، تم شاید اس علاقے میں نیا نیا آیا ہے، یہاں سے لے کر نیچے وہ گھاٹی تک خانہ خراب روسی کافر نے بارودی سرنگ لگایا ہوا ہے۔ ادھر سے مجاہد لوگ جہاد کے لیے پاکستان سے آتا تھا، اب یہ پورا علاقہ غیر آباد ہے؛ سنگین خان نے ہاتھ لمبا کر کے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ 'گاؤں سے کوئی ادھر نہیں آتا۔ میں نے اوپر گھاٹی سے دھماکے کا آواز سن لیا تو ادھر آیا۔ خدا کا شکر ہے تم بچ گیا، ورنہ تو۔۔۔'

گل مینہ نے ایک چمچماتی نظر سنگین خان کی طرف دیکھا۔ اس کے بدن پر اس کی جسامت سے کہیں بڑی سبز جیکٹ تھی اور اسی جیکٹ کی ٹوپی ٹھوڑی کے نیچے آتی ہوئی دو ڈوریوں کی مدد سے کس کر سر پر باندھی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی خشخشی داڑھی نے برسوں سے قینچی کی شکل

نہیں دیکھی۔ کندھے پر ایک پرانی دونالی بندوق جھول رہی تھی۔

'عالم کوٹ کس طرف ہے؟'

'عالم کوٹ؟ کون سا عالم کوٹ؟' سنگین خان کے لہجے میں سخت حیرت تھی۔

'بس طوفان کی وجہ سے بھٹک گئے۔ تم ہمیں کرم کے راستے پر ڈال دو، ہم میاں بیوی وہاں رشتے داروں کے پاس جارہے ہیں، بڑی مہربانی ہوگی۔'

'تمھارا کیا خیال ہے تم کہاں ہو؟'

'کیا مطلب؟ ہم شوال سے آئے ہیں، کرم جارہے ہیں، بس ہمیں راستے پر ڈال دو۔'

'خدا کے بندے یہ پکتیکا ہے، تم پاکستان میں نہیں، افغانستان کی مٹی، بلکہ یوں کہنا چاہیے، افغانستان کی برف پر کھڑے ہو!'

زرجانان وہیں رک گیا۔ گل مینہ بھی اس کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔

'یہ افغانستان ہے؟' زرجانان کی آواز بہت دھیمی ہوگئی۔

'تو اور کیا؟ کسی کی بھی قسم دلوالو۔ پھر بھی یقین نہیں آتا تو میرے ساتھ گاؤں چلو، وہاں کسی بچے سے پوچھ لینا۔'

زرجانان گل مینہ کی جانب پلٹا۔ گل مینہ نے ایک لحظے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں دور پہاڑ کی چوٹی پر چمکتی برف پر جمادیں۔

'بھیا، کھڑا کیا سوچتا ہے؟ میرے ساتھ چلو، گھر میں تھوڑا آگ تاپو، کچھ کھانا ناکھاؤ، پھر جوڑ کر بیٹھیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔'

سنگین خان انھیں اسی راستے پر لے گیا جہاں سے وہ آئے تھے۔ 'یاد رکھو، صرف برف پر اپنے اپنے قدم کے نشان پر قدم رکھو؛ سنگین خان نے کہا۔ 'صرف اسی سے پتہ چلے گا کہ نیچے کوئی مائن نہیں ہے۔' وہ دو ڈھائی سو گز تک برف میں بنے گل مینہ اور زرجانان کے قدموں کے نشانوں پر احتیاط سے قدم رکھتا چلتا گیا۔ پھر وہ دائیں طرف مڑ کر ایک ٹیلے پر چڑھا اور گھاٹی میں

Scanned with CamScanner

اترنے لگا۔ راستے میں وہ انھیں بارودی سرنگوں کے بارے میں بتاتا گیا: 'یہ مائن جس سے تم کو خدا نے بچایا ہے اسے بمبیری مائن بولتا ہے۔ روسی اسے ہیلی کاپٹر سے پھینکتا تھا، اور یہ بمبیری کی طرح بھن بھن کرتا ہوا آہستہ سے آکر نیچے آرام سے اتر جاتا تھا۔ اس کا پر پنکھے کی طرح گھومتا تھا۔ بمبیری جانتا ہے نا، وہ جو گرمیوں میں پھولوں پر چکر لگاتا ہے؟' اس نے زرجانان سے پوچھا۔

زرجانان نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

'جدھر تم جا رہا تھا، ادھر سارے راستے میں یہ مائن پھیلا ہوا ہے۔ ابھی تو برف کے نیچے دبا ہوا ہے، اس لیے کسی کو نظر بھی نہیں آتا۔ کسی کا اس پر پاؤں آجائے تو بس سمجھو گیا۔ خود ہمارا ایک بھیڑ اس پر پاؤں رکھ کر ہوا میں اڑ چکا ہے، جب تک ہم چھری لے کر دوڑتا، اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور آنت مانت سب جھاڑی کے اوپر بکھرا ہوا تھا۔'

سنگین خان اونچی آواز میں بات کرتے ہوئے ربڑ کے لمبے بوٹوں سے برف میں کھچ کھچ کرتا دونوں سے آگے چلا جا رہا تھا۔

'اور پتہ ہے، یہ مائن خدائی خوار گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے، گھاس میں ہو تو ہرا ہو جاتا ہے، پتھر والا جگہ میں ہو تو سلیٹی، دشت میں ہو تو زمین کے رنگ کا بھورا، تاکہ دور سے نظر نہ آئے۔ کچھ مائن تو دیکھنے میں بچہ کا کھلونا لگتا ہے، کچھ گڑیا کی طرح ہوتا ہے، کچھ بندر یا بھالو جیسا۔ ہاتھ میں اٹھاؤ تو بھک سے پھٹ جاتا ہے، ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا تو نہیں لیکن سنا ضرور ہے کہ جس کے ہاتھ میں پھٹ جائے، سب سے پہلے اس کا سرفٹ بال کی طرح ہوا میں اچھل کر دور جا پڑتا ہے۔ روسی خدائی خوار شیطان کا بھی استاد تھا۔ وہ بچہ کو بھی نہیں بخشتا تھا تاکہ لوگ اس سے ڈر کر کمیونسٹ ہو جائے۔ بے غیرت، ڈرپوک کا بچہ کہیں کا، ابھی زنانہ ساتھ ہے نہیں تو میرے منہ سے کچھ سنتا۔'

'لیکن افغانستان کی حکومت ان کو ہٹاتی کیوں نہیں ہے؟' زرجانان نے پوچھا۔

'بھائی، تم بھی بہت سادہ ہے!' سنگین خان چلتے چلتے رک کر کھڑا ہو گیا۔ 'کون سا

افغانستان اور کون سی حکومت کا بات کرتا ہے؟ اس وقت افغانستان ایک ملک نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر سینکڑوں چھوٹا چھوٹا افغانستان ہے۔ کابل میں ڈاکٹر نجیبستان ہے، خود شہر سے باہر نہیں نکل سکتا، خود کو ملک کا صدر کہتا ہے۔ کابل کے باہر حکمت یارستان ہے، شمال میں مسعودستان ہے۔ ادھر ہرات کی طرف اسماعیلستان ہے، دوسری ولایتوں میں دوسرے ستان ہیں، ہماری پکتیکا ولایت میں کالے سفید کے مالک جنگی سردار ہیں جن کا کام صرف اور صرف لوٹ مار ہے۔ ہماری ولسوالی، جیسے تمھارے ہاں پاکستان میں تحصیل ہوتا ہے، ضلع ہوتا ہے، ہمارے ہاں ولسوالی ہے، تو ہماری ولسوالی میں سردار موسیٰ خان کا راج چلتا ہے۔ گیان میں سردار یار محمد ہے، دوسری جگہوں پر دوسرے سردار ہیں۔ پہلے یہ روسیوں کے ساتھ لڑتا تھا، روسی چلا گیا تو اب آپس میں کتوں کی طرح لڑتا ہے۔ اور پتہ ہے ان کو پیسے کمانے کا سب سے آسان طریقہ کیا لگتا ہے؟' سنگین خان نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔

اس سے پہلے کہ زرجانان کوئی جواب سوچتا، وہ دوبارہ رواں ہو گیا۔

'انھوں نے علاقے سے باہر جانے والی ہر سڑک پر زنجیریں باندھ کر وہاں اپنے غنڈے بٹھا دیے ہیں، جو ہر آنے جانے والی گاڑی سے بھتہ لیتا ہے۔ کوئی ٹال مٹول کرے تو اس کی پگڑی اچھالتا ہے۔ اسی طرح ہر دکان، ہر کاروبار والے سے بھتہ لیتا ہے۔ ان کا بس چلے تو ہر پہاڑ ہر وادی کو بھی زنجیروں میں جکڑ دیں اور اس کا قطرہ قطرہ خون نچوڑ کر پیتا رہے۔ بس یہ ہے یہاں کی حکومت، ان کو صرف اور صرف پیسے سے مطلب ہے، سرنگوں سے اور لوگوں کے مرنے سے انھیں کیا کام۔'

چلتے چلتے ایک چھوٹی سی ندی آگئی جس میں پانی تو کم تھا البتہ بڑے بڑے سلیٹی رنگ کے بھاری بھر کم پتھر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ندی سے سو گز دور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے پندرہ بیس مکانوں کی قطار تھی۔ سنگین خان نے ہاتھ سے اشارہ کیا، 'چلو جی باتوں باتوں میں گاؤں آگیا۔ یہ ہے جی ہمارا چھوٹا سا گنگے کوٹ۔'

Scanned with CamScanner

8

پاؤجان نے اونٹ کے کوہان کی شکل کی چٹان کے پیچھے سے جھانک کر نیچے وادی میں دیکھا۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا اور وانہ کے میدان میں کہیں کہیں روشنیاں جلنا شروع ہو گئی تھیں۔

پاؤجان اور اس کا لنگوٹیا دوست ابراہیم لبو لشکر کی تشکیل کے بعد کل سہ پہر موسیٰ نیکہ سے نکلے تھے اور آدھی رات تک چلتے رہے تھے۔ رات پہاڑوں میں چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد وہ پھر سفر پر نکل کھڑے ہوئے تھے لیکن پاؤجان اور اس کے ساتھی لشکر کی سست رفتاری سے اس قدر نالاں ہوئے کہ تیزی سے چلتے ہوئے انھیں دور پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

وانہ کا قلعہ نیچے وادی کے مشرقی کونے میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چاروں برجوں پر روشن مشعلوں نے اس کے بڑے حصے کو منور کر رکھا تھا۔ پاؤجان اور اس کے ساتھیوں کو معلوم تھا کہ یہاں انگریزی فوج کے ہزاروں سپاہی موجود ہیں جن کے پاس نہ صرف جدید ترین اسلحہ ہے بلکہ اعلیٰ تربیت بھی۔ اس لیے موسیٰ نیکہ سے آنے والے ڈھائی سو لشکریوں کے لیے اس پر حملہ کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اس لیے لشکر نے فیصلہ کیا تھا کہ قلعے کے قریب پڑاؤ ڈالا جائے اور دوسرے علاقوں سے آنے والے قبائلی لشکروں یا پھر افغان فوج کے ساتھ مل کر قلعے پر دھاوا بولنے کی حکمتِ عملی تیار کی جائے۔

قلعے کو تکتے تکتے پاؤجان کو ایک اور فکر لاحق ہو گئی۔ اسی قلعے میں اس کے بچپن کا دوست نیاز بین بھی تھا جو چند سال پہلے وزیرستان ملیشیا میں بھرتی ہو گیا تھا اور اب ترقی کرتے ہوئے حوالدار بن گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ نہ جانے اس وقت وہ قلعے میں ہوگا یا نہیں اور آیا اسے قبائلی لشکر اور افغان فوج کی آمد کا علم ہوگا یا نہیں، اور یہ کہ لڑائی کے دوران اگر نیاز بین اس کی تھری ناٹ تھری کی زد میں آ گیا تو کیا ہوگا؟ کیا اس کی انگلی لبلبی دبانے کی سکت رکھے گی؟ اور اگر وہ خود

نیاز بین کے نشانے پر آیا تو وہ کیا فیصلہ کرے گا؟

پاؤجان نے کمر پر بندھی مشک سے پانی کے چند چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر ان کے ساتھ خشک روٹی نگلی اور ایک ہموار پتھر پر چادر بچھا کر لیٹ گیا۔ ابراہیم نے اپنے لیے قریب ہی گھاس کا ایک تختہ منتخب کیا تھا۔ پاؤجان کو یقین تھا کہ لشکر جس رفتار سے آ رہا ہے، پو پھٹنے سے پہلے یہاں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس نے سوچا، چلو اچھا ہے، ان کے آنے سے پہلے وہ اور ابراہیم کچھ آرام کر لیں گے۔

ابھی پاؤجان نیم غنودگی کی حالت میں تھا کہ نیچے سے ایک دھماکے کی آواز آئی جو دیر تک ادھر ادھر کے پہاڑوں سے گونجتی رہی۔ وہ بھاگ کر چوٹی پر پہنچا تو ایک عجیب و غریب منظر نظر آیا۔ دور وادی میں انگریز قلعے کا مغربی حصہ آگ کی لپٹوں میں گھرا ہوا تھا اور وہاں سے رنگ برنگی روشنیاں نکل کر آسمان میں اٹھتی تھیں اور پھر قوس بنا کر فضا میں گھل جاتی تھیں۔ آگ کے اندر سے وقفے وقفے سے دھماکے ہو رہے تھے جن سے قلعے کے در و دیوار روشن ہو جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تڑاتڑ فائرنگ بھی شروع ہو گئی۔

'نیچے کیا ہو رہا ہے ابراہیم؟ یہ روشنیاں کیسی ہیں؟' پاؤجان نے ابراہیم سے پوچھا جو ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھا نیچے دیکھ رہا تھا۔ 'یہ خطرے کا اشارہ دینے والی روشنیاں ہیں۔ ہر رنگ کا کوئی مطلب ہوتا ہے۔ لیکن یہ تو پورا قلعہ جل رہا ہے۔ لگتا ہے افغانوں نے ہم سے پہلے پہنچ کر حملہ کر دیا ہے۔'

'میرا نہیں خیال کہ افغان اس قدر جلدی یہاں تک پہنچ سکتے ہیں،' پاؤجان نے کہا۔ 'یہ کوئی اور چکر لگ رہا ہے۔ کم بخت لشکر چیونٹی کی رفتار سے آ رہا ہے، نہ جانے کب پہنچے گا۔ میرے خیال سے ان کا انتظار کرنے کی بجائے نیچے چل کر دیکھنا چاہیے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ کیا کہتے ہو تم؟'

ابراہیم نے سر اثبات میں ہلایا اور دونوں اپنا سامان اور بندوقیں لے کر مشرقی ڈھلوان سے نیچے کی طرف تیزی سے روانہ ہو گئے۔ قلعے کی حالت کی وجہ سے اب انھیں احتیاط برتنے کی

Scanned with CamScanner

ضرورت نہیں تھی ورنہ وہ دونوں اس قدر تجربہ کار تھے کہ گھپ اندھیرے میں بھی چلتے وقت کسی قسم کی آہٹ پیدا نہ ہو۔ لیکن یہی جلدی پاؤجان کے لیے مضر ثابت ہوئی اور ایک جگہ اس کا پاؤں رپٹ گیا۔

وہ کئی لڑھکنیاں کھاتا ہوا گیا۔ کندھے سے تھری ناٹ تھری نکل کر دور جا گری اور اس کے گھٹنے پر گہری خراش پڑ گئی جس سے خون رس رس کر اس کی شلوار کو رنگین کرنے لگا۔ ابراہیم نے اپنے پٹکے کا کپڑا چیر کر اسے کس کر زخم پر باندھ دیا جس سے خون تو رک گیا لیکن جب پاؤجان چلنے لگا تو گھٹنے سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس نے جی کڑا کر کے سفر جاری رکھا، البتہ اب اس کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ ابراہیم نے کہا بھی کہ وہ کچھ دیر کے لیے رک جاتے ہیں لیکن پاؤجان لنگڑاتا ہوا چلتا رہا۔

اب وہ وادی میں اتر گئے تھے۔ یہاں سے قلعہ کم از کم ایک میل دور تھا لیکن یہیں سے قلعے کی طرف سے زبردست شور شرابے کی آوازیں آ رہی تھی۔ وقفے وقفے سے کوئی فائر بھی آس پاس کی پہاڑیوں کو لرزا دیتا تھا۔ جب وہ قلعے کی بلند و بالا دیواروں کے قریب پہنچے تو عجیب افراتفری کا عالم نظر آیا۔ قبائلی ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ جگہ جگہ اونٹ اور خچر، کچھ پر سامان لدا ہوا، کچھ خالی، آوارہ گھوم پھر رہے تھے۔ انھیں قبائلیوں کے اندر سرکاری فوج کے وردی پہنے ہوئے چند سپاہی بھی نظر آئے۔

پاؤجان نے تین چار قبائلیوں کو روک کر پوچھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے، لیکن وہ اس قدر سراسیمہ تھے کہ انھوں نے یا تو سنا نہیں یا پھر جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ پاؤجان اور ابراہیم قلعے کے بلند و بالا دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ ایک برآمدے میں ایک زخمی وزیری سپاہی لیٹا ہوا کراہ رہا تھا اور اس کے پاس وردی پہنے ہوئے ایک اور سپاہی اسے تسلی دینے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ پاؤجان نے ان کے قریب جا کر اپنا سوال دہرایا تو سپاہی چیخ کر بولا، 'انگریز قلعے کو آگ لگا کر گیدڑ کی طرح دم دبا کر بھاگ گیا ہے، ہم اس کے پیچھے جا رہے ہیں، بچ کر نکلنے نہیں دیں گے، آج ستر سال کے بدلے ایک ساتھ

چکانے کا دن ہے۔'

پاؤجان نے مزید معلومات لینے کی کوشش کی لیکن اس کا ساتھی بے ہوش ہو گیا تھا اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

پاؤجان اور ابراہیم تھوڑا آگے گئے تو ایک اور جتھا گرما گرم بحث میں سرگرداں ملا۔ ان کی بحث کا لب لباب یہ تھا کہ انگریزی فوج کس طرف گئی ہے۔ وانہ سے تین ہی بڑے راستے نکلتے تھے، ایک راستہ مغرب کو موسیٰ نیکہ کی سمت جاتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ وہ ادھر نہیں گئے ہوں گے۔ مشرق کی سمت ایک راستہ مرتضیٰ کو نکلتا تھا، دوسرا جنوب میں تنئی کا راستہ تھا، پھر ان راستوں سے آگے کئی راستے پھوٹتے تھے۔ اس لیے یہ معلوم کرنا بے حد ضروری تھا کہ وہ کس طرف کو بھاگے ہیں۔ مقامی وزیریوں نے یہ تو بتا دیا تھا کہ بہت سے قبائلی سپاہی انگریزوں کا ساتھ چھوڑ کر ان میں شامل ہو گئے ہیں لیکن اب بھی انگریز فوج کتنے جوانوں پر مشتمل ہے، اس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ اور یہ لوگ اسی بات پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔

پاؤجان اور ابراہیم قلعے میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ آگ مغربی عمارتوں کو نگلتی جا رہی تھی۔ اس وقت ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جو شعلوں کے لیے ایندھن کا کام کر رہی تھی۔ البتہ مشرق اور جنوب کی طرف بارکیں اور میدان کے دوسرے سرے پر بنی ہوئی عمارتیں محفوظ تھیں۔ بہت سے لوگ قلعے کے اندر سے سامان اٹھا اٹھا کر باہر لا رہے تھے۔ کئی نے اونٹوں یا لدے ہوئے خچروں کی باگیں تھامی ہوئی تھیں اور وہ بھڑکتے شعلوں کی روشنی میں تمتمائے ہوئے چہروں کے ساتھ انھیں قلعے سے باہر کی طرف لے جا رہے تھے۔ ان جانوروں پر ہر طرح کا سامان لدا ہوا تھا، بندوقوں کے گٹھے کے گٹھے، اسلحے کی پیٹیاں، کپڑوں کی گٹھڑیاں، قسم قسم کے تھیلے، بوریاں، قالین، میزیں، کرسیاں، دیگ، دیگچے، اور نہ جانے کیا الم غلم۔ بندوقوں والے خچر پر ایک جتھے نے دھاوا بول دیا اور تیز تیز لہجے میں اس کی ملکیت پر بحث ہونے لگی۔ جو دوبری خیل محسود خچر لے کر جا رہے تھے ان کا دعویٰ تھا کہ یہ مالِ غنیمت ہے جو انھوں نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے اس لیے

وہ اس کے بلاشرکتِ غیرے مالک ہیں لیکن زلی خیل محسود کہہ رہے تھے کہ یہ اسلحہ سب کی مشترکہ ملکیت ہے کیوں کہ اس کی مدد سے ہندوستان پر حملہ کیا جائے گا۔ پھر تڑاتڑ فائر کی آواز آئی اور پاؤجان نے ماند پڑتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں دونوں خیلوں کے محسودوں کو تیورا کر نیچے گرتے دیکھا۔

پاؤجان نے ایک بار پھر ابراہیم سے مشورہ کیا۔ ان کے پاس اپنے لشکر کی آمد کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ دونوں ایک لمبی بارک میں جا کر لوہے کی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ پاؤجان نے آنکھیں موندنے کی کوشش کی لیکن باہر ہونے والے ہاؤہو میں اسے نیند نہیں آئی۔ وہ بارک سے نکل آیا۔ مغربی کمروں کے شعلے اب بجھ گئے تھے۔ چھتیں، دروازے، کھڑکیاں سب راکھ ہو چکی تھیں صرف کمروں کے ڈھانچے باقی رہ گئے تھے۔ پاؤجان کو پیاس لگی تھی، وہ بارک کے سامنے کنویں کی طرف چلا گیا۔ اندھیرے میں وہ ایک لاش سے ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔ کنویں پر ایک آدمی کھڑا ڈول کی مدد سے پانی کھینچ رہا تھا، اس کے پاس ایک سیاہ گھوڑا سر جھکائے کھڑا تھا۔

پاؤجان قریب آیا تو اس شخص کو پہچان لیا۔ یہ موسیٰ نیکہ سے تین چار میل دور موسیٰ نیکہ گاؤں کا رہنے والا جرواہا قدرزمان تھا جو سال دو سال پہلے انگریز فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے ایک مہم میں پاؤجان کا ساتھ دیا تھا۔

'قدرزمان تم؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اچھا کیا کہ خنزیر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ میرے ساتھ ابراہیم بھی ہے، گاؤں کے دوسرے لوگ بھی پیچھے آ رہے ہیں، تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں گے۔'

قدرزمان خالی ڈول ہاتھ میں لیے پاؤجان کو دیکھتا رہا۔ پھر اس افسوس میں سر ہلایا۔

'یار پاؤجان، جو کچھ ہوا ہے، بہت برا ہوا ہے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، میری پلٹن آگے چلی گئی ہے، اور میں یہاں رہ گیا ہوں۔'

'ارے لعنت بھیجو پلٹن ملٹن پر، انگریز کی پلٹن تھی، وہ دم دبا کر بھاگ گیا تو پلٹن بھی اس کے ساتھ دفان ہو گئی، تم شکر کرو جان چھوٹی خنزیر سے۔'

قدرزمان تھکا تھکا سا کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ 'نہیں یار، میں تو ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا، بس جا نہیں سکا۔'

'اگر تمھیں اتنی ہی فکر ہے تو تم ان کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟' پاؤجان نے پوچھا۔

'میں تو ساتھ ہی جا رہا تھا، لیکن میرے ذمے حوالدار نیاز بین نے ایک ایسا کام لگایا جو میرے بس کا روگ تھا ہی نہیں۔ اس نے کہا کہ جو اونٹ، خچر اور گھوڑے ساتھ نہیں لے جا سکتے، انھیں گولی مار کر ہلاک کر دوں۔ دشمن کے لشکر پر گولی چلاتے ہوئے مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا، لیکن کسی بے زبان کو مارنا زیادہ مشکل کام ہے۔ فوج میں حکم تو بس حکم ہوتا ہے جسے ہر حال میں بجالانا پڑتا ہے۔ میں نے پانچ اونٹ اور دس بارہ خچر مار ڈالے۔' یہ کہتے ہی قدرزمان بلند آواز سے رونا شروع ہو گیا۔

پاؤجان اس کے پاس کھڑا دیکھتا رہا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی کڑیل جوان ہے جس نے جنگی معرکوں میں کئی بار زبردست بہادری کا مظاہرہ کیا تھا اور اب وہ بچوں کی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے۔ تھوڑی دیر ہڑکنے کے بعد قدرزمان نے اندھیرے میں ایک طرف اشارہ کیا۔ پاؤجان نے دیکھا کہ وہاں ایک سیاہ گھوڑی زمین پر پڑی پیال میں منھ مار رہی ہے۔

'میں پچھلے چار ماہ سے اس کی رکھوالی پر مامور ہوں،' قدرزمان نے بات جاری رکھی۔ 'اسے روزانہ اپنے ہاتھ سے چارا کھلاتا ہوں، اس کی مالش کرتا ہوں، اس پر گولی چلاتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ گیا۔ بس اسی ادھیڑبن میں لشکر نکل گیا۔ پھر یہاں لڑائی شروع ہو گئی اور مجھے جان بچانے کے لیے بیرک میں چھپنا پڑا۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ سمجھیں گے میں بھگوڑا یا باغی ہو گیا ہوں اور میرے ساتھ اب بھگوڑوں اور باغیوں جیسا سلوک ہی کیا جائے گا۔'

Scanned with CamScanner

9

زرجانان اور گل بینہ نے وہ رات گنگے کوٹ میں گزاری۔ جنگل کے دامن میں آباد یہ گاؤں مشکل سے بیس پچیس گھروں پر مشتمل تھا۔ سنگین خان کا مکان دوسرے گھروں سے پندرہ بیس گز دور ہٹا ہوا تھا اور صرف ایک بڑے کمرے اور برآمدے پر مشتمل تھا جس میں وہ اس کی بیوی اور دو بچوں پر مشتمل خاندان رہتا تھا۔ بھیڑ بکریوں کا باڑا گھر کے صحن ہی میں بنا تھا۔ وہاں مہمانوں کے لیے جگہ نہیں تھی، اس لیے سنگین خان کھانا کھلانے کے بعد زرجانان کو گاؤں کے حجرے میں لے گیا۔ اس کی بیوی مہتاب نہایت ملنسار اور خوش اخلاق خاتون تھی اور عمر میں سنگین خان سے کم از کم بیس سال چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔ گل بینہ نے اندازہ لگایا کہ وہ اس سے تین چار سال سے زیادہ بڑی نہیں ہوگی۔

اسے گل بینہ کی تھری ناٹ تھری رائفل دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے آج تک کسی عورت کو رائفل لے کر پھرتے نہیں دیکھا تھا۔ گل بینہ نے اسے بتایا کہ یہ رائفل اس کے دادا کی نشانی ہے اور وہ کسی صورت اسے خود سے جدا نہیں کر سکتی۔

اس نے زیادہ سوال پوچھے بغیر اپنی بساط کے مطابق گل بینہ کی مہمان نوازی کی۔ گھر میں صرف دو چارپائیاں تھیں، جن میں سے ایک گل بینہ کو دی گئی جب کہ بچے ماں کے ساتھ ہی سوئے۔ شدید تھکن کے باوجود گل بینہ کو سوتے سوتے دیر لگ گئی۔ اسے بار بار خیال آ رہا تھا کہ اگر درخت سے برف پھسل کر بار دوی سرنگ کے اوپر نہ گرتی بلکہ ان کے پاؤں کے نیچے آ کر پھٹتی تو اس کا اور زرجانان کا کیا حال ہوتا۔

اگلی صبح گل بینہ نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس سے چلا نہیں گیا۔ اس کے پاؤں سے خون رس رس کر جرابیں کو سرخ رنگ گیا تھا اور وہ زخموں کے ساتھ چپک گئی تھیں۔ جرابیں اتارنے کی

کوشش میں اس کی منہ سے چیخ نکل گئی۔ مہتاب جان مٹی کی توی پر روٹی لگا رہی تھی، وہ روٹی وہیں چھوڑ کر بھاگی بھاگی آئی۔ 'ارے ارے، تم نے رات کو کیوں نہیں بتایا؟ ٹھہرو، میں پانی لاتی ہوں۔'

گرم پانی ڈالنے اور قینچی سے کاٹنے کے بعد گل بینہ کی جرابیں اتریں تو دونوں پاؤں کا جیسے قیمہ بنا ہوا تھا۔ تلوے کے درمیانی حصے کو چھوڑ کر جگہ جگہ موٹے موٹے چھالے تھے جن کے اندر سے گلابی گوشت نظر آ رہا تھا۔ نمکین پانی سے دھونے سے خون رسنا بند ہوا تو سنگین خان کی بیوی نے دونوں پاؤں کپڑے سے کس کر باندھ دیے۔

سنگین خان زرجانان کے لیے کھانا حجرے میں لے گیا۔ سہ پہر کے وقت وہ زرجانان کو گھر لے کر آ گیا اور صحن میں چارپائی بچھا کر اسے وہاں بیٹھنے کو کہا۔ اس کی بیوی اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ گل بینہ برآمدے میں چوکی پر ستون کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔

'دیکھو زرجانان بھائی، تم جانے کو بول رہا تھا لیکن میں تمھیں گھر لے آیا تاکہ تم خود اپنی آنکھوں سے اپنی گھر والی کی حالت خود دیکھ لو کہ وہ چلنے کے قابل ہے بھی یا نہیں۔ تم یہاں آرام سے اپنی گھر والی سے مشورہ کر لو، میں ایک دو کام کاج نمٹا کے آتا ہوں۔' پھر سنگین خان منہ اندر کمرے کی طرف کر کے زور سے پکارا 'طاؤس خان کی ماں، تمھاری ماں صبح حجرے کے پاس نظر آئی تھی، تمھیں اور بچوں کو یاد کر رہی، چلو سے ہو آتے ہیں تھوڑی دیر کے لیے۔' سنگین خان کی بیوی ایک بچہ بغل میں اٹکائے نکلی۔ دوسرا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ سنگین خان نے جاتے جاتے دروازہ بند کر دیا۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد تک خاموشی رہی۔ آج خوب چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور صحن میں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ گل بینہ برآمدے میں چوکی پر بیٹھی اپنا دوپٹہ انگلیوں پر لپیٹ کھول رہی تھی۔

زرجان نے دھیمی آواز میں پوچھا 'کیسی طبیعت ہے تمھاری؟'

Scanned with CamScanner

'ٹھیک ہوں، پاؤں تھوڑا تنگ کر رہے ہیں۔'

'ادھر صحن میں آجاؤ، یہاں اچھی دھوپ آرہی ہے۔'

گل مینہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سب لوگ گھر خالی چھوڑ کر کیوں چلے گئے ہیں۔ وہ ستون کا سہارا لے کر اٹھی لیکن جیسے ہی قدم زمین پر جمانے کی کوشش کی تو لگا جیسے دہکتے انگارے پر پیر رکھ دیا ہے۔ وہ دوبارہ وہیں بیٹھ گئی۔

زرجانان اس کے پاس آگیا۔ 'اوہو، تمھارے پاؤں تو خاصے زخمی ہو گئے ہیں۔ مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا، مجھے بتا دیتیں تو ہم کہیں رک جاتے۔'

'نہیں بس چند چھالے ہیں۔ مہتاب جان نے مرہم لگا کے کپڑا باندھ دیا ہے۔ کل تک ٹھیک ہو جائیں گے۔'

'اچھا، تم سے ضروری بات کرنی ہے،' زرجانان ایک چوکی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔

'میں نے سنگین خان کو سب کچھ بتا دیا ہے۔'

'کیا بتا دیا ہے؟'

'یہی ہمارے بارے میں۔'

'افوہو۔ سب بتا دیا؟ لیکن اس کی کیا ضرورت تھی؟ ہم ایک دو دن میں یہاں سے ویسے ہی چلے جاتے۔'

'سنگین خان دیکھنے میں نہیں لگتا لیکن ہے بڑا ہوشیار اور سمجھ دار۔ اسے خود ہی پتہ چل گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کوئی جوڑا اس طرح پہاڑوں میں اس موسم میں بھٹکتا نہیں پھرتا، اور نہ ہی ادھر سے کوئی راستہ کرم کی طرف جاتا ہے۔ وہ شوال، میران شاہ سب جگہوں پر گیا ہوا ہے۔ کہنے لگا تم میران شاہ کی طرف کیوں نہیں گئے، وہاں سے گاڑی میں ہو کر کرم چلے جاتے؟ زنانہ کو لے کر کوئی اس طرح پھرتا ہے؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، اس لیے بتا دیا۔ ویسے بھی اس نے ہمارے ساتھ اتنی ہمدردی اور مہربانی کی ہے، اس سے مسلسل جھوٹ بولتے رہنا اچھا نہیں لگا۔'

'اوہو، اب کیا ہوگا؟ مہتاب بی بی نے میرا بڑا خیال رکھا ہے، نہ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی۔'

'کچھ نہیں سوچے گی وہ، تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کل ساری رات پہاڑوں پر برف گرتی رہی ہے۔ اب تو اس طرف کسی صورت واپس نہیں جایا جا سکتا۔ پھر کل تم نے خود ہی دیکھ لیا کہ وہاں بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں، ہم کل تو بچ گئے لیکن خدانخواستہ پہاڑوں میں کوئی مسئلہ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ سنگین خان کہہ رہا تھا کہ صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم درۂ خیبر کے راستے سے پاکستان میں داخل ہوں اور وہاں سے پشاور چلے جائیں۔'

'درۂ خیبر؟ لیکن وہ تو بہت دور نہیں پڑے گا؟'

'ہاں بہت دور ہے، اور دوسرا مسئلہ یہ کہ ہو سکتا ہے کچھ لوگ ہماری تلاش میں پشاور پہنچ گئے ہوں۔ سنگین خان اور میں کل آدھی رات تک اور آج صبح سے اب تک صلاح مشورہ کرتے رہے ہیں۔ اس نے دوسرا مشورہ دیا ہے۔'

'وہ کیا؟'

'ہم اس وقت صوبہ پکتیکا میں ہیں۔ یہاں سے جنوب کی طرف چلیں تو تین ساڑھے تین سو کلومیٹر کے بعد قندھار شہر آتا ہے۔ وہاں کے بس اڈے میں سنگین خان کے بہنوئی کی کباب کی دکان ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مجھے بھی ادھر کام مل جائے گا۔ اس لیے کیوں نہ ہم کچھ عرصے کے لیے یہیں افغانستان میں رک جائیں۔ تم کیا کہتی ہو؟'

'افغانستان میں؟ یہاں ہم کیسے رہ سکتے ہیں؟ یہاں تو جنگ ہو رہی ہے، پاکستان میں کم از کم امن تو ہے۔'

'میں نے اس سے یہی بات کہی تھی۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ جنگ یہاں نہیں بلکہ کابل میں ہو رہی ہے جو یہاں سے بہت دور ہے۔ اس علاقے میں مجاہدین کمان داروں کی حکومت ہے، جو آپس میں لڑتے رہتے ہیں لیکن غریب آدمی سے ان کا لینا دینا نہیں ہے۔ ہمیں کوئی کیا کہے گا۔'

Scanned with CamScanner

'لیکن سرکاری لوگ ہمیں یہاں رہنے دیں گے؟ کسی نے پکڑ لیا تو؟'

'ارے کوئی نہیں پکڑتا، دونوں طرف کے لوگ ادھر ادھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہماری زبان بھی ایک ہے، شکل وصورت اور باقی ساری چیزیں بھی ایک جیسی ہیں، کسی کو کیا پتہ چلے گا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں۔'

'مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔'

'حالات تمھارے سامنے ہیں۔ پھر پاکستان میں خطرہ بھی ہے، دوسری طرف کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی کہ ہم یہاں ہیں۔ میں نے تو کافی غور کیا ہے اور میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ کچھ عرصہ یہیں رہتے ہیں، حالات تھوڑے ٹھنڈے پڑ جائیں تو واپس چلے جائیں گے۔'

گل مینہ نے سر اپنے زانوؤں پر ٹکا دیا۔ 'اگر تم نے اچھی طرح سے سوچ لیا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں تو تمھاری مرضی میں خوش ہوں۔' یہ کہتے ہی وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکیں اور ہڑکیاں لے کر رونے لگی۔ زرجانان اٹھ کر قریب آ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

10

جب دانہ قلعے سے پچیس خچروں اور پانچ اونٹوں پر مشتمل قافلہ نکلا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے، پتھریلے پہاڑ دن بھر سورج کی تپش جذب کرنے کے بعد اب اسے دھیرے دھیرے چھوڑ رہے تھے اور قافلے کے ساتھ جنوبی وزیرستان ملیشیا کے سوا گیارہ سو جوانوں میں سے دو سو نوے باقی بچے تھے۔ صرف یوسف زئی اور خٹک پلٹنیں ایسی تھیں، جن میں سے کسی نے بغاوت نہیں کی، ورنہ آفریدی اور وزیر تمام کے تمام فرار ہو گئے، جب کہ دوسری قوموں سے تعلق رکھنے والے اکثر سپاہی بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ ان کے ساتھ ڈیڑھ سو سویلین ملازم بھی تھے جن میں کلرک، منشی، دھوبی، موچی، دکاندار اور ماشکی شامل تھے۔ یہ الگ بات کہ کنویں پر باغیوں کے قبضے کی وجہ سے ماشکیوں کو مشکیں بھرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور وہ ان کے بے جان لوتھڑے کندھوں پر دائیں بائیں جھول رہے تھے۔

انھیں چلتے چلتے دو گھنٹے ہو چلے تھے۔ راستہ ایک ڈھلوان سے گزرنے لگا تو میجر رسل نے مڑ کر دیکھا۔ دور دانہ قلعے کے مختلف حصوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ میجر رسل اور لیفٹیننٹ ہوٹ نیاز بین سے کچھ آگے آپس میں دھیمی آواز میں باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ نیاز بین کو معلوم تھا کہ میجر کو کس بات کی تشویش ہے۔ اسلحہ خانے کے برج پر آفریدیوں کا قبضہ ہو جانے کے باعث اسے تباہ نہیں کیا جا سکا تھا۔ جو ایمونیشن دوسری جگہوں پر پڑا تھا اسے افسر میس میں اکٹھا کر کے متعدد کمبل ڈال کر مٹی کا تیل چھڑک کے آگ دکھا دی گئی تھی لیکن ابھی تک وہاں سے کسی دھماکے کی آواز نہیں آئی تھی جس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ آگ بجھ گئی ہے یا بجھا دی گئی ہے۔

زیادہ مسئلہ دو ویکرز مشین گنوں کا تھا، جو بھاری ہونے کی وجہ سے ساتھ نہیں لائی جا سکی

Scanned with CamScanner

تھیں۔ سپاہیوں نے ہتھوڑا مار کر ان کے سکرو خراب کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن جلدی کی وجہ سے یہ کام تسلی بخش طریقے سے نہیں ہو سکا تھا اور یہ مہلک مشین گنیں بہت آسانی سے دوبارہ کارآمد بنائی جا سکتی تھیں، اور اگر وہ دشمن، خاص طور پر تربیت یافتہ باغیوں کے ہاتھ لگ جاتیں تو فرار ہوتے ہوئے ملیشیا کے لیے تباہ کن ثابت ہو جاتیں۔ دور سے قبائلیوں کے جتھوں کی نقل و حرکت کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن ان کی سمت اور فاصلے کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ فائر بھی سنائی دے جاتا تھا۔

یہ شعبان کی آخری رات تھی، اس لیے چاند نہیں نکلا تھا لیکن تاروں کی روشنی اس قدر تھی کہ راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ ملیشیا کے بچے کھچے دستے خاموشی سے وانہ کے میدان کے آخر تک پہنچ گئے تھے۔ جلد ہی یہ چوڑا راستہ تنگ ہو کر جنوبی پہاڑیوں پر چڑھنا شروع ہو جائے گا، اور اس وقت سب کو اندھیرے میں مشکل پیش آئے گی۔

نیاز بین کو اچانک یاد آیا کہ آج شعبان کی تیسویں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کل پہلا روزہ ہو گا لیکن سحری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ورنہ اس سے قبل قلعے میں رمضان میں تراویح اور سحری کے وقت خوب رونق رہتی تھی۔

نیاز بین نے دیکھا کہ میجر اور لیفٹیننٹ دونوں چلتے چلتے رک گئے ہیں اور پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ نیاز بین جب ان کے قریب پہنچا تو میجر نے اسے مخاطب کیا۔

'حوالدار نیاز بین، خاصی دیر سے ایک بات میرے دماغ میں کانٹے کی طرح اٹکی ہوئی ہے۔'

'جی سر، بحکم؟'

'میری بات بالکل غیر جذباتی ہو کر سننا اور ٹھنڈے دماغ سے اس پر غور کرنا، اور خاص طور پر یہ سوچنا کہ اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے۔'

'آپ اطمینان رکھیں سر، جو بھی ہے بتا دیں۔'

'نیاز بین، میں سوچ رہا ہوں کہ تمھاری برادری کے سارے کے سارے وزیر فرار ہو

گئے ہیں، تم بھی تو وزیر ہو، تم ان کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟'

نیاز بین کو یہ سوال سن کر حیرت ہوئی اور اسے جواب سوچنے میں تھوڑا وقت لگ گیا۔ میجر اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ لیفٹیننٹ ہنٹ دس پندرہ قدم دور کھڑا رہا۔

'میجر صیب، میں وزیر ضرور ہوں،' نیاز بین بولا۔ 'لیکن میں نے تاجِ برطانیہ کا نمک کھایا ہے، خود اپنے قبیلے میں بدنامی اور رسوائی مول لی ہے۔ غیروں کی باتیں تو اپنی جگہ، آپ کو معلوم ہے کہ مجھے خود اپنے گھر والوں سے کس قسم کے طعنے سننے پڑے ہیں لیکن میں نے نمک کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ میری رگوں سے خون کا آخری لال قطرہ بہہ نکلے گا لیکن اس کے اندر سے غداری اور بے وفائی کا رنگ نہیں نکلے گا۔ اور خاص طور پر اب، جب ایک واقعہ ہو گیا ہے اور وہ حالات پیدا ہو گئے ہیں جب میرے ساتھیوں کو میری سب سے زیادہ ضرورت ہے، میں کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدل دوں اور اگلا پچھلا سب بھلا دوں؟'

نیاز بین ایک طرف ہو گیا تا کہ پیچھے آنے والے سپاہیوں اور جانوروں کو گزرنے کی جگہ مل جائے۔

'وہ تو ٹھیک ہے، نیاز بین،' میجر نے کہا۔ 'لیکن سوال یہ ہے کہ میں سو فیصد یقین سے کیسے کہوں کہ اس وقت تمھاری وفاداریاں کس طرف ہیں، مجھے کیا پتہ کہ تم کس نیت سے پیچھے رک گئے ہو؟ اس لیے مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تم سے مجبوراً اسلحہ لینا پڑے گا۔ تم اسی وقت اپنا پستول اور رائفل لیفٹیننٹ ہنٹ کے حوالے کر دو۔' لیفٹیننٹ ہنٹ کچھ دور کھڑا ان کی بات سن رہا تھا۔ وہ ان کے قریب آ گیا۔

'میجر صیب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں،' نیاز بین ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ 'میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آپ کے ساتھ آیا ہوں، مجھے بھی پتہ ہے اور آپ کو بھی پتہ ہے کہ سینڈی مین قلعے تک پہنچنے کے لیے آگ کے سمندر سے گزرنا پڑے گا، لیکن آپ مجھ سے میرا اسلحہ بھی لے رہے

Scanned with CamScanner

ہیں۔آپ مجھ سے ہزار گنا زیادہ تجربہ کار اور پڑھے لکھے ہیں، اس لیے آپ کی نظر موجودہ حالات پر مجھ سے کہیں بہتر ہوگی، لیکن اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ ہم پر کسی بھی وقت حملہ ہوسکتا ہے۔ سپاہی بغیر اسلحے کے ادھا بھی ہوتا ہے اور اپاہج بھی۔ اگر حملہ ہوا تو میں کیا کروں گا؟ دشمن پر پتھر روڑے برساؤں گا؟'

'دیکھو نیاز بین، یہ ذاتیات یا انا کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں مسئلہ کچھ اور ہے۔ تم صرف صوبیدار مالک دین خیل کی مثال لے لو۔ وہ تم سے کہیں زیادہ سینیئر سپاہی ہے اور اس نے کئی معرکوں پر میرے ساتھ مل کر زبردست شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور اب وہی مالک دین گھر کا بھیدی ہونے کی وجہ سے میرے لیے جنرل نادر سے کہیں بڑا سر درد ہے۔ جنرل نادر کے پاس بھاری توپیں ہیں، لیکن صوبیدار مالک دین کے پاس اس سے زیادہ خطرناک اسلحہ ہے، اور وہ ہے معلومات۔ وہ ہماری ہر حرکت، ہر چال، ہر طاقت اور ہر کمزوری سے بخوبی آگاہ ہے، اس لیے ہمیں بری طرح سے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اور اگر وہ جنرل نادر کے ساتھ مل گیا تو؟ میں تصور بھی نہیں کرسکتا کہ اس وقت کیا ہوگا اور ہم کیا کریں گے۔'

میجر رسل نے ایک قدم آگے بڑھ کر نیاز بین کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ 'بطور کمانڈنگ افسر میرے سر پر جو ذمہ داری ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ میں تمھیں نہتا کردوں۔ یقین کرو مجھے یہ فیصلہ کرتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے، اور میرا دل کہتا ہے کہ تمھاری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے، لیکن مجھے اس وقت دل سے نہیں دماغ سے کام لینا ہے۔ مجھے پکی امید ہے کہ اگر تم میرے نقطۂ نظر سے دیکھو تو تم بھی اسی نتیجے تک پہنچو گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم فورٹ سینڈی مین تک ہمارے ساتھ رہے تو میں تم سے تحریری معافی مانگ لوں گا اور حکام سے تمھارے لیے بہادری اور وفاداری کے تمغے کی سفارش کروں گا۔ لیکن اس وقت تم سے اسلحہ لیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، لیفٹیننٹ؟' میجر نے لیفٹیننٹ ہنٹ کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر نیاز بین کے کندھے سے بندوق اتار لی اور اس کے بغل میں سے پستول کا ہولسٹر بھی اتار کر اپنے کندھے پر

لٹکے ہوئے بیگ میں ڈال دیا۔

نیاز بین خاصی دیر بت بنا وہیں کھڑا رہا۔ سپاہی اور جانور اس کے پاس سے ہو کر گزرتے رہے۔ جب آخری خچر گزرے ہوئے بھی دیر ہوگئی تو وہ مرے مرے قدموں سے لشکر کے پیچھے چل پڑا۔

Scanned with CamScanner

11

گل مینہ کی اب تک کی زندگی تین اموات کے گرد گھومتی تھی، اور ہر موت پچھلی سے زیادہ المناک۔۔۔

اسے اپنے باپ کی شکل بالکل یاد نہیں تھی۔ صرف اتنا یاد تھا کہ گھر کا صحن لوگوں سے بھرا ہوا ہے، چارپائیوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں بلند آواز سے سر اور چھاتی کوٹ کوٹ کر روتی ہیں اور ماں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔

گل مینہ اوپر تلے چار بھائیوں کے بعد اس وقت پیدا ہوئی تھی جب اس کی ماں کے دل میں بیٹی کی امید دم توڑ چکی تھی۔ ان میں سے دو بھائی تو کم عمری ہی میں چل بسے تھے لیکن اس کے باوجود ماں نے گل مینہ کو اتنا پیار اور توجہ دی کہ بعض اوقات بھائی اپنی چھوٹی بہن سے حسد کرنے لگتے تھے۔ وہ کہا کرتی تھی کہ 'بیٹا پہلے باپ کا ہوتا ہے پھر یاروں دوستوں کا، اور آخر میں بیوی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن بیٹی ماں کی ہوتی ہے، اور مرتے دم تک ماں ہی کی رہتی ہے۔'

اسی نے ضد کر کے اور اپنے بیٹوں سے لڑ بھڑ کر گل مینہ کو سکول میں داخل کروایا تھا۔ اس کام میں دادا نے بھی گل مینہ کی ماں کا ساتھ دیا۔ پہلے تو وہ تین جماعتوں تک گاؤں کے لڑکوں کے سکول میں پڑھتی رہی۔ لیکن جب ساتھ والے گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری سکول کھل گیا تو دادا نے اسے وہاں تیسری جماعت میں داخل کروا دیا۔ ماں سکول جانے سے پہلے اس کا منہ صابن سے رگڑ رگڑ کر دھوتی، دانتوں کو دنداسہ مل مل کر چمکاتی، سکول کی آسمانی رنگ کی قمیص اور سفید شلوار پہناتی۔ اس کے بال مختلف طریقوں سے بناتی۔ کبھی سر کی چوٹی پر شہد کی مکھیوں کے چھتے کی مانند جوڑا، کبھی دائیں بائیں جھولتی دو چوٹیاں، کبھی کنگھی کر کے کھلے چھوڑ دیتی تو گھنگھریالے بال ایک بھوری آبشار کی طرح کندھوں پر پھیل جاتے۔

جب گل مینہ کندھوں پر بستہ لٹکائے اور ہاتھ میں تختی تھامے دوسری لڑکیوں کے ساتھ ندی کے ساتھ ساتھ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے سکول کی طرف جاتی تو مڑ کر دیکھنے پر اسے ماں گھر کے باہر چبوترے پر کھڑی اس وقت تک نظر آتی رہتی جب تک وہ سکول کے احاطے میں داخل نہ ہو جاتی۔ سکول سے واپسی پر وہ اسے کھانا کھلاتے ہوئے اس دن کا سارا احوال پوچھتی، مس فرزانہ نے کیا پڑھایا، کس لڑکی کو سہیلی بنایا، کس کے ساتھ لڑائی ہوئی۔ ماں خود ان پڑھ تھی لیکن گل مینہ کے ساتھ پڑھتے پڑھتے وہ بھی لفظ پہچاننے لگی تھی۔

گل مینہ چوتھی جماعت میں تھی۔ اس نے ریاضی کے ٹیسٹ میں دس میں سے دس نمبر لیے تھے اور مس فرزانہ نے اسے خاص طور پر شاباش دی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ وقت کو تیزی سے آگے چلا کر گھر پہنچے اور ماں کو وہ صفحہ دکھائے جس پر مس نے سرخ پین سے تین موٹے موٹے ستارے بنائے تھے۔ گھنٹی کی ٹن ٹن کی لرزش ابھی ہوا ہی میں تھی کہ وہ سکول کے دروازے سے نکل چکی تھی۔ سہیلیاں بستے اور تختیاں سنبھالتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑتی رہ گئیں لیکن وہ تو تنگ پگڈنڈی پر جیسے اڑی چلی جا رہی تھی۔ اس نے کنڈھا مار کر دروازہ کھولا، 'ماں، ماں، دیکھو تو۔۔۔' لیکن ماں گھر پر نہیں تھی۔ نہ دادا نہ بڑا بھائی۔ 'ماں بیمار ہے، اسے چارپائی پر ڈال کر شوال لے گئے ہیں، وہاں سے گاڑی پر میران شاہ کے ہسپتال لے جائیں گے،' بھائی نے اس کے پوچھنے پر بتایا۔

ماں کی طبیعت واقعی کچھ دنوں سے خراب تھی، اور آج صبح تو وہ اٹھی بھی نہیں تھی اور گل مینہ خود ہی رات کی بچی ہوئی روٹی بغیر چائے کے نگل کر سکول گئی تھی، لیکن اس کی حالت اتنی خراب ہے کہ ہسپتال جانا پڑے، اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔

وہ رونے لگی۔ 'مجھے بھی میران شاہ لے جاؤ، میں ماں کے پاس جانا چاہتی ہوں۔'

'چپ کرو بے وقوف، پتہ ہے شاہکوٹ کتنا دور ہے؟ چلتے چلتے پاؤں شل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر وہاں گاڑی میں میران شاہ پہنچنے کے تین گھنٹے لگتے ہیں، وہ بھی اگر گاڑی مل جائے،

Scanned with CamScanner

تو۔اور دادا کہہ رہے تھے کہ اگر وہاں علاج ٹھیک نہ ہوا تو پھر ماں کو بنوں لے جائیں گے۔'

گل مینہ کو ماں کے بغیر گھر بالکل ویران لگتا تھا۔لیکن وہ ہر صبح وقت پر تیار ہو کر باقاعدگی سے سکول جاتی رہی۔ہر روز وہ اس امید پر گھر واپس آتی کہ ماں واپس آ گئی ہو گی۔اور آخر پانچویں دن جب وہ سکول کے بعد گھر پہنچی تو واقعی ماں واپس آ گئی تھی،لیکن اس حالت میں کہ چارپائی پر بے حس و حرکت لیٹی ہوئی،نقاہت میں روئی اور ٹھوڑی سفید رنگ کے کپڑے سے کس کر بندھی ہوئی۔گل مینہ بالکل نہیں روئی،بس ماں کے برف کی طرح سفید اور سرد چہرے پر نظریں گاڑے چارپائی کی پائنتی پر بیٹھی رہی۔عورتیں آتی تھیں،گل مینہ ساتھ چمٹاتی تھیں اور اپنے آنسوؤں سے تر چہروں سے اس کے خشک گالوں کو بھگو کر چلی جاتی تھیں۔

لیکن گل مینہ کو سب سے زیادہ پیار اپنے دادا سے ملا۔اس کی ایک سیدھی سیدھی وجہ تو یہ تھی کہ انھیں گل مینہ کے ساتھ سب سے زیادہ عرصہ رہنے کا موقع ملا۔اس کے دادا کی عمر نہ جانے کتنے برس تھی،لیکن سفید دودھیا داڑھی اور اس سے بھی زیادہ سفید بھوؤں کے باوجود کمر ان کے ہاتھ میں ہر وقت رہنے والی لاٹھی کی طرح سیدھی تھی،وہ کھیتوں میں جوانوں سے زیادہ کام کرتے تھے۔مرنے والے دن تک گل مینہ نے انھیں کبھی بے کار بیٹھے نہیں دیکھا۔ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔اور کچھ نہیں تو لوٹا لے کر صحن کے ایک طرف کیاری میں پودوں کو پانی دینے لگتے تھے۔ایک آدھ بار تو گل مینہ نے دیکھا کہ اوپر سے بارش ہو رہی ہے اور دادا لوٹا لیے کیاری میں پھولوں پر پانی انڈیل رہے ہیں۔گل مینہ نے پوچھا تو کہنے لگے،'بھئی بارش اپنا کام کر رہی ہے،مجھے اپنا کام کرنے دو۔وہ اپنا کام نہیں روکتی تو میں کیوں اپنا کام روکوں؟'

دادا کا چہرہ بالکل سرخ تھا،جیسے غصے سے تمتمایا ہوا ہو،اور وہ واقعی بہت جلد غصے میں آ

جاتے تھے اور ان کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ جاری ہو جاتی تھی۔بلکہ اگر زیادہ ناراض ہوں تو اپنے بال بچوں والے بڑے پوتے پر بھی ہاتھ چھوڑنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ سالن میں نمک مرچ کم زیادہ ہو جاتا تو تھالی گھما کر صحن میں پھینک دیتے تھے۔لیکن وہ دوسروں کے لیے نیام سے نکلی ہوئی تلوار سہی،گل مینہ کے لیے سر سے پاؤں تک ریشم کے گدیلے کی طرح نرم تھے۔وہ کتنے غیظ میں کیوں نہ ہوں،گل مینہ اپنے سامنے دیکھ کر ان کی تنی ہوئی بھویں اپنی جگہ پر آ جاتیں اور چہرے کی درشت لکیریں آپ ہی آپ گھل کر نرمی اور لطافت کے لیے جگہ خالی کر دیتی تھیں۔گل مینہ کے بھائیوں کو اگر دادا سے کوئی چیز منوانی ہوتی تو گل مینہ ہی کو سجا بجا کر ان کے سامنے بھیجتے تھے۔اور وہ مصنوعی غصے سے کہتے،'میں خوب سمجھتا ہوں تمھیں کس نے پڑھا کر بھیجا ہے،لیکن کیا کروں،تمھیں انکار نہیں کر سکتا۔ابھی تو مان لیتا ہوں لیکن دیکھنا بعد میں ان شیطانوں کے کان کیسے کھینچتا ہوں۔'

گل مینہ پانچویں جماعت پاس نہیں کر سکی۔ابھی امتحان ہونے میں تین مہینے باقی تھی کہ مس فرزانہ نے سکول چھوڑ دیا اور واپس پشاور چلی گئیں۔لڑکیاں ویسے ہی چند دنوں تک سکول جاتی رہیں،پھر ایک ایک کر کے انھوں نے آنا چھوڑ دیا۔گل مینہ نے سب سے آخر تک امید کی ڈوری تھامے رکھی۔مس پروین کے جانے کے دسویں روز وہ معمول کے مطابق سکول کی وردی پہن کر اور بستہ لے کر سکول پہنچی تو دروازے پر تالہ لگا ہوا تھا۔اس نے سکول کے احاطے کے گرد ایک چکر لگایا اور پھر مرے مرے قدموں سے واپس گھر روانہ ہو گئی۔

سہیلیوں نے بتایا کہ مس فرزانہ کو علاقے کے ملک عطا نے دھمکی دی تھی کہ سکول آنا چھوڑ دے ورنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔اس پر الزام تھا کہ وہ لڑکیوں کو خراب کر رہی ہے۔مس فرزانہ نے پشاور کے کالج سے پوری بارہ جماعتیں پاس کی تھیں۔اس کا باپ وہاں کسی محکمے میں افسر تھا اور ریٹائر ہونے کے بعد واپس شوال آ بسا تھا۔اسی نے دوڑ دھوپ کر کے علاقے میں پہلی مرتبہ لڑکیوں کے لیے سکول کھلوایا تھا۔بعد میں گل مینہ کو معلوم ہوا کہ ملک عطا نے مس فرزانہ کو کسی

Scanned with CamScanner

دن سکول جاتے ہوئے دیکھا اور اسی شام اس کے باپ سے رشتہ مانگا تھا۔ انکار پر اس نے سکول ہی بند کروا دیا۔

دادا خوب گرجے تھے۔ انھوں نے جا کر ملک عطا کو بھی سخت سست کہا لیکن اس نے نہ صرف صاف انکار کر دیا بلکہ اپنی صفائی میں خدا رسول کی قسمیں کھانے لگا۔ 'خدائی خوار کہتا ہے کہ مخالفوں کی سازش ہے، میں نے کچھ نہیں کیا' دادا نے ملک عطا کے ڈیرے سے واپس آنے کے بعد گل مینہ کو بتایا۔ 'ہم تو ملک سے نمٹ لے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تمھارا مس اب واپس نہیں آنے والا۔ ہم نے پتہ کروایا تھا، اس کا ادھر پشاور میں شادی ہونے والا ہے، اس کے سوا پورا علاقہ میں دوسرا کوئی لڑکی نہیں ہے جو سکول میں پڑھا سکتا ہو۔'

اس کے بعد دادا خود اسے اردو، معاشرتی علوم اور اسلامیات پڑھانے لگے۔ وہ خود سکول تو کبھی نہیں گئے تھے لیکن انھوں نے مولوی سے قاعدہ اور خود کوشش کر کے فارسی اور اردو پڑھنا لکھنا سیکھ لی تھی۔ ان کی اردو تو اچھی خاصی لیکن سائنس اور ریاضی میں وہ کمزور تھے۔ وہ سمجھنے کی کوشش کرتے اور پھر تنگ آ کر کتاب جھٹک دیتے۔ 'لفظ تو میں پورے پڑھ لیتا ہوں لیکن مجھے نہیں سمجھ آتا جب ان کو ملاؤ تو خدائی خوار کا کیا مطلب نکلتا ہے۔ گل مینہ بچہ تم خود ہی دماغ کھپاؤ، میرے تو بس کا روگ نہیں ہے یہ!' وہ ہر سال میران شاہ سے گل مینہ کے لیے سکول کے نئے نصاب کے علاوہ کہانیوں کی کتابیں اور رسالے بھی لاتے تھے۔

گل مینہ کی ماں کے مرنے کے بعد گھر میں کوئی عورت نہیں رہی تھی۔ جھٹ پٹ بڑے بھائی کی شادی کی گئی تا کہ کھانے پکانے کی مشکل دور کی جائے۔ بڑے بھائی کی بیوی حسن بی بی جب بیاہ کر آئی تو اس نے شروع شروع میں گل مینہ پر دھاک جمانے کی کوشش کی۔ ایک دن دادا گھر آئے تو گل مینہ کو آستینیں چڑھائے برتنوں کا ڈھیر دھوتے دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئے۔ چیخ کر بہو کو بلایا اور اس کے سارے خاندان کو وہ صلواتیں سنائیں کہ اس کی ٹھوڑی جھک کر گردن سے جا لگی۔ 'میں اس لیے تمھیں بیاہ کر لایا تھا کہ تم پڑی چارپائیاں توڑتی رہو اور اس بن ماں باپ کی بچی

سے نوکرانیوں کی طرح سارا کام کرواؤ؟ دونوں کان کھول کر سن لو، میں نے اگر آئندہ اسے تنکا بھی توڑتے دیکھا تو تمھاری اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔'

گل مینہ نے کہا بھی کہ 'دادا، میں اپنی مرضی سے دھو رہی تھی، مجھے کسی نے نہیں کہا۔' لیکن دادا پاؤں پٹختے ہوئے گھر سے باہر چلے گئے۔

گل مینہ بھی دادا کا پورا خیال رکھتی تھی۔ ان کے سر میں سرسوں کے تیل کی مالش کرنا، پاؤں دبانا اور انگلیوں سے نک نکالنا اسے بہت پسند تھا۔ دادا کو اس کے ہاتھ کی چائے بہت پسند تھی۔ جب گھر میں بہو آ گئی تب بھی دادا صرف گل مینہ کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیتے تھے۔ انھیں یہ بات بہت پسند تھی کہ گل مینہ ہمیشہ پرچ میں رکھ کر انھیں پیالی پیش کرتی تھی۔ 'بڑی ہو کر بہت سلیقہ مند بنے گی، جس گھر میں جائے گی، روشنی کر دے گی میری بچی۔'

اس نے کئی بار دادا سے کہا کہ وہ بھی اپنی داڑھی کو گاؤں کے دوسرے بوڑھوں کی طرح مہندی سے رنگوا لیں۔ لیکن دادا ہر بار ہنس کر انکار کر دیتے تھے۔ 'نہ بابا نہ، یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔ یہ جو بال ہیں گل مینہ بچہ، یہ میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ زندگی گزار کے اور بھرپور طریقے سے گزار کے سفید کیے ہیں۔ میرے زمانے میں چاندی کے سکے ہوا کرتے تھے۔ وہ چاندی تو اب نہیں رہی، بس سمجھو یہی چاندی میری عمر بھر کی کمائی ہے۔ اسے میں گنوا نہیں سکتا۔ اور میں نے دیکھے ہیں وہ لوگ جو داڑھیاں رنگواتے ہیں۔ پہلے تو مہندی کا گہرا تیز رنگ ہوتا ہے، ہفتے دو ہفتے بعد کہیں تیز کہیں ہلکا رہ جاتا ہے، پھر نیچے سے سفید بال نکلنا شروع ہو جاتے ہیں اور ایک عجیب سی کھچڑی پک جاتی ہے۔ نا بابا نا، اب میں اس عمر میں ست رنگا طوطا بننے سے رہا۔'

گل مینہ کو یاد نہیں تھا کہ دادا کبھی بیمار پڑے ہوں۔ کبھی گل مینہ کو کھانسی، بخار یا سر درد ہو جاتا اور گل مینہ ان سے گولی لانے کو کہتی تو وہ اس کا سر دباتے ہوئے کہتے، 'بھئی، مجھے تو تمھاری نسل کے نوجوانوں کی آج تک سمجھ نہیں آئی۔ بوریاں بھر بھر گولیاں کھا گئے لیکن صحت ہے کہ وہی سرکنڈے کا تنکا۔ مجھے تو آج تک یہ معلوم نہیں کہ یہ جو گولی تم کھاتی ہو اس کا ذائقہ میٹھا ہے، کھٹا

Scanned with CamScanner

ہے، کڑوا ہے، کیا ہے۔ خدا جانے انگریز نے اس میں چونا بھرا ہے، آٹا بھرا ہے۔ ہمیں تو کبھی زکام ہوا تو اللہ بخشے تمھاری دادی نے جوشاندہ قہوے میں ڈال کر دے دیا۔ یا کچھ زیادہ مسئلہ ہوا تو دار چینی دے دی یا ایسی ہی کوئی چیز۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ تم لوگ تو بوریوں کے حساب سے گولیاں کھاتے ہو۔'

لیکن اس وعظ کے بعد وہ ستون پر کیل سے ٹکا ہوا کلہ سر پر جماتے اور گولی لینے لاٹھی اٹھا کر قریبی گاؤں کی دکان کے لیے روانہ ہو جاتے اور خود پانی کا گلاس تھما کر گل مینہ کو گولی کھلاتے۔

دادا ہی نے اس کا رشتہ زرجانان سے طے کیا تھا۔ وہ دادا کے علاقے کا تھا اور ان کے کسی پرانے دوست کا نواسا تھا۔ دادا پچاس سال پہلے اس علاقے سے آئے تھے اور اس کے بعد کبھی پلٹ کر نہیں گئے تھے۔ وہ گل مینہ کو اکثر اس علاقے اور اس دور کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ خاص طور پر جب وہ بیمار ہو کر بستر سے لگ گئے پرانی یادیں ان پر یوں اتر تیں کہ گل مینہ کو لگتا کہ ان کا حال سے ناطہ ٹوٹتا اور ماضی سے روز بروز پکا ہوتا جا رہا ہے۔

دادا کا ایک سفید رنگ کا کتا تھا جو ان کی طرح بوڑھا ہو چلا تھا اور بیشتر وقت دروازے کے باہر نڈھال پڑا رہتا تھا۔ لیکن دادا جب اسے لالو کہہ کر پکارتے تو وہ فوراً چوکس ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا اور دم ہلانے لگتا۔ جب دادا کلہ سر رکھے، صاف کپڑے پہن کر دوسرے گاؤں کی مسجد میں جمعے کی نماز پڑھنے جاتے تو لالو سعادت مندی سے ان سے دس قدم پیچھے پیچھے سر جھکائے چلتا رہتا۔ نماز کے دوران وہ مسجد سے تھوڑا دور بیٹھا ان کا منتظر رہتا اور واپسی میں دوبارہ ان کے ساتھ آ کر دروازے پر رک جاتا۔

جب دادا کا جنازہ نکلا تو لالو اپنے پرانے معمول کے مطابق جنازے کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلتا رہا۔ کسی نے اسے پتھر مار کر بھگانے کی کوشش کی لیکن گل مینہ کے بڑے بھائی نے منع کر دیا۔ دادا کو دفنانے اور تلاوت کے بعد گل مینہ کے بھائی گھر واپس چلے آئے لیکن لالو ان کے

ساتھ نہیں لوٹا۔ گل مینہ کو شام کے وقت اچانک احساس ہوا کہ وہ دروازے پر نہیں ہے۔ کسی بچے نے کہا کہ اس نے لالو کو قبرستان کی طرف دیکھا تھا۔ گل مینہ سر پر چادر لے کر بھاگی بھاگی گئی تو دیکھا کہ وہ قبرستان سے باہر اگلے پنجوں پر سر ٹکائے بیٹھا ہوا ہے۔ ماں کی طرح دادا کی موت پر بھی گل مینہ کے آنسو بند ہو گئے تھے اور کوشش کے باوجود ایک قطرہ آنکھ سے نہیں نکلتا تھا۔ لیکن لالو کو دیکھ کر جیسے پرنالہ کھل گیا ہو۔ وہ زمین پر بیٹھی لالو کا سر اور گردن سہلاتی رہی اور اس کے آنسو ایک لڑی کی طرح لالو کی گردن کو بھگوتے رہے۔ لالو تو ایک مہینے کے اندر اندر مر گیا لیکن اس کے بعد بہت کم دن ایسے گزرے ہوں گے جب گل مینہ کی آنکھیں دادا کی یاد میں نم نہ ہوئی ہوں۔

Scanned with CamScanner

12

پاؤجان جب موسیٰ نیکہ زیارت کے قریب میدان میں بلائے جانے والے جرگے میں شامل ہونے کے لیے پہنچا تو ابتدائی کارروائی شروع ہو چکی تھی، لوگ ایک بڑے دائرے کی شکل میں زمین پر بیٹھے ہوئے تھے اور ملک جم خان وزیر بات کر رہا تھا۔

"میں کل رات ہی بنوں سے واپس آیا ہوں، جہاں تمام وزیرستان کے ملک انگریزوں کے ساتھ بات چیت کے لیے جمع ہوئے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کے بعد تمام علاقے میں جو افراتفری اور بے چینی پھیل گئی ہے اس سے نمٹنے کے طریقوں پر غور کیا جائے۔"

ملک جم خان وزیر نے سنہرے رنگ کی تلے کی مخروطی ٹوپی پر سیاہ رنگ کی بہت بڑی پگڑی باندھ رکھی تھی جس کا شملہ بار بار گر جاتا تھا اور اسے بار بار اسے درست کرنا پڑتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاہو کی لکڑی کا مضبوط عصا تھا جس کے سرے پر لوہے کا پترا چڑھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ سے مٹول کر شملہ بلند کیا اور اپنی بات جاری رکھی۔

آپ میں سے بعض لوگ شاید جانتے ہوں گے کہ انگریز نے وانہ، سرتنئی، میران شاہ، کھجوری کچھ اور دوسری جگہوں پر فوجیں جمع کرنا شروع کر دی ہیں اور وہ ایک بڑے حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں میں افغان فوجوں کی آمد کے بعد جو کھلبلی مچی اس کے دوران انگریز فوج کے سینکڑوں مقامی فوجی ہلاک ہوئے ہیں جن میں بارہ انگریز بھی شامل ہیں۔ انگریز نے کابل پر ہوائی جہازوں سے بمباری کر کے اور امیر سے شکست کے معاہدے پر دستخط کروا کر بدلہ لے لیا ہے، اور اب اس کی توجہ قبائل پر ہے۔ اس وقت انگریز بپھرا ہوا ہے۔ اس کی حالت اس مست بھینسے کی ہے جسے چیونٹی نے کاٹ لیا ہو اور وہ دیوانہ وار اچھل کود کر کے ہر چیز کو تہس نہس کرنے پر تل جائے۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح آپ سب بھی نہیں چاہتے کہ ہم انگریز کے ساتھ ایک اور

جنگ شروع کر دیں۔ اس لیے ہم نے تین دن کے مذاکرات کے بعد اس معاہدے پر دستخط کیے ہیں جو آپ کو پڑھ کر سنایا جائے گا۔"

یہ کہہ کر ملک نے جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا اور اسے اپنے بیٹے کو دے دیا۔ اس کا بیٹا پاؤجان کا ہم عمر تھا اور پشاور سے دس جماعتیں پڑھ کر آیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے ہاتھ سے کاغذ لے کر اونچی پڑھنا شروع کر دیا:

یہ بات بالکل بے بنیاد ہے کہ امیرِ افغانستان نے آپ کے لیے کوئی عام معافی نامہ حاصل کر لیا ہے۔ مزید برآں وزیرستان کے افغانستان سے الحاق کی خبر میں بھی کوئی صداقت نہیں ہے۔

حکومتِ برطانیہ جہاں مناسب سمجھے گی، وہاں سڑکیں، چوکیاں اور چھاؤنیاں تعمیر کرے گی۔

ایجنسی کے باسی تمام قبائلی سڑکیں بنانے کے کام میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کریں گے۔ ان کی تعمیر کے لیے حکومتِ برطانیہ کہیں سے بھی مزدور منگوا سکتی ہے۔ اگر قبائلی مزدوروں کی خدمات حاصل کی گئیں تو انھیں رائج معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ اسی طرح ٹھیکے بھی رائج نرخوں کے مطابق عطا کیے جائیں گے۔

ایجنسی کے باسی سرکاری دستوں اور کاروانوں کی نقل و حرکت میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ نہ ہی ڈیورنڈ لائن کے مشرق میں اڑنے والے حکومتی جہازوں پر فائر کرنے کی کوشش کریں گے۔

وزیر چالیس ہزار روپے، جب کہ محسود اور داوڑ دس دس ہزار روپے جرمانہ ادا کریں گے۔

وہ سپاہی اور سوار جو غدر کے دوران بھگوڑے ہو گئے تھے، اگر وہ اپنی سرکاری رائفلیں لوٹا دیں تو انھیں مجرم نہیں گردانا جائے گا، نہ ہی ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی ہو گی، البتہ ان

Scanned with CamScanner

کی واجب الادا تنخواہیں اور دوسرے واجبات بحقِ سرکار ضبط کر لیے جائیں گے۔ مزید برآں انھیں آئندہ کسی قسم کی سرکاری ملازمت کے لیے نااہل سمجھا جائے گا۔

قبائلی وہ تمام رائفلیں، بم، کارتوس اور دیگر فوجی ساز و سامان حکومت کے حوالے کریں گے جو انھوں نے مئی 1919 کے واقعات کے بعد حاصل کیا تھا۔

اگر آپ ان میں سے کسی بھی شرط سے روگردانی کریں گے تو آپ کے علاقوں پر وسیع پیمانے پر فضائی بمباری ہوگی، جس کے بعد زمینی فوجی حملہ کر کے سرکش قبائل کے خلاف کارروائی کی جائے گی جس میں دیہات کی مسماری، فصلوں کی تباہی اور دیگر اقدامات شامل ہیں۔

معاہدہ پڑھے جانے کے درمیان بھی لوگوں نے بولنا شروع کر دیا تھا لیکن آخری شقوں تک آتے آتے شور اس قدر بلند ہو گیا کہ پاؤ جان کو انھیں سننے میں دشواری ہوئی۔ ملک جم خان کا بیٹا شور کی وجہ سے بار بار رک جاتا اور اپنے باپ کی طرف دیکھتا لیکن وہ ہر بار اسے پڑھنے کا اشارہ کرتا۔ جب بیٹا معاہدہ سنا چکا تو ملک اپنے عصا کے سہارے اٹھ کھڑا ہوا اور صبر سے جرگے کے اکثر شرکا کو ایک ساتھ بولنے کی کوشش کرتے ہوئے سنتا رہا۔ خاصی دیر کے بعد جب لوگوں کو احساس ہوا کہ کوئی ان کی بات نہیں سن رہا اور نہ وہ کسی کی بات سن رہے ہیں تو ملک نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش ہونے کی تلقین کی۔

'ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ جرگے کی روایات کے مطابق آپ سب کو باری باری بولنے کا موقع دیا جائے گا۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جنگ کے دوران وزیرستان ملیشیا کی کل گیارہ سو نفری جھگوڑا ہو گئی تھی، جن میں ہمارے گاؤں کے کئی جوان بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انگریز کہتے ہیں کہ دانہ اور دوسری چوکیوں سے چھبیس سو رائفلیں، پچاس توڑے دار بندوقیں، چھ لاکھ کے لگ بھگ کارتوس اور دوسرا سامان چوری ہوا ہے۔ ہم قبائلی ملکوں نے مل کر ہرجانہ بھرنے کا حساب لگایا تھا، اس کے مطابق تمام وزیر قوم پر عائد چالیس ہزار جرمانے میں ہمارا حصہ ساڑھے تین سو روپے بنتا ہے۔ موسیٰ نیکہ گاؤں اور اس کے آس پاس ہمارے کل 184

گھر ہیں، اس لیے فی گھر یہ رقم ایک روپیہ اور چودہ آنے بنتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں پچیس رائفلیں بھی سرکاری خزانے میں جمع کروانی ہوں گی، اور وہ بھی اچھی حالت میں۔ انگریز نے شرط رکھی ہے کہ صرف ایسی رائفلیں جمع کروائی جائیں جن کی بازار میں قیمت کم از کم ڈیڑھ سو روپے ہو۔ اس سے کم درجے کی رائفل وہ قبول نہیں کریں گے۔ اس لیے وہ سب لوگ جن کے پاس انگریز سے لوٹی ہوئی رائفلیں موجود ہیں، وہ انھیں میرے گھر پہنچا دیں، تاکہ ہمارے اوپر معاہدے سے منہ پھیرنے کا الزام نہ لگے۔ اب میری بات ختم ہوئی، آپ کو جو کہنا ہے، کہہ لیجیے۔'

یہ کہہ کر ملک جم خان چارپائی پر بیٹھ گیا۔

ایک بار پھر ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پاؤ جان نے بھی کھڑے ہو کر بولنے کی کوشش کی لیکن پھر بے سود سمجھ کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ آخر پانچ سات منٹ کے غل غپاڑے کے بعد گاؤں کے سب سے معمر آدمی غیند اخان کو بولنے کا موقع دیا گیا۔ اس کی آواز لرزتی ہوئی اور بے حد کرخت تھی۔

'ملک نے اس معاہدے پر دستخط کر کے اچھا نہیں کیا۔ وہ سارے گاؤں کا ملک ہے، اور اس لحاظ سے سب کی نمائندگی اس کا فرض ہے۔ لیکن میں اس سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہمارے نمائندے کے طور پر کیا اس نے انگریز سے یہ سوال کیا تھا کہ آخر وہ ہماری مٹی پر کر کیا رہا ہے؟ اس نے ہماری زمین پر جگہ جگہ یہ جو چوکیاں، قلعے اور چھاؤنیاں قائم کر رکھی ہیں ان کا جواز، مقصد اور مطلب کیا ہے؟ میں اس اجلاس میں تو موجود نہیں تھا اور نہ میں کوئی نجومی ہوں، لیکن میں آپ کو یہیں کھڑے کھڑے بتا سکتا ہوں کہ ملک نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہوگی۔ اس کے بدلے جو معاہدہ وہ لے کر آیا ہے اس سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ اس تمام علاقے کو انگریزوں کی چھاؤنیوں سے اور چوکیوں سے بھرنا چاہتا ہے۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ بہت جلد وہ دن آجائے گا کہ ہمیں اپنے کھیتوں میں پیشاب کرنے کے لیے جانے سے پہلے بھی انگریز سے اجازت نامہ لینا ہو گا۔ ملک اپنے معاہدے میں یہی کچھ لکھوا کر لایا ہے۔'

Scanned with CamScanner

13

'او تیرا بیڑا غرق، خانہ خراب، کام چور ٹھیکیدار نے پیسے پورے لے لیے اور سڑک کی یہ حالت ہے کہ اس پر گاڑی تو کیا، گدھا بھی نہیں چل سکتا۔' دادا کا سر تیسری بار جیپ کی چھت سے ٹکرایا تھا۔ وہ تو خیر گزری کہ ان کے سر پر تلے والا مضبوط کلہ تھا، ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔

سبز رنگ کی جیپ گاؤں سے نکل کر پہاڑ پر چڑھ رہی تھی۔ پہلے دو موڑ تو پھر بھی غنیمت تھے لیکن تیسرا اتنا بے ڈھنگا اور تنگ تھا کہ اس پر جیب کو ایک بار آدھے موڑ تک جا کر واپس ہونا پڑتا تھا، کلینر پچھلے پہیوں کے نیچے پتھر رکھتا جاتا تھا، پھر کہیں جا کر جیپ مڑ پاتی تھی۔ اس کے بعد بھی سڑک جگہ جگہ سے کٹی پھٹی تھی۔ کئی جگہوں پر ایسا لگتا تھا کہ یہاں سے تو کسی گاڑی کا گزرنا ناممکن ہے، لیکن ڈرائیور کسی نہ کسی طرح وہاں سے بھی جیپ گزار لیتا تھا۔

'کاکا، سڑک میں سب سے اصل چیز اس کے ساتھ ساتھ چلنے والی نالی ہوتی ہے۔' ڈرائیور نے کہا۔ 'ان الو کے چرخوں نے سڑک تو بنا دی لیکن نالی نہیں بنائی، اب پانی جائے تو کہاں جائے؟ ظاہر ہے سڑک ہی پر چلے گا اور اسے آری کی طرح کاٹتا رہے گا۔'

دادا اور گل مینہ جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھے گاؤں سے بازار کی طرف جا رہے تھے۔ گڑھوں اور پتھروں میں فٹبال کی طرح اچھلتی ہوئی جیپ میں گل مینہ نے سہارے کے لیے ڈنڈا مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ عید قریب تھی اور دادا اسے میران شاہ کے بازار لے جا رہے تھے تاکہ اس کے لیے کپڑے اور جوتے خرید سکیں۔ نئی سڑک صرف چھ مہینے پہلے بنی تھی۔ اس کی تعمیر کے دوران ٹھیکیدار کے آدمیوں کے علاوہ خود گاؤں کے لوگوں نے بھی جوش و خروش سے حصہ لیا تھا۔ اس دوران دو ڈوم روزانہ اپنے ڈھول گلے میں لٹکائے آ جاتے تھے اور لوگ ڈھولک کی تھاپ پر کدالیں اور بیلچے چلاتے تھے۔ لیکن چند ہفتوں کے اندر اندر بارشوں کی وجہ سے اس کا وہ حشر ہو

چکا تھا کہ کئی جگہوں پر لگتا تھا جیسے یہاں کبھی سڑک تھی ہی نہیں۔

دادا ڈرائیور کی طرف مڑے۔ 'لڑکے تم کہاں کے ہو؟ اس علاقے کے تو نہیں لگتے؟'

ڈرائیور گاڑی کو سڑک پر پڑے ہوئے پتھر سے بچانے کی کوشش میں تیزی سے سٹیئرنگ کاٹتے ہوئے بولا، 'ادھر ہی کا ہوں کاکا، اور کہاں کا ہونا ہے؟'

'ادھر کے خیر بالکل نہیں ہو۔ مجھے تو جنوب میں برل تحصیل کی طرف کے لگتے ہو، باقی نہ بتانا چاہو تو تمھاری اپنی مرضی ہے، کوئی زبردستی تو ہے نہیں۔'

ڈرائیور نے سڑک سے نظریں ہٹا کر ایک لمحے کے لیے دادا کی طرف دیکھا اور دوبارہ سڑک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ 'جی کاکا، برل ہی کا ہوں، لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا، میں نے تو کسی کو نہیں بتایا؟'

گل مینہ کو پچھلی گھاٹی کے تنگ موڑوں سے گزرتے ہوئے چکر آنے لگا تھا اور دل میلا ہو رہا تھا، لیکن اب درے میں سے گزرنے کے بعد موڑ کم ہو گئے تھے۔ کھلی جیپ سے اندر آتے ہوئے ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے اس کی طبیعت بحال ہو گئی۔ دادا اور ڈرائیور کے درمیان بات چیت سن کر اس نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر مشکل سے بائیس چوبیس برس ہو گی لیکن بول چال اور حرکات و سکنات سے کہیں زیادہ بڑا لگتا تھا۔ ہوا میں خنکی کے باوجود اس نے ہلکی سی قمیص پہن رکھی تھی، جس کے اوپر سیاہ رنگ کی واسکٹ تھی جس پر تلے کا کام ہوا تھا۔ سر پر سیاہ رنگ کا پکول تھا جس میں سے اس کے گھنگھریالے بال باہر نکل آنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔

اس کا نام زرجانان خان تھا۔ جب دادا کو پتہ چلا کہ وہ نہ صرف ان کے آبائی گاؤں موئی نیکہ کا رہنے والا ہے بلکہ ان کے بچپن کے دوست مرحوم نیاز بین کا نواسا ہے تو ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ جیب رکوا کر اسے گلے سے لگا لیں۔ گل مینہ نے دادا کے منہ سے کئی بار حوالدار نیاز بین کا ذکر سن رکھا تھا۔

'ارے ارے، مجھے پہلے ہی پتہ چل جانا چاہیے تھا۔ ایسی ہی بھوری، چھدری داڑھی،

Scanned with CamScanner

ویسی ہی ہنسی۔ بس اتنا ہے کہ تم ذرا لمبے ہو اور وہ قد میں چھوٹا تھا۔ تم نہیں جانتے کہ نیاز بین میرا کتنا گہرا یار تھا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم کن کن معرکوں میں ساتھ نہیں رہے۔ کتنی بار میں نے اس کی زندگی بچائی اور کتنی بار اس نے مجھے بچانے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ دی۔ آہ موسیٰ نیکہ، میرے بچپن، میری جوانی کا رازدار۔ مجھے وہاں سے آئے ہوئے آدھی صدی ہوگئی ہے۔'

'دادا، اب اسے موسیٰ نیکہ نہیں کہتے، اس کا نام انگور اڈا ہو گیا ہے۔'

'ہاں، میں نے کسی اور سے بھی سن رکھا ہے یہ انگور اڈا دنگور اڈا۔ موسیٰ نیکہ تو اس لیے کہتے تھے کہ وہاں تمام وزیروں اور محسودوں کے پڑدادا موسیٰ کی قبر ہے، لیکن انگور کہاں سے آ گئے؟ میں نے تو اس علاقے میں کبھی کوئی انگور نہیں دیکھا۔ کیا اب میرے آنے کے بعد وہاں کابل قندھار کی طرح انگور اگتے ہیں؟'

زرجانان ہنس پڑا۔ 'نہیں دادا، وہ والے انگور نہیں۔ یہ اصل میں ایک آدمی تھا، اس کا نام انگور تھا۔ اس کا چائے کا کھوکھا تھا۔ وہیں پہ اڈا بن گیا جو انگور اڈا کہلانے لگا، اور کرتے کرتے پورے قصبے کا نام انگور اڈا ہو گیا۔'

'واہ بھئی واہ۔ میں وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کون خدائی خوار تمام وزیرستانیوں کے جد کا نام بدل کر کسی چائے فروش کے نام پر گاؤں کا نام رکھتا ہے۔'

'تو دادا کسی دن چلیں میرے ساتھ، کیا پتہ آپ کے کوئی جاننے والے اب بھی زندہ ہوں۔'

'اب تو میرے بس ایک ہی جگہ جانے کے دن رہ گئے ہیں، اس کے علاوہ اب کہیں اور جانے کو دل نہیں کرتا۔'

اس کے بعد زرجانان جب بھی جیپ لے کر ان کے گاؤں آتا، دادا اس کی خاطر تواضع کیے بغیر نہیں جانے دیتے تھے۔ گھر کی بیٹھک میں وہ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھا رہتا اور دادا اس سے نیاز بین، انگریزوں کے خلاف لڑائیوں، خود قبائل کے درمیان برسوں چلنے والی دشمنیوں،

وارداتوں اور گھاتوں کی کہانیاں بیان کرتے رہتے تھے۔

گھر میں آتے جاتے اس کا کئی بار گل مینہ سے آمنا سامنا ہوا اور گل مینہ نے دیکھا کہ اس کے سامنے آتے ہی زرجانان کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں اور ایک دلکش مسکراہٹ اس کے سارے چہرے کو روشن کر دیتی ہے۔

ان کے درمیان پہلی بار بات چیت اس وقت ہوئی جب گل مینہ کو تیز بخار کے باعث میران شاہ کے ہسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ ڈاکٹر نے ٹائیفائڈ تشخیص کیا اور مشورہ دیا کہ بخار اترنے تک اسے نگہداشت کے لیے سرکاری ہسپتال میں رکھا جائے۔ وہ کسی اور گاڑی میں آئے تھے لیکن جب میران شاہ کے بازار میں زرجانان کو دادا سے پتہ چلا تو وہ پھلوں کے لفافوں سے لدا پھندا ہسپتال پہنچ گیا۔ اگلے دن اس نے جیپ نہیں چلائی اور ہسپتال میں دادا کے ساتھ گل مینہ کے مختلف ٹیسٹ کروانے میں مدد کرتا رہا۔

گل مینہ ہسپتال کے سرخ کمبل میں لپٹی ہوئی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا، اور نرس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ دادا اور زرجانان سامنے بینچ پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ درد کی شدت سے گل مینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، جنھیں دیکھ کر دادا تڑپ اٹھے۔ دادا گل مینہ کی پائنتی بیٹھ گئے اور اپنے خشک لکڑی جیسے کھردرے ہاتھوں سے اس کا سر دبانے لگے۔ زرجانان پاؤں پٹختا ہوا وارڈ سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ڈاکٹر کے ہمراہ واپس آیا۔

'کیا تماشا لگا رکھا ہے آپ لوگوں نے؟ کوئی تڑپ رہا ہو، مر رہا ہو، آپ کو پروا ہی نہیں ہے۔ اس وارڈ میں بیس مریض ہیں، ہسپتال کے کسی ایک آدمی کا کوئی اتہ پتہ نہیں ان کی خبر لینے کے لیے۔' زرجانان کی بلند آواز پورے ہسپتال میں گونج رہی تھی۔ دو کمپاؤنڈر اور عملے کے دوسرے لوگ دوڑے دوڑے آئے۔

ڈاکٹر نے زرجانان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پرسکون کرنے کی کوشش کی لیکن زرجانان نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ڈاکٹر نے فوراً گل مینہ کو ایک ٹیکہ لگایا اور کمپاؤنڈر کو وہیں

Scanned with CamScanner

ٹھہرنے کا حکم دے کر چلا گیا۔

اصولی طور پر تو گل مینہ کے ساتھ اس کی بھابھی کو ہسپتال آنا چاہیے تھا لیکن وہ خود آٹھویں مہینے سے تھی۔ دونوں بھائی دادا کے حساب سے لفنگے اور ناقابلِ اعتبار تھے۔ وارڈ میں ہر بستر پر مریض اور بنچوں پر ان کے رشتے دار موجود تھے، لیکن دادا اس عمر میں سخت بینچ پر رات کیسے گزاریں؟ اس مشکل کا حل زرجانان نے نکالا اور وہ کسی ہوٹل سے لحاف اور تلائی لے کر آ گیا اور بینچ ایک طرف کر کے انھیں فرش پر بچھا دیا۔ دادا نہ نہ کرتے رہے لیکن اس نے ہاتھ سے پکڑ کر انھیں نیچے لٹا دیا اور خود بینچ پر بیٹھ گیا۔

رات کسی وقت گل مینہ کی آنکھ کھلی۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا اور حلق پیاس کی شدت سے کانٹا ہو رہا تھا، جیسے گرمیوں کے لمبے روزوں میں افطاری سے تھوڑی دیر پہلے ہوتا ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وارڈ پر خاموشی طاری تھی، صرف کسی کسی بستر سے کسی مریض یا اس کے کسی رشتے دار کے خراٹے نشر ہو رہے تھے۔ چھت پر ایک بلب کی دھندلی روشنی ہال کی تاریکی کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ 'پانی!' اس کے خشک ہونٹوں سے بڑی مشکل سے آواز نکلی۔ اس کے بستر کی پائنتی کی طرف پڑے بینچ میں حرکت ہوئی۔ وہاں زرجانان چادر اوڑھے یوں سکڑا ہوا لیٹا ہوا تھا کہ گھٹنے اس کے سینے سے ٹکرا رہے تھے۔

گل مینہ کی آواز سن کر وہ اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسے خاصی دیر سے اسی انتظار میں تھا۔ اس نے فوراً جا کر کھڑکی کی چوکھٹ میں رکھے سٹیل کے جگ سے سٹیل ہی کے گلاس میں پانی انڈیلا اور لا کر گل مینہ کے سامنے پکڑ لیا۔

گل مینہ کہنیوں کے سہارے تھوڑا سا اوپر ہوئی اور زرجانان سے گلاس لینے کی کوشش کی لیکن اس نے گلاس پکڑے رکھا اور گل مینہ کے منہ سے لگا دیا۔ گل مینہ نے غٹ غٹ گلاس ختم کر دیا۔ 'اور دوں؟' گل مینہ نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ زرجانان بستر کے گرد گھوم کر گیا اور دوسرا گلاس بھر لایا۔ اب کے گل مینہ نے اس کے ہاتھ سے گلاس کھینچ لیا۔

'اب کیسی طبیعت ہے؟' زرجانان نے پوچھا۔

گل مینہ نے پہلی بار براہِ راست اس کی طرف دیکھا۔ 'بہت بہتر ہے۔'

'سر میں درد تو نہیں؟'

'بالکل بھی نہیں۔ بخار بھی نہیں ہے۔'

'بہت اچھے۔ اب سو جاؤ، کوئی مسئلہ ہو تو آواز دے دینا، میں یہیں ہوں۔'

یہ سارا واقعہ صرف ایک منٹ میں گزر گیا۔ لیکن بعد میں آنے والے مہینوں میں گل مینہ اپنے ذہن کے کیسٹ پلیئر پر بار بار یہ حصہ سنتی، ری وائنڈ کرتی اور دوبارہ سنتی رہی۔

جب گل مینہ کو تین راتیں ہسپتال میں گزارنے کے بعد فارغ کر دیا گیا تو زرجانان باہر جیپ میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ راستے میں کئی جگہ سواریاں کھڑی تھیں لیکن زرجانان نے کسی کو نہیں بٹھایا اور کھڈوں پر سے بڑی آہستگی سے گاڑی چلاتا ہوا گاؤں پہنچ گیا۔ جب دادا نے جیپ سے نیچے اترنے کے بعد اس کی جیب میں پیسے ڈالنے چاہے تو وہ ہنستا ہوا پیچھے ہٹ گیا اور جیپ کو ریورس کر کے نکال لے گیا۔

گھر کی طرف چلتے ہوئے دادا گل مینہ کی طرف مڑے اور بولے، 'گل مینہ بچہ، کیسا لگتا ہے یہ لڑکا تمھیں؟' گل مینہ جو عام حالات میں دادا کے سامنے پٹر پٹر بولا کرتی تھی، اس اچانک سوال پر یوں گڑبڑا گئی جیسے چلتے چلتے ٹھوکر لگی ہو اور اس کے منہ سے کوئی جواب نہ نکل سکا۔

'اچھا ہے نا؟' دادا اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر گل مینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے پتھریلی سیڑھیوں پر چڑھنے میں مدد دیتے ہوئے بولے۔ 'میں نے دیکھا ہے بیٹا جن نظروں سے تم اس کی طرف دیکھتی ہو اور جن نظروں سے وہ تمھاری طرف دیکھتا ہے۔'

Scanned with CamScanner

گل مینہ کا سارا بدن کانپنے لگا اور دل ایسے دھڑکنے لگا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ اس نے تو بڑی کوشش کی تھی کہ زرجانان کی طرف نہ دیکھے اور اگر دیکھے بھی تو نظریں اتنی تیزی سے دوسری طرف پھیر لے کہ کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ لیکن دادا نے میرا دل کیسے پڑھ لیا؟

'بھئی مجھے تو خود لڑکا بہت پسند ہے،' دادا نے اپنی بات جاری رکھی۔ 'سعادت مند ہے، ہوشیار سمجھ دار ہے، دیکھنے میں اچھا ہے۔ میں نے بازار میں پتہ کروایا تھا، کسی غلط کام دھندے میں بھی ملوث نہیں ہے۔'

گل مینہ خاموشی سے دادا کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلتی رہی۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر دادا رکے اور دستک دینے سے پہلے بولے، 'مجھے تمھاری بڑی فکر ہے گل مینہ بچہ۔ تمھارے نکمے بھائیوں سے مجھے کوئی امید نہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میرے بعد تمھارا کیا بنے گا۔ اگر یہ کام ہو جائے تو میں سکون سے مر سکوں گا۔'

گل مینہ اس کے کئی دن بعد تک دادا کے سامنے آنے سے کتراتی رہی۔ لیکن وہ کہاں باز آنے والے تھے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے یا کھانا کھاتے وقت اشاروں کنایوں میں پانی پلانے یا جیپ کے بارے میں یا ایسی ہی کوئی اور بات کہہ جاتے جو کسی دوسرے کی سمجھ میں نہ آتی لیکن گل مینہ کو صاف پتہ چل جاتا کہ ان کا اشارہ کس طرف ہے۔

چند دنوں کے بعد دادا نے گل مینہ کو حجرے میں بلایا۔ ان کا چہرہ مسکراہٹ کی تمازت سے اس طرح تمتما رہا تھا کہ ساری جھریاں گھل کر غائب ہو گئی تھیں۔ 'گل مینہ بچہ، میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے زرجانان سے بات کی ہے اس مسئلے کے بارے میں۔'

گل مینہ نے سر جھکا لیا اور کرسی کی پشت تھام کر کھڑی رہی۔ 'بس وہ اچھل کر جیپ سے باہر گرا نہیں، باقی کوئی کسر اس نے چھوڑی نہیں،' مسکراہٹ دادا کے چہرے سے پھوٹی پڑتی تھی۔ 'وہ تنخواہ ملتے ہی انگوراڈا چلا جائے گا اور اپنے باپ کو لے کر آئے گا۔' گل مینہ خاموش کھڑی دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹتی اور کھولتی رہی۔ 'بس یہ کام ہو جائے تو میں اس کے اگلے ہی دن

بہت چین سکون سے مرنے کے لیے تیار ہوں۔'

لیکن شاید دادا کا حساب کتاب تھوڑا غلط ہو گیا۔ دو ہفتے کے اندر اندر وہ بیمار ہو کر ایسے پڑ رہے کہ تین دن بعد پھر انھیں چار کندھوں ہی پر اٹھایا گیا۔ اگلے مہینے جب زرجانان اور اس کا باپ رشتہ مانگنے کے لیے پہنچے، تب تک دادا کی قبر کی مٹی بھی سوکھ چکی تھی۔

Scanned with CamScanner

14

غیرت خان کی دھواں دھار گفتگو ملک جم خان کو پسند نہیں آئی اور اس کے درمیان ہی میں اٹھ کھڑا ہوا: 'میں معزز مشر کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس معاہدے میں ایک طرف انگریز اور دوسری طرف اکیلا میں شامل نہیں تھا، بلکہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، وزیرستان کی تمام قوموں کے تمام بزرگ، مشر اور ملک اس کے فریق تھے، یہ کسی کا انفرادی اور ذاتی عمل نہیں بلکہ ہم سب کا مشترکہ اور اجتماعی فیصلہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے خود اس کی بعض شقوں سے اختلاف ہو، اور یقیناً ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ انگریز اس وقت بالکل پاگل ہو رہا ہے، وہ تمام علاقے پر فوج کشی اور بمباری کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے بڑی مشکل سے اسے وقتی طور پر ایسا کرنے سے روکا ہے۔ اگر ہم اس کی شرائط پوری کرلیں تو وہ فوری حملہ کرنے سے رک جائے گا۔ ہم بعد میں آرام سے سر جوڑ کر سوچ سکتے ہیں کہ اگلا قدم کیا اٹھایا جائے۔ اس وقت تو جو صورت حال ہے وہ میں نے آپ کو بتادی ہے کہ ہمیں ایک بڑے اور بہت طاقتور دشمن سے فوری جنگ کا سامنا ہے اور یہ معاہدہ اس جنگ کو ٹالنے کی واحد صورت ہے۔ اگر آپ لوگ معاہدے پر عمل نہیں کرنا چاہتے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن پھر ایک ہفتے کے اندر اندر انگریزی توپوں کے آگ اگلے دہانوں اور بم برساتے جہازوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوجائیں۔'

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر دوسرے کئی لوگوں نے بولنا شروع کیا۔ اکثر لوگ معاہدے کے حق میں نہیں تھے لیکن بہت سے انگریز سے دوبدو جنگ بھی نہیں چاہتے تھے۔ قدر زمان سائیس بھی وہاں موجود تھا اور ملک کی تقریر کے دوران زمین پر تنکے سے لکیریں کھینچے چلا جا رہا تھا۔ جب اس کو بولنے کا موقع ملا تو اس نے ایک بات دہرائی کہ افغانوں نے یہ خواہ مخواہ کی جنگ لڑ کر قبائلیوں کو مشکل میں ڈال دیا ہے، جو بغیر کسی تیاری کے انگریزوں سے جا بھڑے اور

اب اور یہ حالت ہے کہ نہ اگل سکتے ہیں نہ نگل سکتے ہیں۔ اس نے کہا کہ انگریز سے جنگ دانش مندی نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے 'انگریز کا پٹھو' کہہ کر اسے خاموش کرنے کی کوشش کی لیکن جرگے پر اس کی باتوں کا خاصا اثر ہوا تھا کیوں کہ وہ انگریزی فوج میں شامل رہا تھا اور اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھا تھا۔ جب پاؤجان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ معاہدے کے حق میں زمین ہموار ہونے لگی ہے تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بلند آواز میں بولنا شروع کردیا۔

'مجھے تو ملک صاحب کی کسی بات کی سمجھ نہیں آرہی۔ ایک طرف تو انگریز کے وزیرستان سے انخلا کے بعد یہ امیر افغانستان کی خصوصی دعوت پر کابل جاتے ہیں، شاہی دربار سے خلعتیں، اعزازات اور انعامات پاتے ہیں، سہرا اپنے سر باندھ لیتے ہیں کہ جو کام لام کے دوران جرمن اور ترک نہ کرسکا وہ ہم نے کر دکھایا، اور انگریز کو گیدڑ کی طرح بھاگنے پر مجبور کردیا۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امیر نے ہر بھگوڑا ہونے والے سوار کے لیے تین سو اور جوان کے لیے ایک ایک سو پکے افغانی انعام دیا تھا، لیکن آج تک کسی بھگوڑے کو ایک ٹکا بھی نہیں پہنچا۔ یہ میرا ساتھی احمد ولی جو یہاں بیٹھا ہے، اور شالے جو اس وقت گاؤں میں نہیں ہے، یہ دونوں انگریز فوج کے بھگوڑے ہیں، یہ تنگ آکر خود کابل گئے تاکہ امیر سے اپنا حق وصول کرسکیں لیکن وہاں انھیں کسی نے دربار کے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا۔ اب یہ مجبور ہوکر دوبارہ انگریز فوج میں بھرتی ہونے کا سوچ رہے تھے لیکن ابھی اس معاہدے سے پتہ چل گیا کہ اب انگریز بھی انھیں قبول نہیں کریں گے۔

'ملک جم خان اگر انگریز کو تاوان دینا چاہتا ہے تو بڑے شوق سے دے، لیکن میرا سوال یہ ہے کہ ہم سے ایک روپیہ چودہ آنے مانگنے کی بجائے وہ امیر سے بٹورے ہوئے ہزاروں روپے انگریز کے حوالے کیوں نہیں کردیتا؟'

پاؤجان کو ملک جم خان کے بیٹے اور چند سرکردہ حواریوں کی آنکھوں میں شعلے لپکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے، اگر ان کا بس چلتا وہ پاؤجان کو کچا چبا جاتے لیکن جرگے کی موجودگی میں وہ کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ ملک تھوڑی دیر بیٹھا رہا، پھر لاٹھی کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے

Scanned with CamScanner

ہاتھ لاٹھی پر کانپ رہے تھے۔

'معلوم نہیں اس لونڈے کو کس نے پٹی پڑھادی ہے کہ میں نے امیر سے بھگوڑوں کی رقم وصول کی ہے۔ البتہ میں نے یہ ضرور سنا ہے کہ ٹوچی کے کچھ ملکوں کو کچھ رقمیں ملی تھیں لیکن میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اگر مجھے امیر کے دربار سے کسی بھگوڑے کے لیے ایک آنہ بھی ملا ہو تو وہ مجھ پر اور میرے خاندان پر حرام ہے۔ ہاں مجھے ایک خلعت ضرور عطا ہوئی تھی اگر وہ پاؤجان کو چاہیے تو میں ابھی اسے گھر سے منگوا لیتا ہوں، بے شک وہ اسے اوڑھ لے۔ لیکن اس کے باوجود اگر جرگہ کہتا ہے تو میں آپ کے حصے کے چودہ آنے اپنی جیب سے دینے کے لیے تیار ہوں، آپ لوگ صرف ایک ایک روپیہ دیں۔ رائفلوں کا معاملہ الگ ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ہمیں پچیس رائفلیں جمع کروانی ہیں۔ پاؤجان، یہ جو تمھارے کندھے سے تھری ناٹ تھری لٹک رہی ہے، یہ مجھے اپنی کمزور نظر کے باوجود اتنے فاصلے سے بھی بڑی عمدہ حالت میں لگ رہی ہے، مہربانی کر کے جرگے کے بعد اسے یہیں چھوڑ جانا، اس کے بعد صرف چوبیس اور رائفلیں رہ جائیں گی۔'

پاؤجان کو اپنی کنپٹیوں سے آگ نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے دل میں آیا کہ کندھے سے وہی رائفل اتار کر ملک کے سینے پر خالی کر دے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ 'ملک جم خان، یہ رائفل میں نے رات کی تاریکی میں راستے پر پڑی ہوئی نہیں اٹھائی۔ سارا گاؤں بلکہ ساری وادی جانتی ہے کہ میں نے آج سے چار سال پہلے جان کی بازی لگا کر انگریز کی چوکی سے گورکھا سپاہی کے ہاتھوں سے دن دہاڑے چھینی تھی۔ میں اسے کسی صورت واپس نہیں کر سکتا۔'

'چوری رات کے اندھیرے میں کی جائے یا دوپہر کی دھوپ میں، ہوتی وہ چوری ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمیں پچیس رائفلیں ہر حالت میں چاہییں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کون وانہ تھے اور دوسری چوکیوں سے کیا لے کر آیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بعض لوگ یہ رائفلیں

افغانستان یا ہندوستان کے شہروں میں جا کر مہنگے داموں بیچ چکے ہیں۔ وہ بے شک باقی پیسے اپنے پاس رکھیں، صرف ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے میرے پاس جمع کروا دیں تو میں کوشش کروں گا کہ بازار سے اچھی رائفلیں خرید کر انگریز کے منہ پر ماردی جائیں۔ لیکن پاؤجان کی رائفل انگریز سے چوری شدہ ہے اور یہ واپس انگریز کے پاس جائے گی۔'

اس پر ایک اور ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جنگ کے دوران پاؤجان کے ہاتھ چند درجن کارتوسوں کے سوا کچھ نہیں لگا تھا لیکن کئی لوگ وانہ سے رائفلیں لے کر آئے تھے۔ اس کا ساتھی ابراہیم بھی ایک رائفل لایا تھا جو اس نے دو سو میں بیچ دی تھی۔ ان میں سے وہ پچاس روپے کی دلھن لے آیا تھا، باقی پیسے شادی کی دعوت اور دوسرے کاموں میں خرچ ہو گئے تھے۔ دوسرے لوگوں نے رائفلوں اور دوسرے سامان کی فروخت سے حاصل شدہ پیسوں سے قرض اتارے تھے، بزرگوں کا علاج کروایا تھا یا دوسرے ضروری کام نمٹائے تھے۔ کئی ایسے بھی تھے جن کے پاس اس سے پہلے کوئی رائفل کجا، توڑے دار جزیل تک نہیں تھی۔ اب اگر پاؤجان کی طرح وہ اپنی واحد متاع ملک کے حوالے کر دیتے تو ان کے پاس کیا باقی بچتا؟ دوسرے کئی لوگوں نے بھی با آواز بلند کہنا شروع کر دیا کہ وہ ایک ایک روپیہ تو دے دیں گے لیکن رائفلیں کسی صورت واپس نہیں کر سکتے۔ ملک جم خان اور اس کا بیٹا روکتے رہ گئے لیکن جرگہ اٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گیا۔ پاؤجان کو گھر جاتے ہوئے ملک جم خان کی نظریں اپنی پیٹھ پر برمے کی طرح سوراخ کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

Scanned with CamScanner

15

گل بینہ ایک چارپائی پر اپنے ناپ سے کھلا سرخ جوڑا پہنے بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر تلے والا سرخ دوپٹہ تھا جس نے اس کے چہرے کو مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ جوڑا زرجانان نے صبح ارغنداب کے کپڑے سے اٹے بازار کی ایک دکان سے بغیر ناپ کے خریدا تھا۔ چارپائی پر گل بینہ کے قریب سنگین خان کی بہن گل پانڑہ اور اس کی بیٹی خواڑہ بیٹھی تھیں۔ ایک اور چارپائی پر کچھ اور عورتیں تھیں جنھیں گل بینہ نہیں پہچانتی تھی۔

وہ گنگے کوٹ میں پانچ دن رہ کر قندھار کے نواحی قصبے ارغنداب آ گئے تھے، جہاں سنگین خان کے بہنوئی حکیم خان کا بس اڈے کے اندر چپل کباب کا ہوٹل تھا۔ سنگین خان اور اس کی بیوی نے پانچ دن تک گنگے کوٹ ان کی میزبانی کی اور جب گل بینہ چلنے کے قابل ہوئی تو وہ خود انھیں سروبی کے اڈے تک چھوڑنے آیا اور قندھار جانے والی بس میں بٹھا کر واپس ہوا۔ اس نے پہلے ہی اپنے بہنوئی کو پیغام بھجوا دیا تھا جس نے ارغنداب میں دونوں کے لیے ایک کمرے اور صحن پر مشتمل مکان کا بندوبست کر لیا تھا۔ خواڑہ اور گل پانڑہ نے رات گل بینہ کے ہاتھوں، پاؤں پر بڑی محنت سے مہندی کے نقش و نگار بنائے تھے۔ صبح کے وقت دونوں نے مل کر اس کا میک اپ کیا جو ناکم پاؤڈر، ہونٹوں کی سرخی اور گالوں کی لالی پر مشتمل تھا۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور کئی لوگوں کے قدموں کی چاپیں قریب آنے لگیں۔ گل پانڑہ نے کہا: 'مولوی صاب آ گئے۔'

گل بینہ پچھلے ایک سال سے اس دن کے خواب دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ اسے سجایا جائے گا، تمام رسمیں پوری کی جائیں گی، ناچ، گانا، ڈھولک کی تھاپ، کسی سہیلی کا کہنی مار کر کوئی ایسی چبھتی ہوئی بات کہہ جانا کہ کانوں کی لویں تک سرخ ہو جائیں۔ لیکن جو چیز اسے سب سے بڑھ کر دکھی کر

رہی تھی وہ ڈھول کی تھاپ تھی، نہ سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ، بلکہ دادا کی یاد تھی۔ وہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ اپنا سنہری کلہ اور کالی واسکٹ پہن کر کیسے ادھر ادھر بلند آواز میں احکامات جاری کرتے پھرتے، اور اگر کوئی کام ان کی مرضی کے ذرا برخلاف ہوتا تو ان کے منہ سے گالیوں کا فوارہ جاری ہو جاتا۔

دادا کے مرتے ہی سب کچھ تلپٹ ہو گیا۔ زرجانان اور اس کے والد دادا کے سوئم کے موقعے پر پہنچے، اور وہاں آنے والے دوسرے سینکڑوں لوگوں کی طرح بڑے بھائی سے تعزیت کر کے واپس چلے گئے۔

جب وہ تین مہینے بعد دوبارہ رشتہ مانگنے کے لیے آئے تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ گل بینہ کے بھائیوں نے انھیں بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ 'دو ٹکے کے ڈرائیور کی جرات کیسے ہوئی ہمارے گھر رشتہ مانگنے کی؟ آئندہ اس طرف آئے تو ٹانگیں کاٹ کر ہاتھ میں رکھ دیں گے'، وغیرہ۔ گل بینہ کو تو پتہ بھی نہ چلتا، اگر اسے دگمہ نہ بتاتی جو اس کی گہری سہیلی تھی اور اس کا بھابھی کے میکے میں آنا جانا تھا۔ اس نے بتایا کہ گل بینہ کے بڑے بھائی نے ملک عطاءاللہ جان سے رشتے کی بات طے کر دی ہے۔ گل بینہ ہکا بکا رہ گئی۔

'یہ کیا کہہ رہی ہو دگمہ؟ تم جانتی ہو کہ میرا رشتہ تو دادا نے طے کر دیا تھا۔'

'گل بینہ، یہ بات تمھارے علاوہ سارے گاؤں کو معلوم ہے، تم کسی سے بھی پوچھ لو۔ میں نے خود تمھاری بھابھی کے منہ سے سنا تھا جو میری امی سے بات کر رہی تھیں۔ بلکہ انھوں نے تو یہ بھی کہا کہ تمھارے بھائی نے ملک عطا سے پچاس ہزار ولوار بھی طے کر دیا ہے، جن میں سے وہ پچیس ہزار پیشگی دے چکا ہے اور پچیس ہزار اگلے مہینے شادی سے ایک ہفتہ پہلے دے گا۔ ساری عورتیں کہہ رہی ہیں کہ آج تک گاؤں میں کسی دلھن کا ولوار اتنا طے نہیں ہوا۔ لیکن گاؤں میں تم سے زیادہ پیاری دلھن کون بنی ہے آج تک۔'

'ارے کون سی دلھن، کیسی دلھن؟' گل بینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ 'اور وہ بھی

Scanned with CamScanner

ملک عطا کی جس نے مس فرزانہ کو علاقے سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا اور جو آج تک ہمارے سکول میں اپنی گائیں بھینسیں باندھتا ہے؟'

وگمہ بھی اس کے ساتھ رونے لگی۔ 'میں جانتی ہوں گل بینہ۔ لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ خدا کی یہی مرضی ہے۔ ہم عورت ذات اور کر بھی کیا سکتی ہیں، بس صبر شکر کرنا پڑے گا۔'

مولوی کی آواز نے گل بینہ کو اپنی سوچوں کے بھنور سے باہر نکال دیا۔ وہ پوچھ رہے تھے، 'گل بینہ، دختر شیر جان، تمھیں زرجانان خان ولد نیک محمد سے نکاح بعوض مہر ایک ہزار روپے، سکہ رائج الوقت قبول ہے؟'

گل بینہ کی سہیلیوں کی شادیوں کے موقعے پر بڑا ہلا گلا مچتا تھا۔ نکاح کے لیے مولوی صاحب آتے تو دلھن کی دس پندرہ سہیلیاں اس کے ساتھ ٹھنس کر چارپائی بیٹھی ہوتیں۔ مولوی کے لیے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کرسی لائی جاتی جس پر وہ اپنے بھاری وجود کو سنبھالتے ہوئے ہتھیوں کے درمیان پھنسا کر بیٹھے جاتے۔ پھر وہ اپنا رجسٹر گھٹنوں پر پھیلا، عینک ناک کے کونے پر اٹکا، قلم جھٹک کر نب کے اندر سیاہی کی فراہمی کو یقینی بناتے اور گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی دلھن سے مخاطب ہوتے۔ دلھن کی کوئی سہیلی اس کے کان میں لیکن بلند آواز میں کہتی، 'کہہ دو دولھے کی ناک لمبی ہے، قبول نہیں ہے۔' اس پر سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ زرق برق جوڑوں میں ملبوس حسین و جمیل لڑکیوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر بنے ہوئے مولوی صاحب کے دل میں اندر اندر لڈو پھوٹ رہے ہوتے، کہ ایسا موقع انھیں سال میں ایک آدھ بار ہی ملتا تھا، لیکن باہر باہر سے وہ چہرے پر مصنوعی غصہ طاری کر کے کہتے، 'بس بہت ہو گئی، یہ دینی معاملہ ہے، کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے، ہر چیز کو کھیل نہیں بناتے، اللہ ناراض ہوتا ہے۔' پھر وہ دوبارہ دلھن کی طرف متوجہ ہو کر اپنا سوال پوری سنجیدگی سے دہراتے اور دلھن کی بجائے پیچھے سے کوئی لڑکی بول پڑتی، 'مجھے قبول ہے،' اور لڑکیوں کے قہقہوں سے وہ دھما چوکڑی مچتی کہ خدا کی پناہ۔

سہیلیاں سات دن پہلے ہی دلھن کے گھر جا کر رات گئے تک ہنستی، کھیلتی، ناچتی،

دھولک بجاتی رہتی تھیں۔ کئی تو ساری ساری رات اتنی اونچی آواز میں تانیں لگاتیں کہ صبح گلے بیٹھ جاتے اور بات کرنی مشکل ہو جاتی۔

شادی کا نقطۂ عروج اس وقت ہوتا جب دولھا بارات لے کر دلھن کے گھر پہنچتا۔ دلھن کی سہیلیاں دولھا اور شہ بالا کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں۔ بعض اوقات چارپائی کے صرف چوکھٹے پر ہی چادر تان کر بچھا دی جاتی۔ غیر محتاط دولھا اس پر بیٹھنے کی کوشش کرتا تو دھڑام سے نیچے جا گرتا اور سہیلیوں کے قہقہے ساتویں آسمان کی خبر لاتے۔ کبھی دولھا اور اس کے ساتھیوں کو بڑے سلیقے سے شربت پیش کیا جاتا، جس کے اندر کئی چمچ مرچیں خوب گھول کر حل کر دی گئی ہوتیں۔ دولھا بیچارا روح افزا شربت سمجھ کر بڑا سا گھونٹ بھرتا اور منھ بری طرح جھلسا بیٹھتا۔ اس موقعے پر دولھا بے چارے کے چہرے پر ویسے ہی ہوائیاں اڑ رہی ہوتی تھیں اور اسے پتہ ہی نہیں چلتا تھا اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

گل بینہ کو اچھی طرح یاد تھا، جب وہ آٹھ نو سال کی تھی تو ان کے محلے میں ایک دولھا کے اوسان اس قدر خطا ہوئے کہ عین بارات کے وقت گھر سے بھاگ گیا۔ دوست جب اس کے گھر پہنچے تو غائب تھا۔ پھر کسی نے اسے سامنے پہاڑ پر درختوں کے درمیان بھاگتے ہوئے دیکھ لیا۔ فوراً آٹھ دس تگڑے لڑکے اکٹھے کیے گئے اور انھیں مختلف سمتوں میں اسے گھیرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ گل بینہ، گاؤں کی عورتیں، بچے، مرد، باراتی، دوسرے گاؤں سے آئے ہوئے مہمان، سب چھتوں پر کھڑے سامنے پہاڑ کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں لڑکے سفید لباس میں ملبوس دولھا کو پکڑنے کے لیے دوڑتے اور دولھا درختوں کے کسی جھنڈ یا جھاڑیوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا اور نیچے سے پورا گاؤں پکارتا، 'وہ رہا، ادھر، دائیں طرف۔' آخر بڑی مشکل سے وہ ہاتھ آیا اور چار لڑکے اسے ڈنڈا ڈولی کر کے گاؤں لائے جہاں اسے ایک بار پھر بنا سنوار کر دوبارہ دولھا بنا دیا گیا۔

اگر بارات دوسرے گاؤں سے آئی ہوتی تو دلھن کے گاؤں والے ان سے اگلے پچھلے

Scanned with CamScanner

بدلے چکانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ابھی پچھلے سال ہی کی بات ہے کہ صابر نور کی بیٹی کی شادی کے موقع پر دوسرے گاؤں سے بارات آئی۔ لڑکی کے محلے والوں نے راستے میں لکڑی کی رکاوٹیں کھڑی کر کے چنگی بنا رکھی تھی۔ بارات وہیں روک دی گئی۔ ان سے مطالبہ کیا گیا کہ چنگی سے گزرنے کا محصول یہ ہے کہ دولھا سڑک پر پڑے چیڑ کے تنے کو کلھاڑی سے چیر کر دکھائے۔ دولھا دھان پان ہی سہی لیکن لکڑی چیرنا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر یہاں گاؤں والوں نے استادی دکھائی تھی اور خوب چھان پھٹک کر ایسا تناڈھونڈ نکالا جو گانٹھوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ دولھا کو جو کلھاڑی دی گئی وہ اتنی کھٹل تھی کہ اس سے تنا تو درکنار گندم کا ڈنٹھل کاٹنا تک مشکل تھا۔ بے چارہ پسینے پسینے ہو گیا لیکن تنے کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ آخر دوسرے باراتیوں نے اس سے کلھاڑی لے لی اور تنے پر پل پڑے۔ پورے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کمر توڑ مشقت کے بعد کہیں جا کر تنا چرا اور محصول والوں نے بارات کو گزرنے دیا۔

لیکن یہاں ارغنداب کے اس چھوٹے سے مکان میں مکمل خاموشی تھی، صرف مولوی صاحب کی پاٹ دار آواز کی گونج رہی تھی۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا، 'گل مینہ، دختر شیر جان، تمھیں زر جانان خان ولد نیک محمد سے نکاح بعوض مہر ایک ہزار روپے، سکہ رائج الوقت قبول ہے؟'

زر جانان سے رابطہ کر کے اسے شادی طے ہونے کی بات بتانا آسان نہیں تھا۔ ایک تو وہ گاؤں کبھی کبھار ہی آتا تھا، اور اگر آ بھی جائے تو جیپ گاؤں کے حجرے کے سامنے کھڑی کرتا تھا جہاں ہر وقت لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ آخر وہ گمہ سے مشورہ کر کے اس نے ایک رقعے میں سارا ماجرا لکھا اور اس کے بھائی کے ہاتھ میران شاہ بھجوا دیا۔

اگلے ہی دن گل مینہ کو زر جانان کی جیپ حجرے کے باہر کھڑی نظر آ گئی۔ اس طرف عورتیں نہیں جاتی تھیں، لیکن گل مینہ کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا، اس نے ایک شام کی تاریکی میں آنکھ بچا کر ایک اور رقعہ جیپ کی اگلی سیٹ پر پھینک دیا جس میں دونوں کے مل کر بھاگنے کی تاریخ اور وقت درج تھا۔

گل مینہ کو اپنی اماں کا چہرہ تقریباً بھول چکا تھا۔ نہ ہی گھر میں ان کی کوئی تصویر تھی جسے دیکھ کر وہ ان کی نقوش اپنی یادداشت میں تازہ کر لیتی۔ وہ ان کے بارے میں جب بھی سوچتی، ایک مہربان اور شفیق ہیولا تصور میں آ کر اس کے سارے وجود کو گھیرے میں لے لیتا۔ اس وقت بھی اسے بے طرح اماں کی یاد آئی۔ وہ ہوتیں تو بھائی کی کبھی جرات نہ ہوتی اسے یوں بیچنے کی۔ وہ ہوتیں تو ہاتھ مہندی سے رنگے، نئے کپڑے پہنے، اس وقت اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوتیں۔

اور دادا؟ جو دوسروں کے لیے سخت گیر اور غصہ ور مشہور تھے لیکن اس کے ساتھ بچہ بن جاتے تھے۔ وہ ہوتے تو اس کے ساتھ سہیلیوں کی طرح کوئی نہ کوئی شرارت کرنے کی منصوبہ بندی ضرور کرتے۔

مولوی صاحب نے تیسری بار پوچھا تو گل مینہ نے آہستگی سے ہاں کہہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی مولوی نے نکاح کا خطبہ پڑھنا شروع کر دیا۔ گل مینہ لبے گھونگھٹ کے اندر اپنے ہاتھوں پر نظریں جمائے سنتی رہی۔ خطبہ ختم ہونے کے بعد مولوی صاحب نے سب کو مبارک باد دی اور کرسی پیچھے کھسکا کر ان کے کھڑے ہونے اور جانے کی آواز آئی۔ خواتین نے ہاتھ دبا کر گل مینہ کو مبارک باد دی تو اس کی آنکھوں سے دو آنسو بہہ کر ہاتھوں کی مہندی میں جذب ہو گئے۔

Scanned with CamScanner

16

اسلحہ حکومت کے حوالے کرنے میں لیت ولعل سے کام لینے پر موسیٰ نیکہ کی مسماری کے لیے گورکھا یونٹ کے دستوں کو ترجیح دی گئی، جن کی رہنمائی کے لیے سابقہ وزیرستان ملیشیا کی ایک پلٹن بھی ساتھ رکھی گئی جس کا نام اب بدل کر وزیرستان سکاؤٹس رکھ دیا گیا تھا۔

نائب صوبیدار نیاز بین خود موسیٰ نیکہ ہی کا رہنے والا تھا۔ جب اپنے ہی گاؤں کی مسماری کا حکم ملا تو اسے بڑا عجیب سا لگا۔ اس نے کرنل رسل سے اس مسئلے پر بات کرنا چاہی کہ اسے اس ذمہ داری سے معاف رکھا جائے لیکن اس نے نیاز بین کی بات سنی ان سنی کر دی۔ 'بھئی سیدھی سی بات ہے کہ ہمارے پورے لشکر میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اس علاقے کا تم سے زیادہ واقف ہو۔ تم سے بہتر بھلا کون ہماری رہنمائی کر سکتا ہے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ تمھارے ساتھی بغیر کسی رہنمائی کے اندھوں کی طرح چلیں اور قبائلیوں کے بچھائے ہوئے کسی جال میں پھنس جائیں؟'

کرنل رسل ابھی حال ہی میں میجر سے ترقی پا کر کرنل بنا تھا۔ اسے وانہ قلعے سے وزیرستان ملیشیا کے انخلا کے موقعے پر بے مثال شجاعت اور ذمہ داری کے مظاہرے پر برطانوی فوج کے اعلیٰ اعزاز ملٹری کراس سے نوازا گیا تھا۔ فورٹ سینڈی مین پہنچنا واقعی آگ اور خون کا سمندر پار کرنے کی مترادف ثابت ہوا۔ انھیں قدم قدم پر قبائلیوں کے حملوں کا نشانہ بننا پڑا۔ شدید گرمی اور پانی کی قلت نے بھی اپنا کام دکھایا اور دو سو نوے میں سے صرف صرف ایک سو پینسٹھ جوان منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ رسل کو چھوڑ کر باقی تمام انگریز افسر راستے میں مارے گئے۔ خود میجر رسل کو دونوں ٹانگوں میں گولی لگی تھی جس کی وجہ سے اس کی چال میں ایک عجیب قسم کی لنگڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

تاہم اس نے فورٹ سینڈی مین پہنچ کر اپنے وعدے کا پاس رکھا اور نہ صرف نیاز بین

سے تحریری معافی مانگی، اور اسے وفاداری کا سرٹیفکیٹ بھی دلوا دیا بلکہ ہیڈ کوارٹر میں کچھ ڈوریاں ہلا کر اسے حوالدار سے ترقی کروا کے نائب صوبیدار بھی بنوا دیا۔ ویسے بھی جنگ کے دوران دو کو چھوڑ کر وزیرستان ملیشیا کے تمام کے تمام نان کمشنڈ افسر یا تو بھگوڑے ہو گئے تھے یا پھر مارے گئے تھے چنانچہ ترقی کے لیے سارا میدان ہی صاف ہو گیا تھا۔

جنگ جتنی اچانک شروع ہوئی تھی، اس سے زیادہ تیزی سے ختم ہو گئی۔ خیبر ایجنسی، باغ، بل، افغانوں کو ہر محاذ پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک برطانوی طیارے نے کابل پر بم برسائے۔ جنرل نادر دانہ کی طرف بڑھنے کی بجائے واپس پلٹ گیا۔ جون کے اوائل میں دونوں ملکوں نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا، اور انگریز تمام چھوڑی ہوئی چوکیوں اور قلعوں میں لوٹ آئے۔

جب جنوری 1920 میں فوجی کاروان موسیٰ نیکہ کو سبق سکھانے اور دوسرے قبائل کے لیے مثال بنانے کی غرض سے مرتضیٰ سے روانہ ہوا تو نائب صوبیدار نیاز بین اس کے ساتھ شامل تھا۔ وانہ سے مزید دستے اس میں آ کر مل گئے اور سپاہیوں کی تعداد ایک ہزار سے تجاوز کر گئی۔ بیسیوں مشکی، قلی، خانساے، ماشکی، خاکروب، سائیس، شتربان، اور دوسرا عملہ اس کے علاوہ تھا۔

لشکر وانہ سے براستہ شاہ عالم چلا اور سات ہزار فٹ کی بلندی چڑھ کر خام رنگ پہنچ گیا۔ یہاں چند دن پہلے برف باری ہوئی تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ لشکر کے لیے کوئی بڑا مسئلہ بن سکتی۔ لشکر کیل کانٹے سے لیس تھا۔ ہر سپاہی کے پاس تھری ناٹ تھری رائفل تھی۔ ان کے علاوہ دو وکرز مشین گنیں، دو لیوس مشین گنیں اور ایک ہاؤزر توپ خچروں اور اونٹوں پر لدی ہوئی تھیں۔ خام رنگ میں راستے کے دونوں طرف چیڑ اور بلوط کا گھنا جنگل تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں قبائلیوں کے حملے کا سب سے زیادہ خدشہ تھا۔ کرنل رسل نے اس خطرے سے نمٹنے کے لیے اصل لشکر کے پہنچنے سے قبل چھوٹے چھوٹے فوجی دستے آگے بھیج دیے جنھیں یہ کام سونپا گیا کہ وہ جگہ جگہ اونچے مقامات اور دوسری ممکنہ کمین گاہوں پر قبضہ کر کے وہاں حفاظتی چوکیاں بناتے چلے جائیں۔ ان کی

Scanned with CamScanner

جانب سے سبز جھنڈی ملنے کے بعد ہی کاروان حرکت کرتا تھا۔ لشکر مقررہ فاصلہ چل کر پھر رک جاتا تھا اور پکٹ والے سپاہی آگے چل کر نئی پکٹیں بنا کر ایک بار پھر راستہ صاف کر دیتے تھے۔ حفاظتی نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا ضروری تھا لیکن اس کی وجہ سے لشکر چیونٹی کی رفتار سے حرکت کرتے ہوئے گھنٹوں کا فاصلہ دنوں میں طے کرتا تھا۔ پکٹ میں موجود سپاہی اس وقت تک اپنی جگہ مورچہ بند رہتے جب تک لشکر کا آخری جانور حفاظت سے نہ گزر جاتا۔ اس آخری جانور کے سامان کے اوپر ایک سرخ رنگ کا جھنڈا نصب تھا۔ اس جھنڈے کا مطلب یہ تھا کہ لشکر کا کوئی بھی جانور یا فرد کسی بھی صورت اس جھنڈے سے پیچھے نہیں ہو سکتا۔

نیاز بین کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ خام رنگ اور نیزہ نرئی کے درمیانی گھنا جنگل قبائلیوں کے لیے عمدہ کمین گاہ ثابت ہو سکتا ہے۔ جب لشکر جنگل سے نکل کر بحفاظت نیزہ نرئی کے قریب پہنچ گیا تو اسے حیرت ہوئی۔

نیاز بین کی دوستی لیفٹیننٹ سٹینلی کے ساتھ ہو گئی تھی۔ لیفٹیننٹ کی عمر مشکل سے بیس اکیس سال رہی ہو گی، اور برطانیہ میں سینڈ ہرسٹ ملٹری اکیڈمی سے فارغ ہونے کے بعد یہ کسی باقاعدہ جنگی مہم میں اس کی پہلی شرکت تھی۔ اس کے لیے ہر چیز عجوبے کا باعث تھی۔ وہ یہی سمجھتا آیا تھا کہ ہندوستان مہاراجوں، ریشمی ساڑھیوں، ناقابلِ فہم موسیقی اور سادھوؤں، سپیروں سے لبریز نہایت گرم ملک ہے۔ لیکن اب وزیرستان میں گھنٹوں گھنٹوں برف دیکھ کر اسے شدید حیرت ہوتی تھی۔ میجر رسل کے بعد وہ دوسرا انگریز افسر تھا جسے پشتو آتی تھی جو اس نے تربیت کے دوران کتابوں کی مدد سے سیکھی تھی، اور اب اسے پختہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ نیاز بین کو معلوم تھا کہ انگریز افسروں کے ترقی کے امتحان میں پشتو کا پرچہ بھی شامل ہوتا ہے لیکن سٹینلی کی متقامی لہجے، رہن سہن، ثقافت، جانوروں، پودوں حتیٰ کہ جغرافیے تک میں دلچسپی صرف ترقی کے امتحان میں کامیاب ہونے کی حد تک نہیں تھی۔ اسے ان سب چیزوں کے بارے میں جاننے کا فطری اشتیاق تھا۔ اس کے جوش و جذبے کی کوئی انتہا نہیں تھی، وہ بھاگ بھاگ کر

نیاز بین سے ہر درخت، پرندے اور پھول کا پشتو میں نام اور خواص پوچھتا اور اپنی جیبی ڈائری میں نوٹ کر لیتا۔

اب لشکر پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ یہاں دو طرف اونچے درختوں کے نیچے سڑک کے دائیں جانب سفید رنگ کے پانچ چھوٹے بڑے پتھر پڑے تھے۔ نیاز بین نے لیفٹیننٹ سٹینلی کو گھوڑا روکنے کا اشارہ کیا، 'سر، آپ کے خاص مطلب کی چیز ہے یہ۔ یہ پانچ پتھر دیکھ رہے ہیں، انھی کی وجہ سے اس درے کو نیزہ نرئی، یعنی نیزے والا درہ کہتے ہیں۔'

'لیکن نیزہ تو ہتھیار کا نام ہے، اس کا پتھر سے کیا تعلق؟' سٹینلی نے پوچھا۔

'سر، اس وقت سامنے گھاٹی کی وجہ سے نظر نہیں آ رہا، لیکن جب ہم درے سے نیچے اتریں گے تو مغرب کی جانب دور ایک پہاڑی سلسلہ نظر آئے گا۔ ان پہاڑوں کے دوسری طرف ایک شہر آباد ہے، جس کا نام ہے غزنی۔'

'نام سنا ہوا ہے، آگے چلو۔' لیفٹیننٹ کا اشتیاق واضح طور پر بڑھتا جا رہا تھا۔

'اسی شہر میں پرانے زمانے میں ایک بادشاہ رہتا تھا، محمود غزنوی۔ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے تھے۔ ہمارے بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ ایک بار وہ اسی نیزہ نرئی سے ہو کر ہندوستان گیا تھا۔ اس کے سپاہیوں نے یہاں سے گزرتے ہوئے رک کر انھی پتھروں پر اپنے نیزے تیز کیے تھے۔ اسی وجہ سے اس درے کو نیزہ نرئی کہا جاتا ہے۔'

سٹینلی چھلانگ مار کر گھوڑے سے اتر آیا اور پتھروں کے اردگرد گھوم کر ان کا جائزہ لینے لگا۔ 'میرے خدا، محمود غزنوی کا زمانہ ایک ہزار سال پہلے کا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ پتھر ہزار سال سے یہیں پڑے ہیں! ان کی تصویر لیے بغیر یہ مہم بالکل نامکمل رہے گی۔'

سٹینلی نے جلدی جلدی گھوڑے پر سے اپنا بیگ اتارا اور اس کے اندر سے کیمرا نکالنے لگا۔ اسی دوران کرنل رسل بھی پہنچ گیا۔ 'یہاں کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ رک کیوں گئے ہو؟' اس نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

'سر، یہ پتھر محمود غزنوی کے زمانے کے ہیں، لیفٹیننٹ صاحب ان کی تصویر لینا چاہ رہے تھے' نیاز بین نے کہا۔

'لیفٹیننٹ صاحب سے کہو کہ وہ پکنک منانے نہیں، بلکہ ایک جنگی مہم پر آئے ہوئے ہیں، کسی وقت بھی دشمن کا حملہ ہو سکتا ہے اور ان کی بنیادی ذمہ داری اپنے یونٹ کی سلامتی ہے، نہ کہ تاریخ اور تحقیق' کرنل نے پاؤ جان سے مخاطب ہو کر پشتو میں کہا اور گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

لیفٹیننٹ سلیٹلی نے کیمرا واپس بیگ میں ڈال دیا۔ نیاز بین نے مایوسی کے عالم میں سر ہلایا۔ 'سر کوئی بات نہیں، اس وقت کرنل فکر مند ہیں۔ واپسی میں زیادہ وقت ہو گا، اس وقت آرام سے تصویر لے لیجیے گا، ویسے بھی کیمرا لگاتے لگاتے دس پندرہ منٹ تو لگ ہی جاتے' نیاز بین نے کہا۔

لیفٹیننٹ سلیٹلی نے محمود غزنوی کے سفید پتھروں پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

درے سے نیچے اتر کر ایک وسیع چراگاہ میں لشکر رک گیا۔ کرنل رسل نے رات گزارنے کے لیے یہ جگہ منتخب کی تھی۔ قلی خچروں سے سامان اتارنے لگے، خانساموں نے آگ جلا کر دیگچے چڑھا دیے اور پل بھر میں جنگل میں منگل کا سماں ہو گیا۔

اگلی صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ لشکر نیچے اترنا شروع ہو گیا۔ نیاز بین کی چھٹی حس بار بار گھنٹیاں بجائے چلی جا رہی تھی۔ لیکن دوربین سے چاروں طرف دیکھنے کے باوجود اسے کہیں خطرے کے آثار نظر نہیں آئے۔ ایک جگہ بادلوں کے پیچھے سے افق پر پہاڑ نظر آئے تو اس نے لیفٹیننٹ سلیٹلی کو اشارہ کر کے بتایا کہ ان کے پیچھے غزنی ہے۔ لیفٹیننٹ نے ادھر ادھر دیکھ کر سر ہلایا۔ اچھی بات یہ تھی کہ کرنل رسل اس وقت لشکر کے پچھلے حصے میں تھا۔

یہاں سے موئی نیکہ تک سڑک مل کھاتی ہوئی نیچے اترتی تھی۔ لشکر کے آگے آگے سولہ اونٹ تھے جنھیں تنگ موڑ مڑنے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ ہر اونٹ کی نکیل ایک چارگزری کی مدد

سے اگلے اونٹ کے کجاوے سے بندھی تھی۔ جب اگلا اونٹ تنگ موڑ سے مڑ جاتا تو پچھلے اونٹ کی نکیل اگلے اونٹ پر لدے سامان میں پھنس جاتی اور وہ وہیں بے وقوفوں کی طرح بت بن کر کھڑا ہو جاتا۔ اس سے پیچھے آنے والے اونٹوں کی نکیلیں بھی اٹکتی چلی جاتیں اور چند منٹوں کے اندر اندر پوری قطار ریشم کے دھاگوں کی طرح آپس میں اس بری طرح الجھ جاتی کہ اسے سلجھاتے سلجھاتے گھنٹہ لگ جاتا۔

اتنے میں خواجہ خضر پہاڑ کی برفانی چوٹی کی طرف سے ایک مشینی آواز بلند ہوئی۔ تمام لشکر رک گیا اور سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگا۔ آواز خاصی دیر ادھر ادھر گونجتی رہی، پھر درختوں کے اوپر سے اس کا ماخذ نمودار ہوا۔ یہ رائل ایئر فورس کا دو پروں والا جہاز تھا جو نیاز بین کو بھنورے کی یاد دلاتا تھا۔ نیاز بین کو جہاز دیکھ کر ہمیشہ یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ اب گرا کہ تب گرا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوہے کی تاروں کی مدد سے آپس میں بندھے لکڑی کے یہ تختے ہوا میں کیسے اتنی آسانی سے تیر سکتے ہیں کہ نہ صرف اپنا وزن سہار سکیں بلکہ ساتھ دو آدمیوں کو بھی اٹھائے اٹھائے پھریں۔ اسے بڑا اشتیاق تھا کہ کبھی اس چیز کو زمین سے ہوا میں بلند ہوتا ہوا دیکھے۔ وہ دو تین بار بنوں چھاؤنی جا چکا تھا لیکن اسے کبھی ہوائی پٹی کی طرف جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس دوران جہاز لشکر کے خاصے قریب پہنچ گیا۔ اتنے قریب کہ نیاز بین اس کے اندر بیٹھے دونوں انگریز افسروں کی شکلیں دیکھ سکتا تھا۔

لشکر کے عین اوپر پہنچ کر پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے کوئی چیز نیچے پھینکی۔ پہلے تو نیاز بین کو گمان گزرا کہ کہیں یہ بم نہ ہو، لیکن پھر اسے خیال آیا کہ خود اپنی فوج کا جہاز بم کیوں گرانے لگا۔ پھینکے جانے والی چیز لٹو کی طرف گھومتی ہوئی نیچے آئی اور لشکر کے اگلی طرف اونٹوں کی قطار کے قریب جا گری۔ جہاز نے اب اپنے دائیں پر اوپر اٹھا لیے تھے اور وہ ایک ساتھ گھومتا اور اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ واپس مڑ کر اسی طرف روانہ ہو گیا جہاں سے آیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دیودار کی چوٹیوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔ اس کی پھٹ پھٹ کرتی آواز تھوڑی دیر تک

Scanned with CamScanner

ہوا میں لرزتی رہی اور پھر معدوم ہوگئی۔

نیاز بین کو اشتیاق تھا کہ جہاز نے کیا چیز نیچے گرائی ہے۔ ظاہر ہے وہ کوئی بہت اہم چیز ہوگی جس کی خاطر جہاز اتنی دور سے آیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس کے لیے کرنل رسل کا بلاوہ آگیا۔ کرنل نے گھاس پر ایک نقشہ بچھا رکھا تھا۔ کپتان وائٹ ہیڈ بھی اس کے پاس موجود تھا۔

'نیاز بین، یہ بتاؤ کہ درے نشتر گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟'

'سر جس راستے سے ہم آئے ہیں وہاں ایک میل پیچھے زمچن ہے، وہاں سے درے نشتر کوئی دو ڈھائی میل ہوگا۔'

'اس کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہے؟' میجر نے پوچھا۔

'اگر وگدلے سے جنوب میں زمچن کی طرف جانے کی بجائے شاہ بلوط کے جنگل کے اندر داخل ہو جائیں تو وہاں سے ایک پگڈنڈی سیدھی نیزہ نرئی تک آتی ہے، اس سے کوئی میل سوا میل راستہ بچ جائے گا۔'

'ابھی جو جہاز آیا تھا اس نے پیغام دیا ہے کہ درے نشتر کے قریب ڈیڑھ دو سو قبائلیوں کا جتھا دیکھا گیا ہے جو جنوب مغرب کی سمت پیش قدمی کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا ارادہ ہم پر دھاوا بولنے کا ہے۔ تمھارا کام یہ ہے کہ تم کیپٹن وائٹ ہیڈ کے ساتھ مل کر لشکر کے دائیں جانب چوکیں قائم کرنے میں مدد دو، اور خاص توجہ ان جگہوں پر رکھو جہاں سے اس لشکر کے حملہ کرنے کا اندیشہ ہو۔'

17

قندہار گل بینہ کے اندازے سے کہیں بڑا شہر واقع ہوا۔ چھ ماہ قبل وہ پکتیکا سے ارغنداب آتے ہوئے قندہار سے گزرے تھے لیکن ٹوٹی پھوٹی سڑک پر دس گیارہ گھنٹے کے سفر سے گل بینہ کی طبیعت اس قدر خراب ہوگئی کہ سارا وقت وہ اگلی سیٹ کی پشت پر سر ٹکائے بیٹھی رہی۔

اس سے پہلے گل بینہ نے جو سب سے بڑا قصبہ دیکھا تھا وہ میران شاہ تھا۔ قندہار اس سے کئی گنا بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پہلی بار زرجانان کے ساتھ اس کی کوچ میں سفر کر رہی تھی جو وہ ارغنداب سے پندرہ کلومیٹر دور قندہار شہر تک چلاتا تھا۔ وہ زرجانان کے ساتھ اونچی نشست والی آرام دہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور زرجانان اسے کبھی کبھی کسی دلچسپ چیز یا منظر کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔

گل بینہ قندہار کی سڑکیں، عمارتیں اور بازار دیکھنے کے ساتھ کبھی کبھی زرجانان کی طرف بھی دیکھتی جاتی تھی جو بہت توجہ اور احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ کبھی وہ تیزی سے سٹیئرنگ گھما کر کسی راہگیر کو گاڑی کے نیچے آنے سے بچاتا، کبھی گاڑی کی رفتار بالکل کم کر کے کسی گدھا گاڑی کو گزرنے کا راستہ دیتا۔ مزید یہ کہ سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی پھوٹی تھی اور اسے گڑھوں سے بچنے کے لیے گاڑی کو لہرا کر ان کے گرد سے گزارنا پڑتا تھا۔

قندہار شہر کی گنجان سڑکوں پر خاصی دیر چلنے کے بعد زرجانان نے گاڑی مرکزی اڈے پر لگا دی اور گل بینہ کو گاڑی سے اترنے کا اشارہ کیا۔

گل بینہ کو برقعے میں چلنے کا زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ شوال میں دادا نے اسے سفید شٹل کاک برقع بنوا کر دیا تھا لیکن وہ سال میں ایک آدھ بار ہی استعمال ہوتا تھا۔ یہاں زرجانان اس کے لیے نیلے رنگ کا افغانی برقع لے کر آیا تھا جس پر نہایت محنت سے چنٹیں استری کی گئی تھیں۔

Scanned with CamScanner

اس کے منہ کے آگے چھوٹی جالی تھی جس میں سے اسے اپنے پاؤں کے آگے زمین نظر نہیں آتی تھی اور اسے خطرہ تھا کہ وہ کہیں کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر نہ جائے۔ اس کے ہر طرف کوچیں، کاریں، بسیں، ٹرک شور مچاتے ہارن بجاتے آجا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں گدھا گاڑیاں بھی چل رہی تھیں اور کہیں کہیں اونٹ بھی نظر آجاتے تھے۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے، ہر رنگ اور نسل کا آدمی بھیڑ میں سے راستہ نکالتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ شہر میں ایک عجیب افراتفری اور وحشت کا عالم تھا، جیسے ہر شخص کی کوئی قیمتی چیز کھوگئی ہے اور وہ اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔

سب سے زیادہ مشکل اسے سڑک پار کرتے ہوئے آئی۔ اتنی گاڑیاں تھیں کہ ان کی بیچ میں سے گزرنے کا راستہ ہی نہیں ملتا تھا۔ زرجانان سڑک پر ایک دوبار آگے بڑھ گیا، لیکن گل مینہ فٹ پاتھ ہی پر جمی رہی۔ ایک تو اسے برقعے کی جالیوں میں سے صحیح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا دوسرے گاڑیوں سے لبالب بھری سڑک اسے تیز بارشوں کے بعد بپھری ہوئی شوال ندی معلوم ہو رہی تھی جس میں قدم رکھا تو پانی ساتھ کھینچ کر لے جائے گا۔ آخر زرجانان نے اس کا ہاتھ تھام لیا، اور چیختی ہوئی گاڑیوں کے بیچ میں سے نکال کر دوسری طرف لے گیا۔

شادی کے بعد وہ پہلی بار قندہار آئی تھی۔ سنگین خان کے بہنوئی حکیم جان کباب کی مہربانی سے زرجانان کو آتے ہی ارغنداب کے اڈے میں روسی ساخت کی مسافر کوچ چلانے کا کام مل گیا تھا۔ یہاں گاڑیاں سڑک کے دائیں طرف چلتی تھیں، اس لیے شروع شروع میں تو اسے بڑی مشکل پیش آئی اور ایک دو دفعہ وہ موڑ مڑتے وقت غلط طرف مڑ گیا، لیکن جلد ہی اس کا ہاتھ رواں ہو گیا۔ وہ ارغنداب سے سواریاں لے کر پندرہ کلومیٹر دور قندہار لے جاتا تھا، اور وہاں سے سواریاں لے کر واپس ارغنداب آتا تھا۔ اگر سواریاں زیادہ ہوتیں تو دن میں پانچ چھ پھیرے بھی لگ جاتے، لیکن اگر کبھی فائرنگ یا بم دھماکہ ہو جاتا تو پھر سڑکیں بند رہتی تھیں۔

گل مینہ کو خالی گھر میں بہت ڈر لگتا تھا۔ زرجانان کے گھر آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ اگر قندہار سے آخری پھیرے کی سواریاں ملتے ملتے دیر ہو جاتی تو رات کے دس بھی بج

جاتے۔ گل مینہ کو ہر دم دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں اس کے بھائی یا ملک عطا کے گرگے بو سونگھتے ہوئے یہاں تک نہ پہنچ جائیں۔ ایسے موقعوں پر وہ پڑوس سے حکیم خان کی تیرہ سالہ بیٹی خواژہ کو بلا لیتی تھی اور دونوں زرجانان کی واپسی تک باتیں کرتی رہتیں۔ گل مینہ کی تھری ناٹ تھری اس کی چارپائی کی پائنتی کے ساتھ ٹکی ہوتی۔ وہ وقتاً فوقتاً اس کی صفائی بھی کرتی رہتی تاکہ وقت آنے پر کوئی مسئلہ نہ ہو۔ دو تین بار اس نے باہر جا کر نشانہ صاف کرنے کی مشق بھی کی تھی۔

زرجانان شادی کے دو مہینے بعد چھپ کر شوال گیا تھا۔ حالات کا جائزہ لینے کے علاوہ وہاں سب سے ضروری کام شاہکوٹ میں دوست کے گھر کھڑی جیپ کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ دوست نے بتایا کہ ملک عطا کے آدمی اس کے گھر تک پہنچ گئے تھے اور جیپ لے جانا چاہتے تھے۔ نوبت گولیاں چلنے تک پہنچ گئی۔ بڑی مشکل سے قبیلے والوں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کروایا کہ جیپ دوست کے پاس زرجانان کی امانت ہے، جس میں کسی بھی قیمت پر خیانت نہیں کی جا سکتی، چاہے اس میں کتنی جانیں ضائع ہو جائیں۔

زرجانان نے جیپ قسطوں پر لی تھی۔ اب اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ بقایا قسطیں یک مشت ادا کر سکتا۔ اس نے وہ اونے پونے پرانے مالک کے حوالے کر دی۔ وہیں اسے پتہ چلا کہ ملک عطا کے لوگ اب بھی اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ اس کے بعد وزیرستان جلد واپسی کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

زرجانان کو یہ بھی پتہ چلا کہ اس کی گولی سے گل مینہ کا چچازاد بھائی حکم نور زخمی ہو گیا تھا لیکن خیریت گزری کہ گولی کندھے کو چھو کر گزری تھی اس لیے وہ چند ہفتے بازو پٹی میں باندھے باندھے پھرنے کے بعد اب ٹھیک ہو گیا تھا۔

زرجان گل مینہ کو احمد شاہ ابدالی کا مقبرہ دکھانے لے گیا۔ گل مینہ نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ احمد شاہ ابدالی افغانستان کے بانی ہیں اور سرحد کے دونوں اطراف کے پشتون عقیدت سے انھیں بابا ابدالی کہتے ہیں۔ گل مینہ کو فیروزی گنبد والی ہشت پہلو عمارت نہایت پسند آئی جس

کے ہر پہلو پر ایک بلند مینار ایستادہ تھا اور ہر مینار کی چوٹی پر مرکزی گنبد جیسا مگر اس سے کہیں چھوٹا گنبدیوں نصب تھا جیسے انھوں نے اپنے سروں پر خوشنما پگڑیاں باندھ رکھی ہوں۔ عمارت کے آٹھوں پہلوؤں پر اس قدر دل آویز نمونوں والی ٹائلیں لگی تھیں کہ ان پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس نے کتابوں میں تصویریں تو ضرور دیکھی تھیں لیکن خود کبھی ایسی عمارت نہیں دیکھی تھی جو اتنی ہی خوبصورت بھی ہو جتنی پروقار۔

تاہم جب وہ قریب ہی میں واقع خانقاہ خرقہ شریف دیکھنے گئے تو گل مینہ بابا ابدالی کا مزار بھول گئی۔ زرجانان نے جب اسے بتایا کہ یہاں نبی اکرم کا خرقہ شریف موجود ہے تو اس کی آنکھیں عقیدت سے بھیگ گئیں۔ 'چلو، اندر چل کر اس کی زیارت کرتے ہیں'؛ اس نے فوراً ہی فرمائش کر ڈالی۔ لیکن جب زرجانان نے ایک محافظ سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ یہ مقدس یادگار عمارت کے اندر ایک حجرے میں مقفل ہے اور ایک صدی میں ایک ہی بار باہر نکلتی ہے، اور وہ بھی تب جب کوئی بہت بڑا واقعہ ہو جائے۔ اس نے بتایا کہ آخری بار یہ خرقہ ساٹھ سال قبل اس وقت نکالا گیا تھا جب افغانستان میں ہیضے کی وبا پھیل گئی تھی اور اتنی تعداد میں لوگ مرنے لگے تھے کہ کوئی دفنانے والا نہ ملتا تھا۔ آخر امیر افغانستان نے خرقہ شریف ہوا میں لہرایا تو اس کی وجہ سے اس موذی وبا سے نجات ملی۔

گل مینہ کو مایوسی ہوئی کہ وہ خرقہ نہیں دیکھ پائی۔ البتہ اس نے درگاہ کی دیوار کو باہر ہی ہاتھ لگا کر جتنی دعائیں یاد تھیں پڑھ ڈالیں۔

زرجانان اسے چند گلیاں گھما کر شاہ خانم بازار لے گیا جہاں عورتوں کی چیزیں ملتی تھیں۔ اس بازار کی تنگ گلیوں میں بنی دکانیں دن کے وقت بھی بجلی کے موٹے موٹے بلبوں سے خوب روشن تھیں اور سامان سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ گل مینہ نے اپنی پسند کی کئی چیزیں خریدیں، پراندے، کریمیں، سرخی، بالیاں، ایک شال، ایڑی والے لال رنگ کے جوتے، دو جوڑے کپڑے، ایک ہلکے گلابی رنگ کا اور دوسرا سفید پھولوں والا جس کی زمین آسمانی تھی۔ یہ وہ

رنگ تھا جس کے بارے میں زرجانان کہا کرتا تھا کہ یہ اس کا سب سے پسندیدہ رنگ ہے کیوں کہ یہ گل مینہ کی آنکھوں کا رنگ ہے۔

اس دن گل مینہ نے ایک اور کام زندگی میں پہلی بار کیا۔ کسی ہوٹل میں کھانا کھانا۔ زرجانان نے تکے اور پلاؤ اتنے منگوا لیے تھے کہ ان سے آدھے بھی نہیں کھائے جا سکے اور وہ انھیں ساتھ باندھ کر گھر لے آئے۔

اس دن گل مینہ کو اپنی زندگی مکمل ہوتی ہوئی دکھائی دی تھی۔ چاہنے والا خاوند، اپنا گھر، اپنی مرضی، جس میں نہ کسی ساس نند کے طنز طعنے تھے، نہ کسی سسر دیور کی روک ٹوک۔ اور اب تو چند دنوں سے اسے اپنے وجود کے اندر ایک اور وجود کی ہلکی ہلکی کروٹیں بھی محسوس ہونے لگی تھیں۔

وہ دعا مانگا کرتی تھی، خدایا، تو نے اتنی کالی راتوں کے بعد جو سکھ کی کرنیں دی ہیں، انھیں ایسے ہی چمکتا دمکتا رکھنا، ان پر کبھی دکھ کا کالا سایہ نہ پڑنے دینا۔

Scanned with CamScanner

18

نیاز بین نے بڑی احتیاط سے پکٹیں قائم کیں اور خود مسلسل دوربین لگا کر درختوں کے اندر کسی قسم کی نقل و حرکت کا سراغ چلانے کی کوشش کرتا لیکن موئی نیکہ تک قبائلی جتھے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ جہاز شاید آج دوبارہ نہیں آسکتا تھا کہ انھیں لشکر کی تازہ ترین پیش رفت سے آگاہ کرتا۔ وہ بنوں سے اڑا تھا۔ وہاں واپس پہنچنے اور ایندھن بھروانے کے بعد اتنا وقت نہ بچتا کہ جہاز دن کی روشنی میں واپس بنوں پہنچ سکتا۔ آج کل دن ویسے بھی بہت چھوٹے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے شام ہو جاتی تھی۔

جب لشکر موئی نیکہ پہنچا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ گاؤں کی تمام آبادی پہلے ہی وہاں سے کوچ کر چکی تھی۔ سنسان گلیوں میں کہیں کہیں کتے ادھر ادھر بلاوجہ گھوم پھر رہے تھے۔ انھوں نے لشکر کو آتے دیکھ کر باجماعت بھونکنا شروع کر دیا۔

یہ گاؤں وانہ سے افغانستان کے قصبے شکین کو جانے والی سڑک پر قائم تھا۔ قصبے کے ایک طرف افغانستان اور ہندوستان کی سرحدی لکیر گزرتی تھی جو آج سے ستائیس سال قبل ڈیورنڈ نامی انگریز افسر نے افغانستان کے امیر کے ساتھ مل کر قبائلی علاقوں پر کھینچی تھی، اور جسے قبائلی پشتون قوم کو تقسیم کرنے کی سازش قرار دیتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف دس پندرہ دکانیں تھیں، جن کے پیچھے گھر تھے۔ سڑک کے بائیں طرف ایک چھوٹے سے ٹیلے پر موئی نیکہ کی مسجد تھی جس کے صحن سے سارا بازار نظر آتا تھا۔ مسجد سے چند گز دور سڑک کے کنارے پر ملک جم خان کا مکان تھا جس کا تین منزلہ برج دور سے نظر آتا تھا اور گاؤں کی مرکزی نشانی کا فریضہ سرانجام دیتا تھا۔

کرنل رسل نے گاؤں کے قریب ایک کھلے میدان میں کیمپ لگانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے چاروں طرف حفاظتی پکٹیں قائم کیں، اور ایک بار پھر خاص توجہ مشرق کی جانب سے آتے ہوئے

لشکر کے ممکنہ راستوں پر مرکوز کی گئی اور دونوں وکرمشین گنیں کھول کر ان کا رخ مشرق کی طرف کر دیا گیا۔ لڑائی کی صورت میں یہ گنیں ایک منٹ میں سینکڑوں گولیاں داغنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ کیمپ کے چاروں طرف خاردار تار کے بنڈل بچھائے گئے۔ نیاز بین تقریباً ساری رات جاگتا رہا۔ کیا پتہ قبائلی لشکر وانہ کی طرف چلا گیا ہو اور شاید وہاں حملے کی تیاری کر رہا ہو؟ لیکن وانہ کا قلعہ خاصا مضبوط تھا اور ڈیڑھ دو سو کا لشکر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

صبح اٹھ کر کرنل نے سیپرز کے یونٹ کو حکم دیا کہ وہ اپنے کام میں جٹ جائیں۔ سیپر عام طور پر پل اور سڑکیں بنانے، مورچے کھودنے اور اس قسم کے دوسرے کام سرانجام دیا کرتے تھے، لیکن آج انھیں تعمیر کی بجائے تخریب سونپی گئی تھی۔ انھوں نے ابتدا ملک جم خان کے بڑے برج سے کی۔ یہ برج تین منزلہ تھا۔ پہلی منزل بیس ضرب بیس فٹ سے کم نہیں ہو گی، جب کہ اوپری منزلیں بتدریج چھوٹی بنائی گئی تھیں اور ان میں کوئی کھڑکی کوئی دریچہ نہیں تھا البتہ دیوار میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے چھ انچ چوڑے اور ایک فٹ لمبے روزن ضرور بنے ہوئے تھے۔ پہلی منزل کا دروازہ زمین سے کم از کم دس فٹ اونچا تھا۔ اس پر سیڑھی لگا کر ہی چڑھا جا سکتا تھا اور بعد میں یہ سیڑھی اندر کھینچ لی جاتی ہو گی۔ چھت پر بھی تین تین فٹ کی کچی مٹی کے کنگوروں والی دیوار تھی جس کے پیچھے بیٹھ کر گولی چلائی جا سکتی تھی۔ دیوار کے اوپر غالباً آرائش کے لیے ایک درجن کے قریب ان پھٹے بم رکھے ہوئے تھے۔

سیپروں نے برج کی دیوار کے نیچے چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود کر ان میں بارود بھرا اور پھر ان میں سے ایک لمبا فلیتہ گزار دیا۔ ایک سیپر نے اسے آگ دکھائی اور اس سمیت سبھی بھاگ کر ایک گلی کی اوٹ میں ہو گئے۔ نچلی منزل فوراً زمیں بوس ہو گئی، جب کہ اوپری منزلیں ایک ثانیے کے لیے جیسے گومگو کے عالم میں رہیں، پھر وہ بھی دھڑام سے نیچے آ رہیں۔ گورکھوں نے نعرے بلند کیے، لیکن جب دھول کے مرغولے نے انھیں لپیٹ میں لے لیا تو وہ بھتنے بن کر پیچھے بھاگے۔ چند دن پہلے وزیروں نے گورکھا سپاہیوں کو قتل کر کے حسب عادت لاشوں کا مثلہ کیا تھا

Scanned with CamScanner

جس کا انھیں بہت رنج تھا اور وہ بدلہ لینے کے لیے بے تاب تھے۔

لیفٹیننٹ سٹینلی بڑے اشتیاق سے اندر کا ماحول دیکھنے کے لیے گھروں میں داخل ہوتا تھا۔ وہاں مٹی کے دو تین برتنوں، چند پیڑھیوں یا چوکیوں اور ایک آدھ میلی کچیلی تو شک یا لحاف کے سوا کچھ نہیں تھا۔ البتہ ہر گھر میں جس چیز کی کثرت پائی جاتی تھی وہ تھے پسّو۔ جو بھی جاتا تھا، وہ پسوؤں سے لدا پھندا واپس لوٹتا تھا۔

گورکھوں کے ایک دستے نے ایک اونچی دیوار کو کندھا لگا کر ہاؤ ہو، ہاؤ ہو کر کے گرانے کی کوشش کی، مٹی کی دیوار تھوڑا ہلتی تھی لیکن پھر واپس اپنی جگہ پر آ جاتی تھی۔ دیوار سے ہار مان کر پیچھے ہٹنا شکست کے اعتراف کے مترادف تھا، اس لیے گورکھے ڈٹے رہے۔ آخر آدھے گھنٹے کی مشقت کے بعد دیوار گر تو گئی لیکن پورا دستہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔

اس تجربے کی روشنی میں کرنل رسل نے حکم دیا کہ دیواریں گرانے کی بجائے گھروں کو آگ لگا دی جائے۔ بارود اتنا نہیں تھا کہ تمام گاؤں کے لیے کافی ہوتا۔ حکم کی تعمیل ہوئی لیکن آگ جل کر تھوڑی دیر بعد بجھ جاتی تھی۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ ہر گھر کی چھت میں کدالوں سے سوراخ کیا جائے تا کہ شعلوں کو بھڑکانے کے لیے ہوا اندر آتی رہے۔ پھر گھروں کے اندر موجود تمام جلنے کے قابل چیزیں ڈھیر کر کے ان کو آگ لگا دی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ گھر اگر مکمل خاکستر نہ بھی ہو تو کم از کم رہائش کے قابل نہ رہے۔

لیفٹیننٹ سٹینلی پر پسو تین چار بار یلغار کر چکے تھے اس لیے اب وہ گھروں کے اندر گھسنے کا خیال ترک کر کے ایک طرف کھڑا ہو کر پائپ سلگانے لگا۔ جب اس نے پاس سے نیاز بین کو گزرتے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ 'ایک بات تو بتاؤ نیاز بین، تمھیں افسوس نہیں ہوا کہ تمھارا گاؤں ڈھایا جا رہا ہے؟'

نیاز بین جواب دینے سے پہلے تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ 'سر اگر میں کہوں کہ افسوس نہیں ہے تو جھوٹ ہو گا، آخر انھی گلیوں میں میرا بچپن اور جوانی گزرے ہیں، یہ سارے گھر میرے

عزیزوں، دوستوں اور رشتے داروں کے ہیں، ان کی تباہی سے دکھ تو ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ اطمینان بھی ہے کہ میں اپنا پورا محلہ بچانے میں کامیاب رہا ہوں، میں نے یہاں آنے سے پہلے مرتضیٰ ہی میں کرنل رسل سے خاص طور پر درخواست کی تھی کہ وہ میرے محلے کے گھروں کو نہیں گرائیں گے اور انھوں نے اسے قبول کر لیا تھا۔ اگر میں نہ آتا تو گاؤں تو ویسے ہی مسمار کر لیا جاتا، ساتھ میں میرا محلہ بھی تباہ ہو جاتا۔'

'لوگوں کو اپنے گھروں کی مرمت کرنے میں کتنی دیر لگے گی؟'

'سر، چھتوں کی لکڑی آدھی جل گئی ہے، دیواریں سلامت ہیں۔ اس کے علاوہ دروازے وغیرہ جلے ہیں۔ تو یہ پیچھے جنگل ہے، یہ لوگ وہاں سے درخت کاٹ لائیں گے اور دوبارہ بنا دیں گے۔'

'خود سارا کام کر لیں گے یا ترکھان وغیرہ کی خدمات حاصل کریں گے؟'

'چھت کے لیے شہتیر بنانے کے لیے تو ترکھان کی ضرورت نہیں ہے، ہر گھر میں کلھاڑیاں ہوتی ہیں، انھی سے درخت کی شاخیں صاف کر کے انھیں چھت پر لگا دیں گے اور اوپر سے مٹی ڈال دیں گے۔ چھتوں کے کناروں پر جھاڑیاں کاٹ کر ڈال دیں گے۔ دروازے بنانے کے لیے البتہ ترکھان چاہیے ہو گا۔'

'اور وہ ایک دروازے کے کتنے پیسے لے گا؟'

'پیسے نہیں لے گا سر، اسے ہر فصل میں سے حصہ ملتا ہے۔ لیکن یہ کام بہت زیادہ ہو گا، اس لیے ہو سکتا ہے آس پاس کے گاؤں کے ترکھانوں کو بھی بلانا پڑے۔'

'تو اس وقت یہ لوگ کہاں ہیں؟'

'میں خود تو گاؤں میں نہیں تھا، اس لیے مجھے صحیح پتہ نہیں ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ دوسرے دیہات میں اپنے رشتے داروں کے پاس چلے گئے ہوں گے، پھر جنگلوں میں غار ہیں، کچھ لوگ وہاں گئے ہوں گے۔'

Scanned with CamScanner

'اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک دو مہینے کے اندر اندر سب کچھ ایسا ہو جائے گا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں؟'

'میرے خیال میں سر۔'

'تو پھر اتنی مشقت کا فائدہ کیا ہوا؟'

'کیا کہہ سکتے ہیں سر۔'

'ہم م م،' لیفٹیننٹ سٹینلی سوچ میں پڑ گیا، 'یہ حکم بہت اوپر سے آیا تھا کہ موسیٰ نیکہ والوں کو سبق سکھانا ہے۔ سرکار کا خیال ہے کہ کئی میل دور سے درخت کاٹ کر لانا، چیرنا، سکھانا، نیا گھر بنانا، وغیرہ جیسی الجھنوں کی وجہ سے سرکش قبائلی لمبے عرصے تک سرگرداں رہیں گے اور آئندہ حکومت کی حکم عدولی کرتے وقت سو بار سوچیں گے۔ دوسرا یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ہو سکتا ہے بعض لوگ بددل ہو کر یہ جگہ ہی چھوڑ دیں اور کہیں اور جا بسیں گے اور ان سے سرکار کو چھٹکارا مل جائے گا۔'

نیاز بین نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن دل میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریز بہت عقل مند ہے لیکن دوسری طرف وہ ایسے کام بھی کر جاتا ہے کہ انسان سر کھجاتا رہ جاتا ہے اور کوئی تک سمجھ میں نہیں آتی۔ اب اسی بات کو دیکھو کہ موسیٰ نیکہ گاؤں کے ذمے ساڑھے تین سو روپے واجب الادا تھے، جو اس نے انگریز سرکار کو ادا نہیں کیے یا ادا نہیں کر سکا۔ ان ساڑھے تین سو کی وجہ سے انگریز جو لاؤ لشکر لے کر چڑھائی کرنے آیا ہے اس پر کم از کم سو گنا زیادہ خرچ تو ضرور اٹھا ہوگا، اور خدانخواستہ اگر قبائلیوں نے حملہ کر دیا تو پھر کل لاگت بڑے آرام سے لاکھ سے اوپر چلی جائے گی، جو جانی نقصان ہوگا وہ الگ۔ اور جہاں تک سبق سکھانے کی بات ہے، اس سے لوگوں کے دلوں میں حکومت کے خلاف نفرت مزید گہری ہو جائے گی۔

جاتے جاتے ایک اور کام رہ گیا تھا، اور وہ تھا کھیتوں کی تباہی۔ اس علاقے میں زیادہ تر کھیت پہاڑ کی ڈھلوان پر قائم تھے، جن کے بنے پتھروں کی بھدی دیواروں سے بنائے گئے

تھے۔ اگر ان دیواروں کا کلیدی پتھر نکال دیا جائے تو پوری دیوار ایک ہی ہلے میں زمین پر آ رہتی تھی۔ اس کام میں گورکھے بہت ماہر تھے کیوں کہ خود ان کے کھیت بھی اسی قسم کی تکنیک سے بنتے تھے۔ وہ کدالیں لے کر آ گئے اور کلیدی پتھر اکھاڑنے لگے۔ ہندوستانی سپاہی بڑی دلچسپی سے کھڑے ہو کر یہ کارروائی دیکھتے رہے اور انھوں نے بہت جلدی کلیدی پتھر کی شناخت اور اسے اکھاڑنے کا طریقہ سیکھ لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے گاؤں کے کھیت وہ منظر پیش کرنے لگے جیسے اکتایا ہوا بچہ ہاتھ مار کر مٹی سے بنے گھروندے درہم برہم کر دیتا ہے۔

ابھی گاؤں کے شمال کی طرف کچھ کھیت باقی تھے کہ پہلا چھینٹا پڑا۔ دوپہر کے بعد ہی سے بادلوں کا رنگ گہرا ہونا شروع ہو گیا تھا، جو عصر کے بعد سیاہی مائل ہو گیا۔ میجر رسل نے سارا کام ختم کر کے دستوں کو کیمپ پہنچنے کا حکم صادر کر دیا۔

یہ لشکر کی موسیٰ نیکہ میں دوسری رات تھی۔ اندھیرا اتنی تیزی سے پھیلا کہ جیسے دن شام کا انتظار کیے بغیر ہی یک لخت رات میں ڈھل گیا ہو۔ اندھیرا بڑھنے کے ساتھ ساتھ بارش کا سلسلہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔ بیچ بیچ میں برف کے گالے بھی ہوا میں اڑتے ہوئے آتے تھے لیکن بارش کے قطرے انھیں زمین پر جمنے نہیں دیتے تھے۔ رات کو نوبت یہاں تک پہنچی کہ پانی خیموں کے اندر گھس آیا۔ کچھ سپاہیوں نے گاؤں کے بچے کھچے گھروں میں پناہ لینے کی کوشش کی لیکن ایک تو ادھڑی ہوئی چھتوں کی وجہ سے وہاں بھی پانی سے نجات نہیں تھی، دوسرے ادھ جلے گھروں کے اندر پسوؤں کی فوج ابھی تک تازہ دم تھی، جس نے وہ تابڑ توڑ حملے کیے کہ انگریزی فوج کو گاؤں سے دم دبا کر واپس کیمپ کی جانب پسپا ہوتے ہی بنی۔

نیاز بین کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے خیمے میں گھٹنوں تک پانی بھر آیا اور بستر، تکیہ اور کمبل اس میں تیرنے لگے۔ وہ وردی اور سویٹر پہن کر لیٹا تھا جس کا ایک دھاگہ بھی اب خشک نہیں رہا تھا۔ ہوا کا شور اتنا زیادہ تھا جیسے سو ہوائی جہاز عین سر کے اوپر پوری رفتار سے اڑے چلے جا رہے ہوں۔ اس نے بڑی مشکل سے اندھیرے میں ہاتھ مار کر اپنی برساتی ڈھونڈی اور اسے

اوڑھ کر سردی سے کانپتا ساتھ والے خیمے میں داخل ہو گیا جہاں سے روشنی آ رہی تھی۔ وہاں گورکھا سپاہیوں کا ایک پورا یونٹ لالٹین جلائے باہر کے موسم سے بے نیاز خرمستیوں میں مصروف تھا۔ ایک گورکھا خانساماں رم کے پیپے میں سے مگ بھر بھر کر سپاہیوں کو دے رہا تھا جو اسے غٹاغٹ چڑھا کر ناچنے کودتے، خیمے کے فرش پر کھڑے پانی میں چھپاکے لگاتے اور پھر گھوم کر دوسرے مگ کے لیے پیپے کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ نیاز بین کو دیکھ کر ایک گورکھے نے اس کے بیٹھنے کے لیے کارتوسوں کی ایک پیٹی اس کی طرف کھسکا دی۔ ساقی گری کے فرائض انجام دینے والے خانسامے نے ایک مگ اس کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ نیاز بین نے مسکرا کر اس پیش کش کو ٹھکرانے کے لیے گردن ہلائی ہی تھی کہ ایک دہکتی ہوئی سلاخ اس کے کندھے میں داخل ہو کر دوسری طرف گزر گئی۔ وہ اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔ گورکھوں کو صورتِ حال سمجھنے میں تھوڑی دیر لگی اور وہ تڑتڑ فائرنگ کے آوازوں کے ساتھ ساتھ کٹے ہوئے درختوں کی طرح زمین پر ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر ہوتے گئے۔ ایک گولی لالٹین کو بھی آ لگی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

رات کسی وقت نیاز بین کو ہوش آیا تو اجالا ہو گیا تھا۔ اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ کندھے میں تیز ٹیس کے علاوہ اسے اپنے جسم پر منوں بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے بائیں ہاتھ کی مدد سے اپنے جسم پر ڈھیر دو تین گورکھوں کو دھکیل کر اوپر سے ہٹایا۔ اس مشقت سے اس کا بدن پسینے پسینے ہو گیا۔ پاس سے باتوں کی آواز آئی تو اس نے چیخ کر انھیں اپنی جانب متوجہ کیا۔

ہسپتال کیمپ کے ایک کونے میں ٹیلے کے اوپر قائم تھا۔ نیچے کیمپ کا وہ عالم تھا جیسے یہاں رات بھر ہاتھیوں کا غول غل مچاتا رہا ہو۔ دو ڈھائی سو خیموں میں سے شاید ہی کوئی اپنے قدموں پر کھڑا ہو۔ جدھر دیکھو، سپاہی سٹریچروں پر کراہتے ہوئے زخمیوں کو ہسپتال کی طرف لا لا کر زمین پر رکھے جا رہے تھے۔ نیاز بین کی باری آتے آتے دوپہر ہو گئی۔ اب سورج بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور نیاز بین کو اپنے چہرے پر دھوپ بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر وائٹر نے نیاز بین کے

زخم پر دوا لگا کر پٹی باندھ دی اور گلے میں ایک اور پٹی باندھ کر دائیں بازو اس میں لٹکا دیا۔ میجر رسل ہسپتال آیا تو اس سے نیاز بین کو پتہ چلا کہ انگریزی فوج کی ہلاکتوں کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے، جب کہ کم از کم تین سو زخمی ہیں۔ مرنے والوں میں ولایت سے نووارد، زندگی کی تمازت سے بھرپور لیفٹیننٹ سٹیفلی بھی شامل تھا۔

Scanned with CamScanner

19

نئی لاری کے پیچھے مچان پر کھڑے شفیق رنگساز نے برش سفید روبیا لیک کے ڈبے میں ڈبو کر اٹھایا اور پھل کو ڈبے کے کنارے کے ساتھ ہلکا سا دبا دیا تا کہ فالتو رنگ نچڑ جائے۔ پھر اس نے برش اٹھا کر براق کی طرح سفید گھوڑے کی جھالر نما دم پر خط لگایا۔ اس کی مشق اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اب اسے کسی قسم کی ڈرائنگ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ بابو پینٹر کی ورکشاپ پر جو کام دوسرے پینٹر گھنٹوں مشقت کر کے پنسل سے خاکے بنا بنا کر ان کے اندر رنگ بھرتے تھے، وہی کام شفیق دس منٹ میں کر دیتا تھا۔ قریب سے دیکھنے پر تصویر کھردری لگتی تھی، تاہم جب بیس پچیس فٹ کے فاصلے سے دیکھا جائے تو نقش ابھر کر یوں سامنے آجاتے تھے جیسے کیمرے سے فوٹو لے کر ڈالے پر چپکا دی گئی ہو۔

شفیق رنگساز نے مچان پر تھوڑا پیچھے ہٹ کر ڈالے پر اب تک بنے منظر کا جائزہ لیا۔ ایک طرف گہری نیلی جھیل، اس میں سفید بادبان والی ننھی سی کشتی، جھیل کے پیچھے برف پوش پہاڑیاں جن کا عکس جھیل کے پرسکون پانی میں جھلملاتا تھا۔ دوسری طرف سبزہ زار اور اس کے اندر سفید گھوڑا۔ اس کے ہاتھ اور کپڑے قسما قسم کے رنگوں میں لتھڑے ہوئے تھے۔ یہ لاری 'سمندری' انداز میں رنگی جاتی تھی۔ گاڑی کا ڈرائیور چکوال کی طرف کا تھا اور اس علاقے کے لوگ سمندری انداز کو زیادہ تر پسند کرتے تھے جس میں گاڑھے رنگوں اور چھوٹے چھوٹے شوخ و شنگ بیل بوٹوں پر زیادہ تر توجہ دی جاتی تھی جو گاڑی کے ہر مربع انچ کو کھچا کھچ بھر دیتے تھے۔

چکوال کا یہ ڈرائیور سلطان استاد اس کا بیس سال پرانا دوست تھا اور اس کی خاص فرمائش تھی کہ ڈالے پر ایسا سفید گھوڑا بنایا جائے کہ اسے دیکھ کر سڑک کے کنارے چلتی گھوڑیاں راستہ بھٹک جائیں۔ اس کی خوشی کے لیے شفیق نے گھوڑے پر خاصی محنت کی تھی اور اسے یقین تھا

کہ سلطان استاد اسے دیکھ کر راستہ نہ بھٹکے لیکن خوشی سے جھوم ضرور اٹھے گا۔ اسی مقصد کے لیے شفیق نے اپنے کسی شاگرد کو گھوڑے کے قریب پھٹکنے سے منع کر دیا تھا تا کہ وہ اسے خراب نہ کر دیں۔

شفیق رنگساز سارے لاری اڈے کا ماہر کاریگر سمجھا جاتا تھا۔ وہ بابو پینٹر کی ورکشاپ میں ٹرکوں پر گل بوٹے بنانے کا ماہر ہوا پینٹر تھا، اور ڈرائیور خاص طور پر فرمائش کر کے اس سے اپنے ٹرکوں پر دل پسند مناظر، قومی ہیروؤں، اور فلمی ایکٹرسوں کی تصاویر بنوایا کرتے تھے۔

شفیق نے جب بابو پینٹر سے کام سیکھا تو اس وقت ٹرکوں کے ڈالے پر مسرت شاہین کی تصویر بنانے کا بڑا فیشن تھا۔ صوبہ سرحد، خاص طور پر جنوبی اضلاع کے ہر دوسرے تیسرے ٹرک کے پیچھے پشتو فلموں کی اس توبہ شکن اداکارہ کی ایک مخصوص پوز میں بنائی ہوئی تصویر ملتی تھی جسے دیکھ کر شیر خوار بچے ہمک اٹھتے تھے۔ شفیق کا ہاتھ اس تصویر پر اس قدر رواں ہو گیا تھا کہ بعد میں سری دیوی یا مادھوری کی تصویر بناتے ہوئے بھی نادانستہ طور پر مسرت شاہین کے خدوخال اور ڈیل ڈول کا عکس آجاتا تھا۔

لیکن پچھلے چند برسوں میں شفیق نے ٹرکوں کے ڈالے پر مسرت شاہین چھوڑ، کسی بھی انسان کی تصویر بنانے سے توبہ کر لی تھی۔ اب حالات یہ تھے کہ نہ صرف مسرت شاہین بلکہ کسی بھی دوسری اداکارہ کی تصویر کی مانگ قریب قریب ختم ہو گئی تھی۔ ڈرائیور خود بھی ٹرکوں پر تصاویر بنوانے سے کتراتے تھے۔ اب ان کی خواہش ہوتی تھی کہ ڈالے پر کوئی جنت نظیر قسم کی سینری بنوائی جائے۔ شفیق اب تک سینکڑوں ٹرکوں پر اس قسم کی سینریاں بنا چکا تھا۔ ان سینریوں کے عناصرِ ترکیبی لگ بھگ ایک جیسے ہی ہوا کرتے تھے۔ ایک طرف برف سے ڈھکی ہوئی مخروطی چوٹیاں (یہاں شفیق کا اداکاراؤں کی پرشباب تصاویر بنانے کا تجربہ کام آیا)، پہاڑ کے دامن میں ایک فیروزی جھیل جس میں راج ہنس سر نیوڑائے تیر رہے ہیں، جھیل کے کنارے بل کھاتی ہوئی سڑک اور سڑک کے اختتام پر درختوں کے جھنڈ میں گھرا ہوا چھوٹا سا مکان۔

لیکن شفیق کے دل میں پھر بھی کبھی کبھی پورٹریٹ بنانے کی ہڑک اٹھتی تھی۔ اس کا حل

Scanned with CamScanner

اس نے یہ نکالا تھا کہ وہ جمعے کے دن اپنے گھر میں اپنے بیٹے ارسلان اور بیٹی شائستہ کی تصویریں بنا کر دل کی بھڑاس نکال لیتا تھا۔ شفیق کے پاس درجنوں اپنے بچوں کی مختلف عمروں میں بنائی گئی ایک درجن کے لگ بھگ تصاویر جمع ہو گئی تھیں جنھیں وہ لحافوں والے بکسے میں چھپا رکھتا تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں اس نے اپنی بیوی عائشہ کی پورٹریٹ بھی بنائی تھی لیکن اس میں بے محابا 'مسرت شاہینیت' دیکھتے ہی وہ اس قدر شرمائی کہ جلدی سے گیلے روغن کو کپڑے سے رگڑ کر تصویر ہی مسخ کر دی۔ اس واقعے کے بعد عائشہ نے اس کے لیے ماڈل بننے سے توبہ کر لی تھی۔

شفیق نے ڈالے کا جائزہ لیتے لیتے زیرِ لب اپنے شاگرد شکیل عرف شاکے کو بہن کی گالی دی جس نے رنگ بناتے وقت اس کی ہدایت کے برخلاف نیلے رنگ کو فیروزی کے قریب رکھنے کی بجائے کپڑوں کی دھلائی میں استعمال ہونے والے نیل جیسا گہرا کر دیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ شاکے کو بلا کو دو چار بالشافہ گالیوں سے بھی نوازے جو اس وقت ٹرک کی سائیڈ میں پیلے رنگ کا سپرے کر رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہناتا، اسی دوران نیچے سے آواز آئی، 'شفیق استاد تمھی ہو؟'

شفیق نے ڈالے کا ہینڈل پکڑ کر نیچے دیکھا۔ مچان کے قریب ایک شخص کھڑا تھا جس کی عمر تیس بتیس کے قریب ہو گی۔ اس نے سفید ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ 'جی، میں ہی ہوں،' شفیق نے کہا۔ وہ تھوڑا گڑبڑا گیا تھا کہ کہیں کوئی مصیبت نہ آ جائے، ویسے یہ بندہ شکل سے خطرناک معلوم نہیں ہوتا تھا۔

'ذرا نیچے اترو، ضروری کام ہے۔' اس نے ادھر ادھر دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہا: 'امریکی سفیر نے تمھارے کام کی تعریفیں سنی ہیں۔ وہ سفارت خانے میں تم سے ایک دیوار پر رنگ کروانا چاہتا ہے۔ منھ مانگے پیسے ملیں گے۔'

شفیق یہ سن کر چونک گیا۔ پچھلے برس ایک جاپانی سفارت کار بابو پینٹر کو اپنے ساتھ اسلام آباد اپنے گھر لے گیا تھا اور ایک دروازے اور کچھ کھڑکیوں اور صراحیوں پر اس سے ٹرک

آرٹ کی طرز کا رنگ کروایا تھا۔ اگرچہ بابو نے اسے خود نہیں بتایا لیکن ایک شاگرد کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس چھوٹے سے کام کے اسے پورے دو لاکھ روپے ملے تھے۔ شفیق کو بابو سے شکایت تھی کہ وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لے گیا حالانکہ خود بابو کئی بار یہ بات کہہ چکا تھا کہ شفیق پورے شہر کا مانا ہوا پینٹر ہے۔ شفیق نے رنگ اور برش تختے پر رکھ دیے اور ڈالے کے کنڈے پکڑ کر نیچے اتر آیا۔

تھوڑی دیر میں شفیق ایک سفید ٹویوٹا کرولا کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا اڈے کی معروف سڑک عبور کر کے شہر کے مغرب کی سمت روانہ تھا۔ اس نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے اگلا دروازہ بند ہی رکھا اور شفیق کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بابو پینٹر اس وقت ورکشاپ میں موجود نہیں تھا۔ اس نے شاکے کو اصل بات بتائے بغیر سر میں شدید درد کا بہانہ کر کہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر آرام کرنے گھر جا رہا ہے، 'بابو کو بتا دینا کہ عصر تک طبیعت سنبھل گئی تو واپس آ جاؤں گا، ورنہ پھر کل صبح ہی ملاقات ہو گی۔' اگر بابو اپنے ماہر کاریگر کو الگ رکھ کر اکیلے ہی سارے پیسے ہڑپ کر سکتا ہے تو اب موقع ہے کہ اس سے بدلہ لیا جائے۔ ویسے بھی شفیق اب اپنا کام شروع کرنا چاہتا تھا تاکہ بابو کی روز روز کی بک بک سے جان چھوٹ جائے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اگر بابو کو ایک چھوٹے سے کام کے دو لاکھ مل سکتے ہیں تو یہ امریکی اسے پوری دیوار کو رنگنے کے چار پانچ لاکھ تو ضرور دے گا۔ پھر وہ اس قابل ہو جائے گا کہ اپنی الگ دکان کھول سکے تاکہ اس کی محنت کی کمائی بابو کی جیب میں جانے کی بجائے خود اس کے ہاتھوں میں آئے۔ بلکہ اسی احاطے کے کونے میں ٹائروں والا دکان خالی کر رہا ہے، اگر پانچ لاکھ مل جائیں تو اس کی پگڑی اور ایڈوانس دے کر بھی اتنے پیسے بچ جائیں گے کہ دکان کا سامان آرام سے آ جائے گا۔ شاکا تو بغیر کہے ہوئے اس کے ساتھ آ جائے گا۔

گاڑی سبزی منڈی کے قریب سے گزرنے لگی۔ یہاں سڑک بری طرح سے ٹوٹی پھوٹی تھی اور ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار خاصی آہستہ رکھی تھی۔ منڈی سے تھوڑا آگے جا کر اس نے گاڑی کنارے پر روک دی اور دو مرد دائیں بائیں دروازے کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ شفیق کو

Scanned with CamScanner

سرک کر سیٹ کے بیچ میں ہونا پڑا۔ ڈرائیور نے ریڈیو چلا دیا جس میں بلند آواز میں کوئی ڈسکو گانا بج رہا تھا۔ شفیق کو اس قسم کی موسیقی سے سخت نفرت تھی، وہ کمیش کی آواز کی دیوانہ تھا اور یہ نئی موسیقی اسے بے ہنگم شور کی طرح لگتی تھی۔ اسے تھوڑی حیرت بھی ہوئی کہ اتنی بلند آواز میں اس قسم کے بے ہودہ گانے کون برداشت کر سکتا ہے، لیکن ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے بٹن دبا کر آواز مزید تیز کر دی اور گاڑی کے شیشے بھی چڑھا دیے، حالانکہ تیز دھوپ کی وجہ سے اتنی زیادہ ٹھنڈ نہیں تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کچھ کہا۔ شفیق کے دائیں بیٹھے ہوئے شخص نے شفیق کو زور سے دھکا دے کر دوسرے کی گود میں ڈال دیا اور اس کے منہ کو اپنے کندھے پر پڑی موٹی چادر سے ڈھک دیا۔ شفیق نے حواس باختہ ہو کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن یہ حملہ اتنا اچانک اور ان دونوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ معمولی ہلنے جلنے اور ٹانگیں ہلانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اس دوران اس نے اپنے کولھے پر سوئی کی چبھن محسوس کی۔ دونوں مرد پورا زور ڈال کر اسے دبائے ہوئے بیٹھے رہے۔ شفیق کا ذہن تاریک دلدل میں ڈوبتا چلا گیا۔

20

دروازے پر زرجانان کی مخصوص دستک ہوئی۔ گل مینہ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

'اتنی جلدی آ گئے؟ پھر راستے میں لڑائی ہو رہی ہے؟ صبح میں نے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔'

'ہاں، لڑائی ہی لڑائی۔ سواریوں کا نام و نشان نہیں۔ سب ڈرائیور گاڑیاں بند کر کے گھروں کو چلے گئے۔'

چھ ماہ کا فتح خان چولھے کے پاس گدیلے پر لیٹا ٹکٹکاریاں مار رہا تھا۔ زرجانان نے اسے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے موٹے موٹے لال گالوں پر چٹاخ سے بوسہ دے کر اسے ہوا میں اچھال دیا۔

'نہیں نہیں، مت اچھالو، ابھی ابھی کھچڑی کھلائی ہے اس کو۔ سب کچھ باہر آ جائے گا، ادھر مجھے دو، اسے نیند آ رہی ہے۔' گل مینہ نے فتح خان کو اپنے کندھے سے لگا لیا اور اس کی کمر تھپک کر اسے سلانے کی کوشش کرنے لگی۔ 'کیا مطلب اڈا بند ہو گیا؟' گل مینہ نے کہا۔ 'چھوٹی موٹی جھڑپیں تو روز ہوتی رہتی ہیں، لیکن زندگی کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔'

'نہیں بھئی، چھوٹی موٹی جھڑپ کی بات نہیں ہے۔ میں نے تمھیں بتایا تھا نا قندھار کے طالبان کا۔ وہ یہاں بھی آ گئے ہیں اور انھوں نے آتے ہی شہر پر قبضہ کر کے یہاں بھی اسلامی حکومت نافذ کر دی ہے۔'

'ہاں، میں خود بہت پریشان تھی۔ صبح سے تاخ تڑاخ جاری ہے۔ محلے کی عورتیں بھی یہی باتیں کر رہی ہیں۔ وہ قصائیوں والی مائی گھنٹہ پہلے اٹھ کر گئی ہے۔ خواڑہ بھی آ گئی تھی۔ طرح طرح کی باتیں بتائی ہیں ان دونوں نے۔ تم کہاں تھے فائرنگ کے وقت؟'

'میں تو اڈے میں تھا، فائرنگ سردار موسیٰ خان کی حویلی کی طرف ہوئی تھی۔ طالبان کی

Scanned with CamScanner

گاڑیاں منہ اندھیرے ارغنداب میں داخل ہوئیں تو اس نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تھی۔ بے وقوف آدمی۔ کل پندرہ منٹ گولی چلی ہوگی۔ پھر اس کا ہر پالتو غنڈا بندوق پھینک کر جدھر منہ اٹھا، ادھر بھاگ کھڑا ہوا۔ موسیٰ خان کا بھی کوئی پتہ نہیں کہاں گیا۔'

'مائی کہہ رہی تھی کہ وہ بڑے ظالم ہیں۔ بھرے بازار میں لوگوں کی پٹائی کرتے ہیں، عورتوں کو برقعے کے بغیر باہر نکلنے نہیں دیتے۔ جو عورت بے پردہ نظر آئے اسے لاٹھیوں سے پیٹتے۔ زرجانان، مجھے تو ڈر لگتا ہے، اب کیا ہوگا؟'

'ارے بھئی، ڈر کس بات کا؟ طالبان کے آنے سے تمھیں کیا فرق پڑتا ہے، تم تو ویسے بھی برقعے کے بغیر باہر نہیں نکلتیں۔ دوسری بات یہ انھیں ارغنداب میں آئے ہوئے صرف چند گھنٹے ہوئے ہیں لیکن اس دوران انھوں نے کئی اچھے کام بھی کیے ہیں۔'

'وہ کیا؟'

'سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ سڑکیں کھول دی ہیں۔ سرداروں کے غنڈوں نے سڑک پر جگہ جگہ زنجیریں باندھی ہوئی تھیں۔ یاد ہے قندہار کے راستے میں دو جگہ زنجیریں لگی ہوئی تھیں، پچھلے مہینے تو ان میں بھی ایک اور زنجیر کا اضافہ ہو گیا تھا، اور ہر جگہ ان حرامیوں کو محصول دینا پڑتا تھا۔ طالبان نے آتے ہی ان سب غنڈوں کو بھگا دیا ہے۔ سڑکیں کھلنے سے کرایہ بھی کم ہو جائے گا اور ساتھ ہی چیزیں بھی سستی ہو جائیں گی، کیوں کہ دکانداروں کو سامان پر ہر جگہ محصول کے علاوہ مہینے کے مہینے بھتہ بھی دینا پڑتا تھا۔ پھر ڈیزل کی آئے دن کی قلت بھی دور ہو جائے گی جس سے گاڑی تین تین دن رکی رہتی تھی۔'

'یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اللہ کرے حالات ٹھیک ہو جائیں اور ہم اپنے فتح کو کابل لے جا سکیں۔ ویسے میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ ریڈیو کب سے خراب پڑا ہے، کم از کم اسے تو ٹھیک کروا لاؤ، کم از کم حالات کا تھوڑا پتہ چلتا رہے۔'

'تم یاد بھی کرواتی ہو تو بے وقت، صبح جب میں جانے کے لیے تیار ہوا کروں تو ہاتھ میں

پکڑا دینا۔ اس وقت کہنے کا کیا فائدہ؟'

'اچھا صبح دے دوں گی۔ ابھی ہاتھ دھو لو، کھانا نکالتی ہوں۔'

زرجانان صحن کی طرف گیا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر لوٹے سے ہاتھ منہ دھونے لگا۔ پھر اس نے صحن میں لگی تار پر سے تولیہ اتارا اور منہ پونچھنے لگا تھا کہ درمیان میں رک گیا۔ 'ارے نہیں بھئی، ریڈیو خطرناک ہے۔ اس کا تو نام بھی مت لو۔'

'وہ کیوں؟ میں گھر میں سارا دن اکیلی ہوتی ہوں، اس سے تھوڑا دل بہل جاتا ہے۔' فتح خان سو گیا تھا۔ گل بینہ نے احتیاط سے اسے کندھے سے اتارا اور دوبارہ گدیلے پر لٹا کر اسے چادر اوڑھا دی۔

'وہ تو ٹھیک ہے لیکن طالبان گانے بجانے کے بالکل خلاف ہیں۔ ہمارے ریڈیو میں ٹیپ ریکارڈر بھی ہے۔ ٹھیک کروانے کے لیے لے جاتے وقت کسی طالب نے میرے ہاتھ میں دیکھا تو مسئلہ ہو جائے گا، وہ سمجھے گا ہم اس پر گانے سنتے ہیں۔'

'اوہو بھئی، یہ تو بڑی سختی ہے۔'

'بس کیا کریں، اب تو گزارا کرنا پڑے گا۔ دعا کرو صبح سواریاں مل جائیں۔ لوگ ڈر کے مارے گھروں میں نہ دبکے رہیں۔ اور ہاں، ایک بات بتانا تو میں بھول ہی گیا۔ سنا ہے انھوں نے لوگوں سے اسلحہ بھی اکٹھا کرنا شروع کر دیا ہے۔ جنوب کے ضلعوں میں جہاں ان کی حکومت ہے، وہاں بھی انھوں نے یہی کیا ہے، جس سے کافی حد تک امن آ گیا ہے۔'

گل بینہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ 'نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی رائفل کسی کے حوالے نہیں کروں گی، چاہے طالبان نہیں ان کا باپ بھی آ جائے۔'

'وہ گھروں میں گھس کر تلاشی لیتے ہیں۔ یہاں بھی آ گئے تو تم کیا کرو گی؟'

گل بینہ کے رخساروں پر آنسو ڈھلکنے لگے۔ 'میرے دادا کی واحد نشانی ہے یہ رائفل۔ میرے بچپن، میری جوانی، میرے خاندان، میرے وطن، میری ساری پچھلی زندگی کی یہی ایک

Scanned with CamScanner

چیز بچی ہے میرے پاس۔ میں اسے کیسے کسی کو دے دوں؟ میرے دادا سے انگریزی حکومت اسے نہیں چھین سکی، پورا قبیلہ پیچھے پڑ گیا تھا لیکن اسے ہاتھ نہیں لگا سکا۔ اب میں یہ کسی اور کو دے دوں؟' گل مینہ سر پر ہاتھ رکھ کر ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ اس کی آواز سے فتح خان بھی جاگ گیا اور ماں کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگا۔ گل مینہ نے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے اور فتح خان کو تھپکنے لگی۔

زرجانان اٹھ کر گل مینہ کے پاس چلا گیا اور اپنے دونوں گیلے ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔ 'اچھا بابا، روؤ تو نہیں، میں اسے چھت کی کڑیوں میں چھپا دیتا ہوں۔ یہاں طالبان تو کیا، بقول تمھارے، ان کا ابا بھی نہیں ڈھونڈ سکے گا۔'

21

گل مینہ بچہ، یہ بندوق دیکھ رہی ہو، یہ کوئی عام بندوق نہیں ہے بلکہ اسے تھری ناٹ تھری کہتے ہیں۔ اصلی، خالص، سچی تھری ناٹ تھری۔ جیسے ہر انسان کی کہانی ہوتی ہے، ویسے ہی ہر بندوق کی کہانی ہوتی ہے۔۔۔ لمبی، گہری، بھیدوں بھری۔ کہاں بنی، کس نے بنائی، کس نے خریدی، کہاں کہاں، کس کس معرکے میں استعمال ہوئی، کتنی جانیں لیں، کتنی جانیں بچائیں۔ اسی طرح میری اس بندوق کی بھی کئی کہانیاں ہیں، کچھ سنا چکا ہوں، کچھ آگے چل کر سناؤں گا۔ آج میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ میرے پاس آئی کیسے۔

ویسے اس کا پورا انگریزی نام تو بڑا مشکل ہے، لیکن میں نے یاد کیا ہوا ہے، ایس ایم ایل ای، یعنی شارٹ میگزین لی انفیلڈ تھری ناٹ تھری۔ یہ کوئی درے میں بنی ہوئی نقلی جعلی بندوق نہیں ہے، سچا اور کھرا مال ہے، سولہ آنے خالص انگلش مال۔ یہ آج کل جو بندوق آئی ہوئی ہے، جو میں نے بھی لی تھی بڑے شوق سے گیارہ ہزار کی۔۔۔ کیا کہتے ہیں اسے، راشن کوپ، کلاشن کوف۔ کیا بات ہے اس کی، اندھے کی لاٹھی ہے، اندھوں کی طرح گھما دو، سو گز تک کوئی مکھی پر آ گیا تو اللہ اللہ خیر سلا، ورنہ سب خیر خیریت ہے۔

اس کے مقابلے پر یہ تھری ناٹ تھری دیکھو، اس کی عمر میرے جتنے ہی ہوگی، شاید مجھ سے بھی بڑی ہو۔ میری تو اب وہ نظر نہیں، دس قدم سے تو مجھ سے بندہ نہیں پہچانا جاتا لیکن اگر کوئی تیز نظر والا ہو تو اب بھی اس کا نشانہ ایسا ہے کہ آدھ میل سے بندہ نہ پھڑکا دے تو نام بدل دینا۔ رات کو کبھی روشنی والا روند فائر کرو تو ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح تین میل دور خواجہ خضر کی چوٹی تک جاتے ہوئے صاف دکھتا ہے۔ کلاشن کوف تو بکری کے دل والے کا اسلحہ ہے، کوئی مرد کا بچہ اسے ہاتھ لگانا پسند نہیں کرتا۔ آنکھیں بند کرو، تڑتڑتڑ۔ گولیاں برساتے جاؤ۔ لگی لگی، نہ لگی نہ لگی۔

Scanned with CamScanner

ویسے جہاں تک گولیاں برسانے کی بات ہے، میری تھری ناٹ تھری بھی کچھ زیادہ پیچھے نہیں ہے۔ اب بھی گھڑی سامنے رکھ دو، ایک منٹ میں چالیس تو نہیں لیکن تیس گولیاں تو اس سے بھی برسا کر دکھا دوں گا۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ وہ ساری نشانے پر لگیں گی، یہ نہیں کہ بھٹیارے کی طرح بھٹی میں دانے بھون دیے۔

گل مینہ بچہ، بعض لوگ ہوتے ہیں جو بٹیرے پالتے ہیں، ان کے ہاتھ میں ہر وقت ایک بٹیرا پکڑا ہوتا ہے جسے وہ سہلاتے، بہلاتے، پچکارتے رہتے ہیں، بس سمجھ لو کہ یہ بندوق ہی میرا بٹیرا ہے۔ اللہ بخشے تمھاری دادی کہا کرتی تھی کہ اگر یہ میری سوکن ہوتی تو میں اس سے نمٹ لیتی، اس کا چہرہ نوچتی، چٹیا سے پکڑ کر ایک دو ایسی گھمیریاں دیتی کہ کبھی میرے سامنے نہ آتی، لیکن یہ بے زبان بے جان چیز ہے، اس کا کیا کروں۔ یہ سب کہتی تھی اور پھر بھی اس نے بڑی شوق سے اسی بندوق سے نشانہ بازی سیکھی تھی۔ اللہ بخشے، کیا زعورت تھی۔ بالکل تمھاری آنکھیں، یہی قد یہی بت، یہی بال۔ مجھے لگتا ہے گل مینہ بچہ کہ پانچ چھ سالوں بعد تم ہو بہو ویسی ہو جاؤ گی جیسی وہ اس وقت تھی جب میرے گھر میں آئی تھی۔ آج کل تو کیمرے آ گئے ہیں، فوٹو آ گیا ہے، اس وقت کوئی جانتا بھی نہیں تھا کہ کیمرا کیا بلا ہوتی ہے۔ ورنہ اگر اس کی اس وقت کی فوٹو ہوتی تو میں تمھیں دکھاتا۔ اس بندوق سے اس کا رشتہ بڑا عجیب تھا، اس سے سخت نفرت بھی کرتی تھی اور سخت محبت بھی۔ ایک طرف وہ اسے سوکن سے بدتر سمجھتی تھی لیکن دوسری طرف اسی بندوق سے اس کا ایسا نشانہ تھا کہ علاقے کے بڑے بڑے نشانچی کان پکڑیں۔ اسی نے یہ پٹا اپنے ہاتھوں سے بُنا تھا، یہ دیکھ رہی ہو گل مینہ؟ اب یہ میلا پڑ گیا ہے لیکن اس میں لال اور نیلے موتی لگا کر کیا خوبصورت نقش بُنے تھے اس نے۔

اسی بندوق سے ہم نے بڑے بڑے کام لیے۔ بڑے بڑے معرکوں میں حصہ لیا، اور اس نے کبھی دھوکہ نہیں دیا، بلکہ دھوکہ کیا کرنا، ہمیشہ توقع سے بڑھ کر ساتھ نبھایا۔ کئی موقعوں پر نہ صرف میری بلکہ میرے ساتھیوں کی زندگیاں بھی اسی نے بچائیں۔ ایک بار تو میں نے اس سے

بادلوں کے اندر اڑتا ہوا جہاز مار گرایا تھا جو کانزی گرام پر بم برسانے جا رہا تھا۔ لیکن وہ کہانی پھر سہی۔

آج تو میں نے تمھیں یہ کہانی سنانی ہے کہ یہ بندوق میرے پاس آئی کیسے۔ یہ کہانی بڑی دلچسپ ہے اور ایک زمانے میں پورے موسیٰ نیکہ تو کیا، پورے برمل میں بچے بچے کو زبانی یاد تھی۔ خیر، ہوا یوں کہ ہمارے قبیلے کے لوگوں نے درے نشتر میں انگریزوں کی ایک چوکی پر دھاوا بولنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ چوکی قمر الگڈ کے اوپر پہاڑی پر بنائی گئی تھی۔ ہمیں اطلاعات ملیں کہ اس میں ایک نئی پلاٹون آئی ہوئی ہے۔ ہم کل دس لوگ تھے جن میں سے آٹھ تو ہمارے اپنے احمد زئی قبیلے کے تھے، لیکن دو زکہ خیل محسود بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ ویسے یہ محسود تو ہمارے خون کے پیاسے تھے اور ہم ان کے، لیکن انگریز کے خلاف دونوں ایک دوسرے کے لیے مکھن اور ملائی بن جاتے تھے۔

ہم پہاڑوں پہاڑوں دس میل چلتے ہوئے چوکی کے قریب پہنچے، اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ اب آج کے نوجوان پوچھتے ہیں کہ بھئی صبح ہونے کا انتظار کیوں، رات ہی کو کیوں نہ شب خون مارا؟ میں کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں لیکن اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ شب خون کہتے ہی رات کے حملے کو ہیں، لیکن ان وقتوں کے رواج آج سے سے ذرا مختلف تھے۔ اس وقت حملہ ہمیشہ روشنی میں کیا جاتا تھا۔ چاہے رات کے اندھیرے میں پانچ میل دور سے چل کے آؤ کہ پچاس میل سے، ہم ہمیشہ صبح ہونے کا انتظار کرتے تھے کیوں کہ ہمارے لیے دو چیزوں سے بڑھ کر کچھ نہیں، ایک تو تنگ اور دوسرا نام۔ رات کو حملے کے دوران اگر کوئی مارا گیا تو کسی کو کیا پتہ کدھر گیا۔ مر گیا، کھپ گیا، انگریز کے ساتھ مل گیا، ہندوستان بھاگ گیا، کس کو کیا پتہ؟ ویسے تو ہمارے ساتھی ہر ممکن کوشش کرتے تھے کہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں میدان سے واپس لائی جائیں، لیکن اکثر اوقات حالات ایسے بن جاتے تھے کہ اس کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ انگریز تو وہیں کہیں پہاڑوں میں گڑھا کھود کر دبا دیتے تھے، اور پیچھے قبیلے میں حاسدوں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا تھا کہ

Scanned with CamScanner

وہ تو لڑا ہی نہیں بلکہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کہیں ہندوستان بھاگ گیا ہے۔ لیکن اگر روشنی میں لڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے سامنے مارا گیا تو سب کو اس کے انجام کی خبر ہوتی تھی اور قبیلے میں اس کا باپ اور رشتے دار فخر سے سر اونچا کر چلنے کے قابل ہو جاتے تھے۔

خیر، ہم ورے نشتر کی چوکی تک پہنچے اور مشرق کے افق پر نظریں جما کر پو پھٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ اسی دوران عین ہمارے سروں کے اوپر آسمان پر تارا ٹوٹا اور دور پہاڑ کے پیچھے جا کر غائب ہو گیا۔ پورے گروہ میں بے چینی پھیل گئی۔ کوئی اس کا کیا مطلب بتا رہا ہے، کوئی کیا۔ گرما گرم بحث شروع ہو گئی کہ کیا اب مہم جاری رکھنا مناسب ہو گا؟

22

'پریشان مت ہو، جلد ہی تمھارے رشتے دار آ کر تمھیں لے جائیں گے۔ یہ لوگ تمھیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔'

یہ پہلی آواز تھی جو ہوش میں آنے کے بعد شفیق کے کانوں میں پڑی۔ اس کا سر درد سے پھوڑا ہو رہا تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے بمشکل آنکھیں کھول کر آواز کی سمت گردن گھمائی۔ اسے احساس ہوا کہ صرف سر ہی نہیں بلکہ اس کا تمام بدن یوں دکھ رہا تھا جیسے کسی نے اسے ڈرم میں ڈال کر پہاڑ سے نیچے لڑھکایا گیا ہو۔

اسے مخاطب کرنے والا شخص درمیانی عمر کا تھا۔ اس کے چہرے پر سفید خشخشی داڑھی تھی، جیسے اس نے کئی دنوں سے شیو نہ کیا ہو۔

'میں کہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟' شفیق نے مدھم آواز میں پوچھا۔ یہ الفاظ اس کے اپنے نہیں تھے، بلکہ اس نے بہت سی فلموں اور ٹی وی کے ڈراموں میں دیکھ رکھا تھا کہ ہیرو یا ہیروئن ہوش میں آنے کے بعد پہلا سوال یہی پوچھتے تھے۔ اس کا حلق بری طرح سوکھ رہا تھا۔ اسی دوران اسے کمرے میں تیز بدبو کا احساس ہوا۔ اس کے بدن پر کالے رنگ کا ایک پھٹا پرانا کمبل پڑا ہوا تھا۔

'فکر نہ کرو، تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ لوگ تاوان لے کر تمھیں چھوڑ دیں گے۔' وہ شخص بولا تو اس کے منہ سے بھپکا آیا۔ اس کے کپڑے میل سے چکٹ ہو رہے تھے۔ اس نے جو چادر اوڑھی ہوئی تھی اس میں جگہ جگہ سوراخ تھے۔

شفیق کے ذہن میں الجھے ہوئے سوالات کی لہریں درد کی موجوں سے متھم گتھا ہو رہی تھیں۔

Scanned with CamScanner

'تاوان؟' اسے اس لفظ کا مطلب تو آتا تھا لیکن مخاطب کے ادا کردہ فقرے میں اس کے استعمال کی سمجھ نہیں آئی۔

آدمی نے اپنی بات دہرائی: 'جب تمھارے رشتے دار انھیں پیسہ دے دیں گے تو یہ تمھیں چھوڑ دیں گے۔ بس تھوڑے دن کی تکلیف ہے، اس کے بعد تم اپنے گھر میں ہو گے۔'

شفیق نے کہنیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی اس کا سارا بدن درد سے لرز اٹھا اور وہ ریت کے ڈھیر کی طرح دوبارہ دری پر ڈھے گیا۔

کہیں بابو پینٹر نے تو اغوا نہیں کروا دیا؟ ممکن ہے اسے خبر ہو گئی ہو کہ مجھے امریکیوں نے بلایا ہے؟ لیکن نہیں، اتنی جلدی اسے کیسے پتہ چل سکتا ہے؟ یہ تو کوئی اور چکر لگتا ہے۔ کمینے سفید گاڑی والے، انھوں نے منہ جکڑ کر کسی قسم کا انجیکشن بھی لگایا تھا۔ اور وہ امریکی سفارت خانے میں رنگ کا کام؟ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں خیال آیا کہ بعض فلموں میں دکھایا جاتا ہے کہ اگر کسی کو کسی خفیہ جگہ تک پہنچانا ہو تو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا جاتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ امریکی سفیر نے اپنے دفتر تک پہنچانے کے لیے۔۔۔ لیکن یہ آدمی تاوان کی کیا بات کر رہا ہے؟

'کون سا تاوان؟ کس چیز کا تاوان؟' شفیق نے پوچھا۔ کمرے کی چھت اور دیواروں پر رنگ یا چونے سے عاری تھیں اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ان سے سردی پھوٹ رہی ہے۔ شفیق کا بدن کانپنے لگا تو اس نے اپنے اوپر کمبل لپیٹ لیا۔ ایک طرف فرش سے کوئی نو دس فٹ اونچا چھوٹا سا روشن دان تھا جس کی سلاخوں سے بھڑکیلی روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی۔

'یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے کہ تمھارے لیے کتنا تاوان مانگیں گے، لیکن عام طور پر یہ دو ڈھائی کروڑ سے بات شروع کرتے ہیں، مول تول کرتے کرتے چالیس پچاس لاکھ پر بات ختم ہو جاتی ہے۔'

'دو ڈھائی کروڑ؟' وہ کوشش کر کے اٹھ بیٹھا۔ اسے احساس ہوا کہ کمرے میں ایک اور

فرد بھی موجود ہے۔ یہ ایک انیس بیس سالہ نوجوان تھا جو کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف آ جا رہا تھا۔ وہ بھی آ کر شفیق کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے بھورے رنگ کی چمڑے کی جیکٹ اور آسمانی رنگ کی جینز پہنی ہوئی تھی۔ اس کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی اور سر کے بال بے ہنگم طریقے سے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ دور کہیں سے لاؤڈ سپیکر پر اذان کی آواز آنے لگی۔

'دو ڈھائی کروڑ اور مجھ سے؟ میرے پاس تو چار ہزار بھی نہیں ہیں۔ میں کوئی کروڑ پتی سیٹھ نہیں ہوں، معمولی رنگساز ہوں۔ میری چار سو روپے دیہاڑی ہے، کبھی کسی نے خوش ہو کر اوپر سے کچھ دے دیا تو وہ الگ، لیکن اکثر اوقات بابو پینٹر اس میں سے بھی کچھ نہ کچھ اڑا لیتا ہے۔'

یہ کہیں تصویروں سے منع کرنے والوں کا کام تو نہیں ہے؟ لیکن میں نے تو اس دن کے بعد سے کوئی انسانی تصویر نہیں بنائی؟ ہاں، گھر میں ضرور بناتا ہوں لیکن وہ ساری تصویریں تو بکسے میں لحافوں کے نیچے رکھی ہوئی ہیں اور بیوی بچوں کے علاوہ کسی کو اس کا پتہ نہیں ہے۔ اور ویسے بھی وہ اغوا کیوں کرنے لگے، وہ تو کہہ رہے تھے کہ سید حامد سید حامد قلم۔۔۔؟

'ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ لوگ چھان پھٹک کر بندہ چنتے ہیں،' ادھیڑ عمر شخص کہہ رہا تھا۔ 'ورنہ خود ان کا نقصان ہو جاتا ہے۔ انھیں ہر جگہ پیسے دینے ہوتے ہیں۔ ایک بندہ اٹھانے میں لاکھوں کا خرچ آتا ہے۔ پچاس لاکھ میں ان کو دس پندرہ بھی بچ جائیں تو بہت ہے۔'

اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا اور فرش پر دروازے کے پاس ہی ایک ٹرے رکھ کر واپس چلا گیا اور جاتے جاتے اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کرتا گیا۔ نوجوان نے اپنی چپل قدمی کا رخ اس طرف موڑا اور ٹرے لا کر ان دونوں کے سامنے رکھ دی۔ ایک بڑی سی پلیٹ سفید چاولوں سے لبالب بھری ہوئی تھی اور ایک برتن میں شوربہ تھا جس کے اندر آلو نظر آ رہے تھے۔ شفیق کو اچانک احساس ہوا کہ وہ شدید بھوکا ہے۔

کھانے کے دوران شفیق نے انھیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ادھیڑ عمر شخص نے اس سے کئی سوال کیے اور ان کے جواب سن کر اپنی داڑھی کھجانے لگا۔ 'شفیق بھائی، میری سمجھ

Scanned with CamScanner

میں تو کچھ نہیں آرہا کہ تمہیں کس مقصد کے لیے اغوا کیا ہے ان لوگوں نے۔ یہ تو بڑا چھان پھٹک کر بندہ چنتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں کسی اور کے دھوکے میں اٹھالیا ہے۔'

ادھیڑ عمر شخص کا نام ملک اسلم تھا اور وہ پنڈی کا ٹھیکیدار تھا۔ اس نے حال ہی میں اسلام آباد کے ایک سیکٹر میں ایک ڈی ایس پی کا مکان بنایا تھا۔ جب مکان مکمل ہو گیا تو ڈی ایس پی نے تعمیر میں کیڑے نکالنا شروع کر دیے۔ کبھی کہتا مسالا ٹھیک نہیں استعمال کیا، کبھی کہتا کہ دیوار ٹیڑھی بنادی ہے کبھی یہ کہ نقشہ کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ اس نے مقررہ رقم سے آدھی پیسے ادا کیے تھے۔ ایک دن دونوں کے درمیان تو تو میں میں ہوئی اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ مزدوروں نے آکر دونوں کو چھڑایا ورنہ اس نے تو ڈی ایس پی کو مارنے کے لیے اینٹ اٹھالی تھی۔ اگلے ہی ہفتے وہ اغوا ہو گیا۔ اسے شک تھا کہ اس کے اغوا میں اسی پلیسے کا ہاتھ ہے۔ اسے اس کمرے میں آئے ہوئے دس دن ہو گئے تھے۔

نوجوان کالج میں پڑھتا تھا اور پشاور کے ایک مشہور اور کھاتے پیتے سرجن کا بیٹا تھا اور اسے واضح طور پر تاوان کے لیے اغوا کیا گیا تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس کا مالدار اور بارسوخ باپ دو چار دن ہی میں اسے یہاں سے نکال لے جائے گا۔ اسے اغوا ہونے سے زیادہ اس بات کی پریشانی تھی کہ اس نے پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے سگریٹ نہیں پیا۔ اس لیے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بے قرار ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگتا تھا۔

گل مینہ کا گل گوتھنا بیٹا فتح خان موٹی سرخ جیکٹ پہنے صحن میں کھیل رہا تھا۔ اس نے ایک پیلے رنگ کی پلاسٹک کی بس دھاگے سے باندھ رکھی تھی اور اسے کھینچتا ہوا ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔

گل مینہ کے گھر مہمان آئے ہوئے تھے۔ ان کے گھر کے دائیں طرف قصائی رہتے تھے جن کی بوڑھی ماں فاطمہ گل مینہ کے پاس صحن میں چارپائی پر بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی۔ ابھی کڑاکے کی سردیاں نہیں شروع ہوئی تھیں لیکن صبح کے وقت اب بھی دھوپ میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ مائی کا ایک بیٹا اور بہو قندھار سے آئے ہوئے تھے اور وہ اسے گل مینہ سے ملوانے کے ساتھ لے آئی تھی۔ بہو کی گود میں چھوٹی سی بچی بے سدھ سو رہی تھی۔

گل مینہ مہمانوں کے لیے قہوہ انڈیل رہی تھی کہ فتح خان کھیلتے کھیلتے دھپ سے گر پڑا اور اپنی عادت کے مطابق جہاں گرا تھا، وہیں لیٹا رہا۔ گل مینہ دوڑی دوڑی گئی، اسے اٹھا کر گلے سے لگایا، پیار کیا اور جیکٹ جھاڑنے لگی۔ فتح خان اس دوران خاموشی سے کھڑا رہا اور جب اسے اندازہ ہو گیا کہ چوٹ کچھ زیادہ نہیں ہے تو ماں کا ہاتھ چھڑا کر الٹی پڑی ہوئی بس اٹھائی اور اسے دوبارہ اپنے پیچھے پیچھے دوڑانے لگا۔

مائی فاطمہ کی بیٹی کو پتہ چلا کہ فتح خان پونے تین سال کا ہو گیا ہے لیکن اس نے ابھی تک بولنا شروع نہیں کیا تو کہنے لگی، 'گل مینہ بہن، تم اسے ہرات میں خواجہ عبداللہ انصاری کی درگاہ کیوں نہیں لے جاتیں؟'

'ہرات؟ لیکن وہ تو یہاں سے خاصا دور ہے، اور حالات کا تو تمہیں پتہ ہی ہے۔' گل مینہ کو بابا نور پیر یاد آ گئے جن کی قبر کی پائنتی اس نے ایک ناقابلِ فراموش رات گزاری تھی۔ شاید

Scanned with CamScanner

انھی کی دعاؤں کا ثمر تھا کہ وہ آج زندہ سلامت اور خوش خوشحال موجود تھی، ورنہ وہاں سے بچ کر نکلنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔

'بہن، وہاں ملا اسمٰعیل کی حکومت ہے۔ میرا اور منی کا ابا ابھی پچھلے مہینے وہاں سے ہو کر آئے ہیں۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں بڑے بڑے جرنیل، سردار، بادشاہ آ کر ماتھا ٹیکتے ہیں، مرادیں مانگتے ہیں، اور جھولی بھر بھر لے جاتے ہیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ وہاں کتنے پیدائشی معذور اپنی ٹانگوں پر چل کر گھروں کو واپس گئے۔'

گل مینہ کو فتح کے نہ بول پانے کی بڑی تشویش تھی۔ ارغنداب میں بچوں کا کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ وہ اور زرجان ایک بار اسے دکھانے کے لیے قندہار لے گئے مگر جونہی گاڑی شہر میں داخل ہوئی، وہاں فائرنگ شروع ہو گئی اور شہر آن کی آن میں بند ہو گیا۔ البتہ اگلی بار وہ اسے غزنی کے بڑے ہسپتال میں بچوں کے ڈاکٹر کو دکھانے میں کامیاب ہو گئی۔

ڈاکٹر چندھی ہوئی آنکھوں والا ہزارہ تھا جو دری بول رہا تھا۔ گل مینہ کو اس کی باتوں کی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں آئی تو اس نے ٹوٹی پھوٹی پشتو میں بات شروع کر دی۔ 'اسے یا تو کابل لے جانا پڑے گا یا پھر کوئٹہ۔ وہیں اس کا ایسا ڈاکٹر علاج کرے گا جو بچوں میں بولنے کی بیماریوں کا علاج کرتا ہے، قندہار میں ایسا کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔' گل مینہ یہ سن کر اور پریشان ہو گئی لیکن ڈاکٹر نے تسلی کروائی کہ لازمی نہیں کہ فتح خان کو کوئی بیماری ہو کیوں کہ بعض بچے قدرتی طور پر دیر سے بولنا شروع کرتے ہیں۔ ساتھ میں اس نے طاقت کا ایک شربت لکھ کر دے دیا اور کہا کہ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ باتیں کریں اور اسے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے دیں۔

'فی الحال تو کابل کے حالات اس قدر خراب ہیں کہ وہاں جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب تھوڑی بہتری آ جائے تو پھر دیکھیں گے،' زرجانان نے کہا۔

'اللہ کرے ڈاکٹر کی بات درست ہو کہ اسے کوئی بیماری نہیں ہے، میں تو ہر وقت اس

کے ساتھ باتیں کرتی رہتی ہوں، لیکن یہ دھیان ہی نہیں دیتا۔ قصائیوں کے بہت سے بچے ہیں، میں اسے روزانہ ان کے گھر لے جایا کروں گی، مجھے تو بہت فکر ہے اس کی، اگر یہ ساری عمر یوں ہی رہا تو زندگی کیسے گزارے گا۔'

Scanned with CamScanner

24

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تارا تو آسمان پر ٹوٹا اور ٹوٹتے ٹوٹتے درے نشتر درے کے قریب جنگل میں ہمارے گروہ پر بے چینی کی چنگاریاں برسا گیا۔ کسی نے کہا بدشگونی ہے، کسی نے کہا کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اگر سب لوگ مطمئن نہیں ہیں تو ایسے عالم میں دل جمعی سے جنگ نہیں لڑ سکیں گے۔ یہ جنگ ایسی ہوتی تھی کہ اس میں بعض اوقات ایک فرد کی غلطی سارے گروہ کو لے ڈوبتی تھی۔ اس لیے ہم نے مل کر طے کیا کہ چوکی کہیں نہیں گئی، کل پھر آجائیں گے۔ اگلی رات پھر ہم چلے لیکن الگنڈ پار کرتے وقت پادیدوں کے کتے جنوں کی طرح ہمارے پیچھے لگ گئے۔ ایک تو ہماری گروہ کے ارکان اپنے قیمتی کارتوس ان پر ضائع نہیں کر سکتے تھے، دوسرا فائرنگ کی آواز تمام علاقے میں آواز پھیل جاتی اور ہماری مہم شروع ہونے سے پہلے ہی ناکام ہو جاتی جس کا تمام انحصار ہی خاموشی اور رازداری پر تھا۔ نہ پوچھو کہ کن مصیبتوں سے ان خبیثوں سے پیچھا چھڑایا۔

اگلی رات ہم بغیر کسی مشکل کے چوکی تک پہنچ گئے اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی پو پھٹنے میں کچھ دیر تھی کہ ہمارا ایک محسود ساتھی انتظار کے دوران کہیں پیشاب کرنے کے لیے گیا۔ سب ساتھیوں کے کمر بند میں اسی مقصد کے لیے مزرئی کی ایک شاخ ہوتی تھی جس پر پیشاب کی دھار گرائی جاتی تھی تاکہ زمین پر اس کے گرنے کی آواز نہ پھیلے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ رات کے مکمل سکوت میں معمولی سے معمولی آواز بھی دور تک جاتی ہے۔ لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اس محسود نے ایک طرف سے تو پوری احتیاط تو کی لیکن بدقسمتی سے آواز دوسری طرف سے نکل گئی۔

کیا بتاؤں کیا کہرام مچا۔ کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ کوئی ہتھیلی دانتوں تلے دبا کر کاٹ رہا ہے، کوئی پسلیاں پکڑ کر گدھے کی طرح زمین پر لوٹ رہا ہے۔ کوئی بیٹھے بیٹھے ایک طرف کو

لڑھک گیا ہے۔ سب ہیں کہ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہنسی ہے کہ سیلاب کے پانی کی طرح کونوں کھدروں رخنوں سے باہر نکلی چلی جا رہی ہے۔ خود میں زمین پر گرا تو میری کمر میں گرگرے جھاڑی کے کانٹے چبھ گئے۔ یہاں سے دشمن کی چوکی ایک میل کے فاصلے پر تھی، میں نے بہت کہا کہ وہاں تک آواز وہاں تک پہنچنا بہت مشکل ہے، لیکن دوسروں نے میری نہیں سنی اور یہی کہا کہ کیا خبر دشمن اب ہوشیار ہو کر ہمارے انتظار میں بیٹھ گیا ہو اور ہم شکار کرنے کی بجائے خود شکار ہو جائیں۔ خیر یہ مہم بھی منسوخ کر دی گئی۔

اس سے اگلی رات البتہ کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہمیں مقامیوں سے اطلاع ملی تھی کہ اس چوکی کے سپاہی صبح پہلی روشنی کے ساتھ گشت پر نکلتے ہیں اور دوپہر تک پہاڑی کے پیچھے سے ہو کر واپس آجاتے ہیں اور اگلی صبح تک چوکی میں بند رہتے ہیں۔ یہ معلومات بے حد اہم تھیں، اور ہم نے سارا منصوبہ انہی کی روشنی میں تیار کیا تھا۔ توقع کے مطابق ادھر سورج کی پہلی کرن نے منہ دکھایا، ادھر چوکی سے باتوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور ساتھ ہی دس بارہ گورکھے اپنے معمول کے مطابق صبح کی گشت کے لیے چوکی سے باہر نکلے۔ ہم اسی انتظار میں تھے، اللہ اکبر کہتے ہوئے ان پر فائر کھول دیا۔ میں نے کہا کہ ہم نے فائر کھول دیا، لیکن اس ہم میں میں شامل نہیں تھا کیوں کہ میرے پاس بندوق ہی نہیں تھی۔ میں اس وقت لڑکا سا تھا، تمھارے بھائی جاوید سے بھی چھوٹا ہوں گا بلکہ ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میرے علاوہ باقی سارے جتھے کے پاس بندوقیں تھیں۔ حتیٰ کہ میرے ہم عمر دوست نیاز مین کے پاس بھی اس کے دادا کے زمانے کی توڑے دار بندوق تھی جو اس کے قد سے بھی لمبی تھی۔ اس نے بعد میں مجھے بتایا کہ اس نے ایک گورکھا مار گرایا تھا، خیر گرایا ہوگا، میں نے نہیں دیکھا۔ میں اپنے ساتھ گھر کی ایک بڑی چھری پتھروں پر خوب تیز کر کے لایا تھا کہ کوئی انگریز یا اس کا کوئی پٹھو سامنے آئے تو اسے اس کی دھار کا مزا چکھایا جا سکے۔

ویسے تو میرے والد یعنی تمھارے پردادا کے پاس ایک چھ فٹی جرمل تھی، لیکن وہ

Scanned with CamScanner

میرے بڑے بھائی کے قبضے میں رہتی تھی اور وہ مجھے اسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے تھے۔ ایک بار میں آنکھ بچا کر اسے کسی مہم پر ساتھ لے بھی گیا تھا لیکن بھائی نے واپسی پر وہ درگت بنائی کہ بس کیا کہوں۔

میرے ساتھیوں نے تین چار گورکھے پھڑکا دیے، باقی جو بچے وہ بھاگ کر چوکی کے اندر چلے گئے اور برج کے موکھوں سے اندھا دھند فائر کرنے لگے۔ قبائلی کے پاس مشکل سے دس بیس کارتوس ہوتے ہیں اور وہ بھی اس نے نہ جانے کن کن مصیبتوں سے اور اکثر اوقات اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر حاصل کیے ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے پر انگریزی فوج کے سپاہی کے لیے کارتوس کنکر پتھر کی طرح ہے، ہزاروں پھونک جاؤ، انگریز بادشاہ کا مال ہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ ہندوستانی سپاہی دو منزلہ برج کے چاروں طرف بنے سوراخوں میں بندوقیں ڈال کر ہم پر گولیاں برسانے لگے۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم کس طرف ہیں، وہ تو بس ہر طرف تڑتڑا دے برسا رہے تھے، گولیاں پتھروں پر لگتیں تو ان سے چنگاریاں اٹھ اٹھ کر فضا میں بلند ہوتیں۔ ہم چٹانوں کے پیچھے چھپے تھے اس لیے ہمیں کیا فرق پڑنا تھا، وہیں اپنی جگہ پر موقعے کا انتظار کرتے رہے کہ ان کی جوش، بلکہ جوش تو کیا بدحواسی ختم ہو تو گھر کا راستہ لیا جائے۔

میں اور نیاز بین ہی ایک بڑے پتھر کے پیچھے سر نیوڑائے بیٹھے تھے۔ مجھے سخت مایوسی ہو رہی تھی کہ دو بدو لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور چار راتوں کی مشقت بیکار گئی۔ باقی ساتھیوں نے کم از کم گولیاں تو داغیں، میں نے کیا کیا؟ پھر میں نے سوچا کہ ایسے نہیں چلے گا، کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ میں چٹان کے پیچھے سے نکل آیا۔ نیاز بین نے تیز سرگوشی میں کہا، 'پاؤ جان، کیا کر رہے ہو، پاگل ہو گئے ہو؟' لیکن میں نے چھری ہاتھ میں لیے جھکے جھکے چوکی کی طرف دوڑ لگا دی۔ راستے میں بڑے بڑے اونچے نیچے پتھر اور گرگرے کی جھاڑیاں تھیں، میں ان کی آڑ لیتا ہوا چوکی کے دو منزلہ برج کے نیچے پہنچ گیا۔ پتھروں کی موٹی دیوار میں بنے ایک موکھے سے ایک سپاہی وقفے وقفے سے بندوق گھما گھما مسلسل فائر کیے جا رہا تھا۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔

اسے میری آمد کی خبر ہی نہیں ہوئی اور وہ اسی طرح اندھا دھند کارتوس پھونکتا رہا۔ میں نے لپک کر بندوق دبوچی اور ایک جھٹکے سے باہر کھینچ لی۔ اس کی نال اتنی گرم تھی کہ اس نے میری ہتھیلیاں جلا ڈالیں، لیکن اس وقت کس کو جلنے کی فکر تھی۔ اندر سے کسی نے چیخ کر کچھ کہا لیکن میں اگلے ہی لمحے چوکی کے پیچھے ترائی میں کود چکا تھا۔

بس یہی وہ رائفل ہے جو اس وقت سے لے کر اب تک میرے ساتھ ہے۔

Scanned with CamScanner

شفیق کو اس کمرے میں دو دن گزر گئے۔ اس دوران اس نے کھانا دینے والے ایک لڑکے کے علاوہ کسی اور شخص کی شکل نہیں دیکھی۔ آخر تیسرے دن صبح ہی صبح لوہے کا دروازہ ایک پرشور آواز کے ساتھ کھلا اور تین مرد اندر داخل ہو گئے۔ تینوں نے کندھوں پر خوفناک قسم کی بندوقیں لٹکا رکھی تھیں اور سب کے سروں پر سفید پگڑیاں تھیں۔ ایک نے آتے ہی زور سے کچھ کہا جس پر باقی دونوں ہنس پڑے۔ شفیق کے بہت سے گاہک پٹھان تھے جن سے اس نے پشتو کے چند فقرے، خاص طور پر گالیاں سیکھ لیں تھیں لیکن ان لوگوں کی پشتو کچھ عجیب سی تھی۔ اسے یہ تو پتہ چل گیا کہ یہ پشتو ہی بول رہے ہیں لیکن ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑا۔

اس کی رات بہت بے آرام گزری تھی۔ ایک تو سخت اور ٹھنڈا فرش اس کے بدن میں چبھتا تھا، رہی سہی کسر ٹھیکیدار کے خراٹوں نے پوری کر دی تھی۔ وہ ساری رات لگاتار ایسے بلند خراٹے بھر رہا تھا جیسے کمرے کی چھت گرا کر دم لے گا۔ صبح اذان کے بعد کہیں جا کر کسی وقت شفیق کی آنکھ لگی تھی اور اب ان لوگوں نے آ کر جگا دیا تھا۔ ان میں سے ایک ناٹے قد کا تھا اور اس کے ہاتھ میں ٹھن ٹھن بجتی زنجیریں تھیں، جن کے سروں پر پٹے لگے ہوئے تھے۔ وہ تینوں کے پاس آیا اور ٹھیکیدار کی گردن میں زنجیر والا پٹہ ڈال دیا۔ پھر وہ شفیق کی طرف مڑا۔ شفیق کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا، اس نے بغیر کچھ کہے سنے گردن جھکا دی اور گلے میں پٹہ ڈلوا لیا۔ آخری باری تو جوان کی تھی۔

ناٹے قد والے نے تینوں پٹوں کی زنجیریں ایک ہی ہاتھ میں تھام لیں اور ایک جھٹکا دے کر انھیں اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ شفیق انھیں پہچاننے کی کوشش کی لیکن یہ وہ لوگ نہیں تھے جو اسے ورکشاپ سے سفید کار میں لے کر گئے تھے۔ نہ ہی یہ وہ تھے جنھوں نے اسے ایک بار

بھرے بازار میں گریبان سے پکڑ کر انسانی تصویریں بنانے سے منع کیا تھا۔

تینوں ناٹے کے پیچھے پیچھے چلتے کمرے سے باہر آ گئے اور سیڑھیاں اتر کر نیچے جانے لگے۔ شفیق پہلی بار کمرے کے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ کمرہ دوسری منزل پر بنا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے مکان ابھی زیرِ تعمیر ہے کیوں کہ جگہ جگہ سیمنٹ، اینٹیں اور سریا بکھرا تھا اور کچھ دیواروں کی لپائی ابھی نہیں ہوئی تھی۔

مکان سے باہر ایک کھلا میدان تھا جس میں ریت اور کہیں کہیں جھاڑیاں تھیں۔ یہ میدان دور ایک پہاڑ پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ مغرب کی سمت سو دو سو گز کے فاصلے پر کچھ مکان ایک ساتھ بنے ہوئے تھے۔ مکانوں کے قریب کوئی درخت تھا جس سے ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا۔

شفیق کو یاد آیا کہ وہ انگ والے سلطان استاد کے ٹرک کے ڈالے پر سیتری اور سیتری کے سبزہ زار میں سفید براق گھوڑا بنا رہا تھا۔ اگلے دن جب وہ کام پر نہیں پہنچا ہو گا تو بابو نے اسے خوب گالیاں دی ہوں گی۔ ٹرک تین دن بعد ڈرائیور کے حوالے کرنا تھا۔ اب اس کی غیر موجودگی میں بابو کہیں اس کا کام اس کے حریف مجیدے کو نہ سونپ دے، جو اچھی بھلی تصویر کا قیمہ بنا کر رکھ دے گا۔ وہی مجیدا جو کام میں تو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن لگائی بجھائی اور کان بھرائی کا خوب ماہر تھا اور بابو میسٹر کے ساتھ بیٹھ پیچھے شفیق کی برائیاں کر کر کے اس کی ٹانگیں کھینچنے کی کوششوں میں لگا رہتا تھا۔

ناٹے تینوں کو مکان سے کچھ دور لے آیا۔ باقی دونوں مرد ان کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ یہاں ایک سفید رنگ کی ڈاٹسن پک اپ کھڑی تھی۔ ناٹے نے تینوں کی زنجیروں کو جھٹکا دے کر چھوڑ دیا اور ڈپٹ کر کہا: 'ادھر بیٹھو، لیکن بات مات نئیں کرنا!'

شفیق کا خیال تھا کہ باقی دونوں مرد بھی ان کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوں گے، لیکن وہ وہیں کھڑے رہے اور ناٹے نے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ کر انجن آن کر دیا اور گاڑی ایک کچی سڑک پر ڈال دی۔

Scanned with CamScanner

شفیق کا ذہن ایک بار پھر سلطان استاد کے ٹرک کی طرف بھٹک گیا۔ اس نے ٹرک کے ہر پینل کے لیے تفصیلی ہدایات دی تھیں کہ اس پر کس قسم کے نقش و نگار بنیں گے اور ان پر کون کون سے رنگ استعمال ہوں گے۔

پک اپ کے پیچھے سیٹیں نہیں تھیں اس لیے انھیں سخت آہنی فرش پر بیٹھنا پڑا۔ لگتا تھا کہ حال ہی میں پک اپ میں ریت ڈھوئی گئی ہے لیکن شفیق کے کپڑوں کا ویسے ہی برا حال تھا اس لیے اسے نیچے بیٹھنے میں کوئی تامل نہیں ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک بڑے میدان میں پہنچ گئے جس میں بڑے بڑے پتھروں کے ساتھ ساتھ کسی قسم کی جھاڑیاں دور دور اگی ہوئی تھیں۔ دور کنارے پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

میدان میں آ کر گاڑی نے رفتار پکڑ لی۔ سڑک کچی تھی اور اپنے پیچھے دھول کا مرغولہ چھوڑے جا رہی تھا۔ راستہ اس قدر کٹا پھٹا تھا کہ جب بھی گاڑی کسی گڑھے میں اچھلتی، شفیق اور اس کے ساتھی فرش سے ایک دو انچ اوپر اٹھ جاتے تھے اور پھر واپس سٹیل کے فرش پر آ گرتے۔ ڈرائیور کو شاید گاڑی خراب ہونے کی کوئی پروا نہیں تھی، یا شاید یہ گاڑی اس کی تھی ہی نہیں اور وہ کسی سے مانگ کر لایا تھا، اس لیے وہ اس سڑک پر احتیاط کا مظاہرہ کرنے کی بجائے گاڑی اچھالتا چلا جا رہا تھا۔ شفیق نے اچھلنے سے بچنے کے لیے سائیڈ بورڈ مضبوطی سے تھام لیا، لیکن اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا، الٹا تھوڑی دیر بعد کندھے میں درد ہونے لگا۔

لیکن سڑک کی ناہمواری سے اسے ایک اور بات بھی چبھ رہی تھی۔ ان لوگوں نے تین قیدیوں کو لے جانے کے لیے صرف ایک آدمی ہی کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اگر باقی دونوں بھی ساتھ آئے ہوتے تو شاید اسے زیادہ مسئلہ نہ ہوتا، لیکن ایک اکیلا ناٹا ہی ان کے لیے کافی ہے، یہ بات شفیق کو کسی قدر شرمناک لگی۔ اس نے گاڑی کے کیبن میں لگے شیشے سے دیکھا۔ ناٹا سٹیئرنگ مضبوطی سے تھامے بظاہر لاپروائی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ والی سیٹ پر خوفناک بندوق پڑی تھی۔ شاید کلاشنکوف تھی۔ شفیق نے ٹھیکیدار کی طرف دیکھا، لیکن وہ آنکھیں موندے

بیٹھا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سو رہا ہے لیکن گاڑی کی اس درجہ اچھال پچھاڑ میں سونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ رہا نوجوان تو وہ ویسے ہی گم رہتا تھا، اس وقت بھی اس کی نظریں دور افق پر گڑی تھیں۔

شفیق نے گاڑی کے پیچھے بھاگتی سڑک کا جائزہ لیا۔ وہاں زیادہ تر کچی مٹی تھی جس پر اگر چھلانگ لگائی جاتی تو زیادہ چوٹ آنے کا احتمال نہیں تھا۔ شفیق غیر محسوس طریقے سے گاڑی کی پشت کی طرف کھسکنے لگا۔ ٹھیکیدار واقعی جاگ رہا تھا۔ اس نے شفیق کی طرف ایک نظر دیکھا اور سختی سے آنکھیں میچ لیں جیسے اسے خبردار کر رہا ہو۔

اگر میں چھلانگ لگا لوں تو کیا ناٹے کو پتہ چل جائے گا؟ اس کی نظریں تو آگے سڑک پر ہیں۔ لیکن گاڑی کے شیشے بھی تو ہوتے ہیں جن سے پیچھے کا منظر دکھائی دیتا ہے؟ دھول کے بادل چند سیکنڈ چھپائے رکھیں گے، لیکن پھر ناٹا شیشے میں دیکھ لے گا۔ کم بخت پہاڑیاں بھی بہت دور ہیں، ان تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ اسے اپنی کلاشن کوف سے مار گرائے گا۔ اس کا نشانہ بھی اچھا ہی ہوگا، ویسے ہی تو بندوق نہیں اٹھائے اٹھائے پھرتا۔

فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھے ہوئے کئی گھنٹے کے اچھال اچھال کر آنتیں منہ تک لا دینے والے سفر کے بعد ڈاٹسن ایک گاؤں میں پہنچ کر رک گئی۔

ایک بار پھر ناٹے نے ان تینوں کی زنجیریں ہاتھ میں پکڑ لیں اور تینوں کو اپنے پیچھے لے کر روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دور چل کر ایک پتھروں سے بنا ایک احاطہ آیا، جس کے اندر سے گھٹا گھٹا شور باہر آ رہا تھا۔ دروازے میں سے داخل ہو کر شفیق نے جو منظر دیکھا اس سے اس کی ٹانگوں میں جان نکل گئی۔ احاطے کے وسیع صحن میں بیس پچیس کے قریب مرد زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کی گردنوں میں ویسے ہی پٹے تھے جیسے شفیق اور اس کے ساتھیوں کی گردنوں میں۔ کسی کے پٹوں کی زنجیریں گود میں پڑی ہوئی تھیں، کچھ زمین پر ادھر ادھر بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ جیسے لمبی دموں والے بہت سے بندر زمین پر بیٹھے ہوں۔

Scanned with CamScanner

26

زرجانان نے عقبی آئینے میں کوچ پر نگاہ ڈالی۔ اس کے پیچھے والی سیٹ پر نیلے برقعوں میں ملبوس دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک کی گود میں چند مہینے کا بچہ خاں خوں کر رہا تھا۔ ان کے ساتھ والی سیٹ پر ایک بوڑھا مرد چار پانچ سال کے بچے کے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا اور بار بار بچے کو ڈانٹ کر سیٹ پر بٹھا دیتا تھا لیکن بچہ تھا کہ بار بار اپنی جگہ سے اٹھ کر عورتوں کے پاس جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بس کے پچھلے حصے میں دو پگڑیوں والے مرد الگ الگ سیٹوں پر کھڑکیوں کے قریب بیٹھے تھے۔ ایک لمبے بالوں والا نوجوان سب سے آخری سیٹ پر آنکھیں موندے نیم دراز تھا۔

زرجانان نے سرد آہ بھری۔ اس کا مطلب ہے گاڑی بھرتے بھرتے ایک گھنٹہ کہیں نہیں گیا۔

اسے سواریوں کے انتظار سے شدید کوفت ہوتی تھی۔ دوسرے ڈرائیور چائے خانے میں گپیں ہانکتے رہتے تھے اور اس وقت تک گاڑی کا رخ نہیں کرتے تھے جب تک وہ سواریوں سے لبالب بھر نہ جائے اور مسافر ٹیشن میں آ کر گالم گلوچ پر نہ اتر آئیں۔ کچھ ایسے بھی تھے جو گاڑی میں بیٹھے بلاوجہ ریس دے دے کر اسے تھوڑا آگے پیچھے کرتے رہتے تاکہ سواریاں سمجھیں گاڑی بس نکلنے والی ہی ہے اور وہ لپک کر سوار ہو جائیں۔ بعض کنڈکٹر دو چار دوستوں کو گاڑی میں بٹھا لیتے تھے تاکہ لوگ سمجھیں سواریاں موجود ہیں۔ لیکن ان کے بیٹھتے ہی یہ جعلی مسافر ایک ایک کر کے گاڑی سے اتر جاتے تھے۔ زرجانان کو یہ دو نمبریاں سخت ناپسند تھیں۔ وہ بس اپنی سیٹ پر کڑھتا بیٹھا رہتا تھا۔ بار بار عقبی آئینے میں دیکھتا اور منہ چڑاتی خالی سیٹوں کو دیکھ کر نظریں گھما کر دور مشرقی پہاڑوں پر جما لیتا۔ مالک ہر پھیرے کے بعد سختی سے حساب لیتا تھا اور اگر ایک افغانی بھی کم ہو تو

ناک بھوں چڑھاتا تھا۔ اگر اس کا خیال نہ ہوتا تو زرجانان آدھی گاڑی ہی لے جاتا۔

میران شاہ میں اس کے پاس اپنی جیپ تھی۔ بس ڈیڑھ سال کی قسطیں اور دینا تھی پھر وہ اس کے نام ہو جاتی۔ وہاں وہ اپنی مرضی کا مالک تھا، چاہے تو سارا دن ڈیرے میں پڑا چارپائی توڑتا رہے۔ چاہے تو دو دن کی بکنگ پر پہاڑوں میں چلا جائے۔ یہاں مسئلہ یہ تھا کہ ہر کام میں مالک کی سننا پڑتی تھی۔ اور وہ اتنا بدتمیز تھا کہ کئی بار اسے نکالنے کی دھمکی دے چکا تھا۔

زرجانان انھی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک گاڑی میں ہلچل ہوئی اور عورتیں بچوں کو اٹھا کر تیزی سے گاڑی سے نیچے اتر گئیں۔ سب سے آخری سیٹ پر بیٹھا ہوا لڑکا کھڑکی میں سے ہی نیچے کود گیا۔ کنڈکٹر ایسا غائب ہوا کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلا کدھر گیا۔ زرجانان ابھی صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سیاہ پگڑیاں باندھے، کندھوں پر کلاشنکوفیں لٹکائے، سات آٹھ مرد گاڑی میں داخل ہو گئے۔

'ہمیں سپین بولدک جانا اور پھر وہاں سے واپس بھی آنا ہے'، ان میں سے ایک نے کہا۔ زرجانان یہ بات نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی بائیں آستین خالی جھول رہی تھی۔ 'کرائے کی فکر مت کرو، پورے پیسے ملیں گے۔' وہ زرجانان کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں سیاہ دانوں والی لمبی تسبیح تھی۔ اس کے ساتھی پیچھے کی سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔

زرجانان کے دل میں آئی کہ کہے مالک کی مرضی کے بغیر وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ لیکن ان لوگوں کے چہروں پر اس قدر قطعیت تھی کہ اس نے خاموشی سے انجن سٹارٹ کر دیا۔ سپین بولدک وہاں سے کم از کم چار گھنٹے کے فاصلے پر تھا اور وہ بھی اس صورت میں اگر سڑک ٹھیک ہو۔ زرجانان صرف ایک بار سال بھر پہلے ادھر گیا تھا، اس وقت سڑک خاصی خراب تھی۔ زرجانان نے گاڑی کچے سے اڈے سے نکال کر سڑک پر ڈال دی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا کنڈکٹر طاؤس ایک کھوکھے کے پیچھے دبکا کھڑا تھا۔ چلو اچھا ہوا کہ اس نے دیکھ لیا، زرجانان نے سوچا۔ وہ جا کر مالک کو سب کچھ بتا دے گا۔

Scanned with CamScanner

ارغنداب کے مرکزی بازار میں عام طور پر خاصی بھیڑ بھاڑ ہوا کرتی تھی لیکن اس وقت اکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ اکثر دکانوں کے اوپر چھت کی بجائے ٹاٹ لگی تھی جن کے نیچے نیاری، پرچون، کباب، بکوں، نسوار اور تمباکو کی دکانیں تھی۔ اب گاڑی ایک اور موڑ مڑ کر بازار سے نکل آئی اور قندہار جانے والی سڑک پر رواں ہو گئی۔ بازار کے ایک کونے میں دکانوں کے پیچھے زرجانان کا ایک کمرے پر مشتمل گھر تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے زرجانان نے سوچا کہ پتہ نہیں گل مینہ اور فتح اس وقت کیا کر رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے پاس پڑوس کی عورتیں وہاں جمع ہوں اور گپیں ہانکے جا رہی ہوں۔ اسے تو پتہ بھی نہیں ہوگا کہ مجھے طالبان اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ کیوں لے جا رہے ہیں؟ کہاں لے جا رہے ہیں؟ کچھ پتہ نہیں۔ کب تک واپس چھوڑیں گے؟ چھوڑیں گے بھی یا نہیں؟ کوئی اندازہ نہیں۔

تین چار کلومیٹر چل کر ایک ہاتھ والے طالب نے اسے گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ یہاں سڑک کے کنارے دس بارہ طالبان کھڑے تھے۔ وہ بھی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ان میں سے ایک بری طرح سے لنگڑاتے ہوئے چلتا تھا اور اسے گاڑی میں سوار ہونے میں بھی دقت ہوئی۔ جب ایک اور طالب نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی تو اس نے اسے بری طرح جھٹک دیا اور خود زور لگا کر اندر آ گیا۔ اپنی جسمانی کمزوری کے باوجود اس کے انداز سے خاصا اعتماد جھلکتا تھا۔ زرجانان کو حیرت ہوئی کہ اس کے کندھے پر دوسرے طالبان کی طرح کلاشنکوف نہیں، بلکہ تھری ناٹ تھری لٹک رہی تھی۔ معلوم نہیں یہ کس مہم پر جا رہے ہیں۔ لڑائی کے لیے جاتے وقت تو یہ سفید پک اپ گاڑیاں استعمال کرتے ہیں۔ اور اب تو ان کے پاس ٹینک اور توپیں بھی آ گئی ہیں۔ پھر میری گاڑی استعمال کرنے کی کیا تک بنتی ہے؟

سپین بولدک کا راستہ قندہار سے ہو کر جاتا تھا البتہ اس کے لیے زرجانان کو شہر کے معروف حصے کے اندر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے گاڑی شہر کے جنوبی حصے کے گرد گھماتے ہوئے سپین بولدک جانے والی سڑک پر ڈال دی۔

'کیا نام ہے تمھارا؟' ایک بازو والے نے پوچھا۔ اس کے تحکمانہ انداز اور اس کے لیے دوسرے طالبان کے مودبانہ رویے سے زرجانان نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ان کا کمانڈر ہے۔ اس کے واحد ہاتھ میں موٹے دانوں والی تسبیح تھی جس پر اس کی انگلیاں تیزی سے رواں تھیں۔

'زرجانان خان۔'

'گاڑی تمھاری اپنی ہے؟'

'نہیں جی، مالک کی ہے۔'

'گھبرا کیوں رہے ہو زرجانان، ہم تمھیں کھا تو نہیں جائیں گے،' کمانڈر نے کہا۔ اس کے واحد ہاتھ کی انگلیاں تسبیح کے دانوں کو تیزی سے پھیرتی جا رہی تھیں۔ 'ہماری گاڑیاں کابل گئی ہوئی ہیں، اس لیے تمھیں ساتھ لے لیا۔ شام سے پہلے پہلے تمھیں فارغ کر دیں گے۔'

'نہیں جی، گھبرا تو نہیں رہا۔ میں تو آپ لوگوں کا خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہمیں ان جنگیوں سے نجات دلا دی، انھوں نے بڑا تنگ کر رکھا تھا۔ پورے علاقے کو انھوں نے زنجیروں سے باندھ رکھا تھا۔ ان کا بس چلتا تو ہر پہاڑ اور ہر ٹیلے کو بھی زنجیروں سے جکڑ دیتے اور اس کا خون نچوڑ نچوڑ کر پیتے رہتے۔' زرجانان کو کئی سال پہلے سنگین خان کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔

کمانڈر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ 'کہاں کے رہنے والے ہو زرجانان؟'

'ارغنداب جناب۔'

سڑک کسی زمانے میں پکی رہی ہو گی لیکن اب اس حد تک کٹ پھٹ چکی تھی کہ اب اسے کسی صورت پکی سڑک نہیں کہا جا سکتا تھا۔ گاڑی اس پر چلتے ہوئے بے ہنگم طریقے سے اچھل رہی تھی۔ یہ سڑک اس بڑی کوچ کے لیے ہے ہی نہیں۔ یہاں تو بس جیپ یا ڈبل کیبن ہی آسانی

Scanned with CamScanner

سے چل سکتی ہے۔ نہ ہوئی میری جیپ جو اڑتی چلی جاتی۔ اگر کوچ کا کوئی پرزہ ٹوٹ ووٹ گیا تو مالک آسمان سر پر اٹھا لے گا۔

کماندار کہہ رہا تھا، 'ارغنداب کے تو نہیں لگتے۔ لہجہ تو تمھارا وزیرستان کی طرف کا ہے۔ وزیرستان میں کہاں کے ہو؟'

'جی انگور اڈا۔' زرجانان گڑبڑا گیا۔ اس نے بڑی محنت کر کے مقامی لہجہ اور الفاظ اپنانے کی کوشش کی تھی، لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوشش کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی کیوں کہ کماندار نے اتنی آسانی سے اسے پکڑ لیا تھا۔

'یہاں کیسے آ گئے؟'

'کچھ دشمنیاں وغیرہ تھیں۔ جان کا خطرہ تھا۔ حالات ٹھنڈے پڑ جائیں تو واپس چلا جاؤں گا۔'

'ہوں، انگور اڈا۔ میں گیا ہوں ادھر ایک دو دفعہ۔ لیکن مجھے وہاں کوئی انگور نظر نہیں آیا؛' کماندار نے وہی لطیفہ دہرایا جو زرجانان سینکڑوں بار سن چکا تھا۔ یہ کہہ کر کماندار نے آنکھیں موند لیں اور سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ زرجانان نے شکر ادا کیا کہ اس نے زیادہ نہیں کریدا۔

سڑک اب بے حد دشوار گزار ہو گئی تھی۔ کہیں کہیں گھنی پہاڑیوں کو چھوڑ کر یہ علاقہ نسبتاً میدانی تھا لیکن سڑک پر گاڑیوں نے چل چل کر گڑھے بنا دیے تھے۔ دو تین جگہوں پر تو اچھے خاصے کھڈ بنے ہوئے تھے، جن کے اندر سے گاڑی نکالتے ہوئے خاصی احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔ زرجانان نے اندازہ لگایا کہ اگر بارش ہو گئی تو یہ کھڈ بالکل ناقابلِ عبور ہو جائیں گے۔ یہ الگ بات کہ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں کی مٹی نے مہینوں سے پانی کا قطرہ تک نہیں دیکھا۔ حالانکہ ارغنداب میں پچھلی رات ہلکی سی بارش ہوئی تھی۔ کھڑکی سے دھول اندر آنے لگی تو اس نے شیشہ چڑھا دیا۔

اور پھر ایک کھڈ کے اندر سے گاڑی گزارتے ہوئے وہ کانپ کر رہ گیا۔ کھڈ سے کچھ ہی

دور ایک کار کا زنگ آلود ڈھانچہ بوسیدہ ٹائر آسمان کی طرف منہ اٹھائے پڑا تھا۔ جیسے کوئی لال بیگ چلتے چلتے الٹ گیا ہو اور اپنی ننھی ننھی ٹانگیں ہلا ہلا کر دعا مانگتے مانگتے رہ گیا ہو لیکن کبھی سیدھا نہ ہو سکا ہو۔ بارودی سرنگ! اس کے ذہن میں گھنٹی بجی۔ اس نے بے چین ہو کر کماندار کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔

پیچھے والی سیٹوں پر بیٹھے طالبان جو پہلے ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف تھے، اب خاموش ہو گئے تھے۔ سوائے ایک موٹے تازے طالب کے، جو اپنی باریک آواز میں کبھی کبھی بول پڑتا تھا لیکن اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے طالب اپنی اپنی سوچوں میں گم صم بیٹھے تھے اور اس کی باتوں پر ہوں ہاں بھی نہیں کر رہے تھے۔

آگے چل کر سڑک نسبتاً بہتر ہو گئی۔ کہیں کہیں سے پکا ٹکڑا بھی مل جاتا تھا۔ چار ساڑھے چار گھنٹے کے سفر کے بعد وہ سپین بولدک پہنچ گئے۔ یہ قصبہ ایک پہاڑی کے دامن میں بنا ہوا تھا۔ یہاں کا ایک ڈرائیور زرجانان کا جاننے والا تھا لیکن وہ اس وقت قندہار میں ہو گا۔ قصبے سے خاصا پہلے ہی کماندار نے اسے گاڑی ایک ڈھلوان پر چڑھانے کو کہا جس کے اوپر ایک بہت بڑی حویلی تھی جو کئی کلومیٹر دور ہی سے نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔ حویلی کی گارے سے لپی ہوئی دیوار کم از کم سو گز لمبی ہو گی۔ اس کے وسط میں سیاہ رنگ کا ایک بہت بڑا دروازہ تھا جس میں سے ٹرک آسانی سے گزر سکتا تھا۔ کماندار نے اسے باہر ہی رکنے کو کہا اور اپنے آدمیوں کو لے کر نیچے اتر گیا۔ زرجانان گننے لگا۔ وہ کل انیس نفر تھے۔ دستک دینے کے تھوڑی دیر بعد دروازے کے اندر بنا چھوٹا دروازہ چوں چوں کر کے کھلا اور طالبان کی قطار اس کے اندر داخل ہو گئی۔

نیچے سپین بولدک قندہار سڑک کی طرف سے کبھی کبھی کسی ٹرک کی گھن گھن یا ہارن کی آواز آ جاتی تھی، لیکن حویلی کے اندر یکسر خاموشی تھی۔ زرجان کے دل میں ایک لمحے کو آیا کہ وہ گاڑی سٹارٹ کر کے بھاگ نکلے، لیکن پھر اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ وہ بڑی آسانی سے ارغنداب کے اڈے سے اس کا پتہ چلا کر گھر پہنچ جائیں گے، اور اس کے بعد اس کا جو حشر ہو گا، اس کی بہت

Scanned with CamScanner

سی کہانیاں اس نے سن رکھی تھیں۔

وہ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ نہ جانے انھیں اندر کتنی دیر لگے گی؟ اس نے اپنے پاؤں کے قریب پڑی پانی کی بوتل نکالی کر منھ سے لگائی اور غٹ غٹ آدھی بوتل پی گیا۔ پھر وہ اٹھا اور پیچھے جا کر تین آدمیوں والی ایک سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ ابھی اس کی سوچیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگی تھیں کہ اندر سے گولی چلنے کی تیز آواز نے اسے ہڑبڑا کر رکھ دیا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور لپک کر دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس نے میٹر پر نظر دوڑائی۔ ٹینکی میں ابھی اتنا تیل تھا کہ گاڑی ارغنداب تک پہنچ جاتی۔

27

زرمینہ شاید موسیٰ نیکہ کی سب سے خوب صورت لڑکی نہیں تھی، لیکن جب وہ گردن تان کر چلتے چلتے مڑ کر دیکھتی تو پاؤجان کو لگتا تھا کہ اس کے قدموں تلے سے زمین کھسک رہی ہے۔

زرمینہ کا باپ الف نور موسیٰ نیکہ کی سرائے کا مالک تھا۔ ویسے تو ہندوستان سے افغانستان جانے والے اکثر قافلے بولان یا ٹوچی کے دروں سے گزرتے تھے، لیکن بعض اوقات وہاں لڑائی یا کسی اور وجہ سے راستہ بند ہوتا۔ اس صورت میں بنوں، ڈیرہ اسمٰعیل خان، ٹانک اور خود وزیرستان کے مختلف علاقوں کے مسافر افغانستان جاتے ہوئے موسیٰ نیکہ سے گزرتے ہوئے الف نور کی سرائے میں ایک رات ضرور ٹھہرتے تھے، کیوں کہ اس کے بعد اگلی منزل افغانستان میں بیس میل دور برمل میں تھی۔ البتہ سردیوں میں نیزہ نرئی کا درہ برف گرنے سے بند ہو جاتا تھا اس لیے اس دوران قافلوں کی آمد و رفت بھی معطل ہو جاتی۔

لڑکپن کی حدوں میں داخل ہونے کے بعد کبھی پاؤجان کی ہمت نہیں پڑی تھی کہ زرمینہ سے بات کر سکے، البتہ ایک دن اس نے اپنے بڑے بھائی کی واسکٹ سے چونی چرا کر دکان سے میٹھی گولیاں خریدیں اور موقع پا کر زرمینہ کے ہاتھوں میں تھما دیں۔ زرمینہ تیز زبان کی مشہور تھی اور پاؤجان کو ڈر تھا کہ کہیں وہ کچھ کہہ نہ بیٹھے، لیکن اسے حیرت ہوئی کہ اس نے ایک لحظہ سوچ کر گولیاں اپنے دوپٹے کے پلو میں ڈال لیں، اپنی لمبی گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے اپنے گھر کے اندر چلی گئی۔

اگلے ایک ہفتے تک پاؤجان کے قدم زمین پر نہ پڑتے تھے۔ لیکن ایک مسئلہ تھا۔ وہ خود طوری خیل تھا، جب کہ زرمینہ گنگی خیل قبیلے سے تعلق رکھتی تھی اور ان کا خیل لڑکیاں باہر دینا پسند نہیں کرتا تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ سرائے کا مالک ہونے کی وجہ سے الف نور ان کے مقابلے میں خاصا

Scanned with CamScanner

مالدار تھا۔ پاؤجان کا مرحوم باپ مونجی کی ٹوکریاں اور تھیلے بنا کر بیچا کرتا تھا، اور اب یہ ہنر اور کاروبار اس کے منجھلے بیٹے کو منتقل ہو گیا تھا۔

لیکن پاؤجان ان مشکلات سے کہاں ہار ماننے والا تھا۔ اس نے ایک دن اپنی ماں سے بات کی لیکن ماں کا رویہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ جہاں تک بھائیوں کا تعلق تھا تو ان سے کسی خیر خواہی کی امید نہیں تھی۔ پہلے تو ماں حیلوں بہانوں سے اسے ٹالتی رہی، آخر ایک روز اس نے پاؤجان کی ضد سے تنگ آ کر زرینہ کے باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پاؤجان اس کو الف نور کے گھر کے دروازے تک چھوڑنے گیا اور خود باہر گلی کے ایک سرے سے دوسرے تک پاؤجان جلی بلی کی طرح چکر لگانے لگا۔

کیا ہوا، کیا کہا انھوں نے؟ پاؤجان نے پوچھا۔

تھوڑا دم تو لینے دو بے صبرے، سڑک پر ساری بات بتا دوں، گھر پہنچنے دو، ماں نے کہا۔

اس وقت آس پاس کون ہے جو ہماری بات سن رہا ہوگا، نہ ہی ہماری اتنی اہمیت ہے کہ لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر ہماری ٹوہ میں لگے رہیں گے۔

ماں نے سنی ان سنی کر دی۔ ان کا گھر قریب ہی تھا، گلی سے مڑے اور تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر گھر پہنچ گئے۔ دونوں بھائی کئی دنوں سے غزنی گئے ہوئے تھے اور بڑی بہو بچوں کے ہمراہ میکے میں تھی۔ ہاں اب بتاؤ، پاؤجان نے اپنے پیچھے دروازے کی بلی لگا کر اسے مضبوطی سے بند کرتے ہوئے کہا۔ اب کوئی جاسوس ہماری بات نہیں سن سکے گا۔

بیٹا بات یہ ہے کہ انھوں نے ایک طرح سے ہاں کر دی ہے، ماں نے کہا۔

پاؤجان نے زور سے تالی بجائی اور ماں کو بانہوں میں اٹھا کر صحن میں گھمانے لگا۔

ارے چھوڑ مجھے باندر کہیں کے، میرے بات تو سنو، ماں ہنستے ہنستے بولی۔ میں نے کہا ہے ایک طرح سے مان لی ہے۔

پاؤجان رک گیا اور ماں کو صحن کے فرش پر اتار دیا۔ ایک طرح سے دو طرح سے تین

طرح سے ماننا کیا ہوتا ہے؟ پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو، سیدھی بات کرو، کیا کہا انھوں نے؟

بھئی، سیدھی بات تو یہ ہے کہ میں تمھاری ضد کی وجہ سے چلی گئی ورنہ مجھے ڈر تھا کہ الف نور یہ بات سن کر ہتھے سے نہ اکھڑ جائے، آخر خیل الگ، حیثیت الگ، ہمارا ان کا کیا جوڑ۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے تمھاری تعریف کی۔

واقعی؟ کیا کہا؟

اس نے رائفل چھیننے کا واقعہ سن رکھا ہے۔ کہنے لگا جوان تو ہے ہمت والا۔

اچھا تو پھر اگلی بات کیا ہوئی؟

بس ایسی بات کہہ دی کہ جس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ دودھ تو دیا لیکن ساتھ میں مینگنیاں بھی ڈال دیں۔

آگے چلو، جلدی۔

انھوں نے ڈھائی سو روپے دلوار مانگا ہے۔

لیکن مان تو گئے ہیں؟ ہاں تو کر دی ہے نا؟ فتح خان برآمدے میں اتن ناچنے لگا۔ دو سو ڈھائی سو روپے کی بات بعد میں کریں گے۔

تو تم ڈھائی سو کہاں سے لاؤ گے؟ میں نے تمھاری دلھن کے لیے سونے کی دو چوڑیاں رکھی ہوئی تھیں، اللہ بخشے تمھارے ابا ہندوستان سے لے کر آئے تھے۔ لیکن وہ تمھارے بڑے بھائی صاحب نے صندوق کا تالا توڑ کر بیچ دیں، اب میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔

پاؤجان صحن کے کنارے فرش کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ ہوں، ڈھائی سو روپے! اس نے کہا اور اپنی چھدری داڑھی کھجانے لگا۔

تمھارے رفل چھیننے کے واقعے کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ جو بھی ہو لڑکا ہے بڑا جی دار، ماں نے کہا، اور پھر کچھ سوچ کر بولی، ویسے یہ تمھاری بندوق کتنے کی ہے؟ اس دن نیاز بین کی ماں بتا رہی تھی کہ اس طرح کی انگریزی رفل دو سو ڈھائی سو سے کم کی نہیں بکتی۔

Scanned with CamScanner

'کہنا کیا چاہتی ہو تم ماں؟ میں ان کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے اپنی تھری ناٹ تھری بیچ دوں؟'

'بھئی مجھے کیا پتہ، میں بے چاری غریب بیوہ عورت ہوں، تمھارا باپ کوئی گھوڑوں کا سوداگر نہیں تھا، ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے اس کے ٹوکریاں بنا بنا کے۔ مرتے وقت چالیسویں تک کے پیسے نہیں چھوڑ کر گیا۔ اب تم جانو اور تمھارا کام۔'

'تمھیں پتہ ہے میں نے موت کے منہ میں پنجہ ڈال کر یہ بندوق حاصل کی ہے، اب تم اسی کو بیچنے کی صلاح دے رہی ہو؟' پاؤ جان نے کہا۔

'میں کوئی صلاح ولاح نہیں دے رہی، میں نے تو صرف ایک بات کہی ہے۔ خود ایک طرف تو وہ لڑکی تمھارے سر پر سوار ہے، کب سے میرا دماغ کھا رہے ہو، دوسری طرف ایک بندوق کے لیے بھی مرے جا رہے ہو۔ بھئی مجھے کچھ نہیں پتہ تم خود فیصلہ کر لو کہ تمھیں بندوق چاہیے یا لڑکی، میں اپنے باپ کی بیٹی نہیں جو آگے ایک لفظ بھی اس معاملے پر بولوں' ماں نے کہا اور چولھے میں پھونکیں مارنے لگی۔

پاؤ جان نے دیوار سے بندوق اتاری اسے کندھے پر ڈال کر باہر نکل گیا۔

28

شفیق نے دیکھا کہ ان پٹھہ برداروں کی داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں، آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں، اور کپڑے ایسے گندے مندے تھے جیسے زمین پر لوٹتے رہے ہوں۔ بعضوں کے چہروں سے ایسی وحشت برستی تھی جیسے قربانی کے جانور پر اللہ اکبر کہنے سے ایک لمحہ قبل نظر آتی ہے۔ کچھ کے چہرے ایسے سپاٹ تھے جیسے کلاس کے مانیٹر نے استاد کے آنے سے پہلے تختہ سیاہ خوب رگڑ رگڑ کر صاف کر دیا ہو۔ ان میں ہر عمر اور قسم کے لوگ تھے۔ بعض کے چہروں پر ابھی پوری داڑھیاں نہیں آئی تھیں اور ایسے بھی تھے کہ جن بھنویں تک سفید ہو چلی تھیں۔ ان میں سے کچھ نے شفیق اور اس کی ٹولی کی آہٹ سن کر گردنیں موڑ موڑ کر دیکھا، دوسروں کی نظریں اپنے گھٹنوں ہی پر جمی رہیں۔

ان گردن بستہ قیدیوں کے پیچھے برآمدہ تھا جس کے پیچھے دو کمرے تھے۔ برآمدے میں آٹھ دس قبائلی کھڑے ہوئے تھے۔ ان سب کی لمبی داڑھیاں تھیں اور سروں پر صافے بندھے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف یا اسی قسم کی کوئی اور رائفل یا بندوق تھی۔ ناٹے نے شفیق، ٹھیکیدار اور نوجوان کو دوسرے قیدیوں سے الگ دیوار کے قریب بیٹھنے کو کہا اور دور ہی سے برآمدے میں کھڑے قبائلیوں سے جا ملا اور ان سے بغل گیر ہونے کے بعد ہنسی مذاق میں مشغول ہو گیا۔

شفیق کو چس س س کی آواز کے ساتھ بھنے گوشت کی خوشبو آئی تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ احاطے کی پچھلی طرف ایک جھاڑ جھنکار نما گھاس کے ٹکڑے پر ایک کباب نے کچی مٹی سے لیپا ہوا تھڑا سجا رکھا تھا۔ مٹی سے بنے ہوئے چھوٹے سے چبوترے پر کڑاہا رکھا ہوا تھا، جس کے سامنے ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ سرخ قیمے سے

Scanned with CamScanner

لتھڑے ہوئے دائیں ہاتھ سے کباب کی تکی کڑکڑاتے ہوئے تیل میں دھکیلتا اور بائیں ہاتھ میں پکڑے لمبے کڑچھے سے تیل میں تلملاتی ہوئی ٹکیوں کو الٹ پلٹ دیتا۔

کباب والے کے ساتھ آٹھ دس برس عمر کا ایک چھوٹا بھی تھا، جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد اٹھ کر کڑاہے کے نیچے جلتی آگ میں خشک جھاڑیاں جھونک دیتا تھا۔

شفیق تن بہ تقدیر ہو کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ معلوم نہیں ایک گھنٹہ گزرا کہ دو کہ ایک گاڑی اور آرکی اور اس میں سے سات آٹھ لوگ نکل کر برآمدے میں چلے گئے۔ ذرا دیر بعد گھما گھمی شروع ہوگئی۔ کالی واسکٹ میں ملبوس ایک دبلے پتلے شخص نے تمام قیدیوں سے ان کے نام، ولدیت اور قریبی رشتے دار کا موبائل نمبر پوچھ کر کاپی میں لکھنا شروع کر دیے۔ شفیق کی زبان پر بہت عرصے کے بعد اپنے باپ کا نام آیا تھا۔ اسے مرے ہوئے پندرہ سال گزر گئے تھے یا شاید سولہ۔ بس اتنا ہے کہ شفیق کی شادی کے ایک دو سال بعد وہ رخصت ہو گیا تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو کیا وہ اپنے بیٹے کی بازیابی کے بھاگ دوڑ کرتا؟ لیکن وہ بے چارہ تو خود راجہ بازار میں ریڑھی لگاتا تھا، جس سے اس کے چھ بچوں کے پیٹ مشکل سے پلتے تھے۔ وہ کہاں سے کروڑوں کا تاوان جمع کرتا؟ مفت میں خوار ہی ہوتا۔

شفیق نے اپنے بیٹے ارسلان کا نمبر لکھوا دیا۔ اسے اپنی بیوی عائشہ اور بیٹی شائستہ کا خیال آیا۔ نہ معلوم اسے لاپتہ ہوئے کتنا وقت گزر چکا ہے۔ اغوا کی رات جب وہ وقت پر گھر نہیں پہنچا ہوگا تو شاید ارسلان نے اسے فون کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن اس کے پاس دو دن سے فون کا بیلنس ختم تھا، اور صبح بھی وہ سکول جاتے ہوئے پیسے مانگ رہا تھا مگر شفیق نے بلاوجہ کہہ دیا تھا کہ شام کو لے لینا، حالانکہ اس کے پاس بٹوے میں چھ سو روپے موجود تھے۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اگر وہ اسے سو روپے دے دیتا تو کیا ہوتا۔ اور عائشہ کتنی پریشان ہوگی، اس کے پاس کیسے میں دو ڈھائی ہزار پڑے تھے۔ اس نے ارسلان کو پیسے دے کر بیلنس ڈلوا لیا ہوگا اور اب اس سے بار بار فون کرواتی ہوگی۔ لیکن شفیق کے پاس تو اس کا موبائل ہی نہیں تھا۔ شاید وہ سفید کار والوں نے

اس کی جیب سے نکال لیا ہوگا۔ شفیق کو عائشہ کا خیال آنے لگا۔ کبھی کبھی وہ پیر دھائی میں چند ڈرائیوروں اور ورکشاپ کے دوستوں کے ساتھ مل کر ہوٹل کے وی سی آر پر فلمیں دیکھتا تھا یا پھر تاش کی بازی لگا لیتا تھا، لیکن شادی کے بعد گھر سے بغیر بتائے پوری رات غائب نہیں رہا تھا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ ارسلان خوب پڑھے لکھے۔ وہ تو خیر درمیانے درجے کا طالب علم تھا لیکن اس کی بڑی بیٹی شائستہ پڑھائی میں بہت تیز نکلی تھی اور پچھلے سال نویں کے امتحان میں اپنی کلاس میں دوسرے نمبر پر آئی تھی۔ اول نمبر پر خود ہیڈ ماسٹر کی بیٹی تھی، اس لیے شفیق کو پورا یقین تھا کہ ہیڈ ماسٹر نے ڈنڈی ماری ہوگی، ورنہ اس کی بیٹی کسی بھی طرح شائستہ سے زیادہ لائق نہیں ہو سکتی۔

کسی نے شفیق کے کندھے پر ٹہوکا دے کر اس کی سوچوں کے سلسلے کو توڑ دیا۔ کباب والے کے چھوٹے نے بغیر کچھ کہے سنے اس کے ہاتھ میں ایک روٹی تھما دی جس پر کالے تیل میں لتھڑی ہوئی کباب کی ٹکیہ پڑی تھی، اور ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا۔ شفیق نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ 'دو سو روپے!' اس نے کہا۔ شفیق نے بٹوہ نکالا اور اسے سو سو کے دو سرخ نوٹ نکال کر دے دیے۔ اس نے سوچا، یہی غنیمت ہے کہ ان لوگوں نے میرا بٹوہ نہیں نکالا۔ لڑکا واپس تھڑے کی طرف لوٹ گیا اور دوسرے قیدیوں میں روٹیاں اور کباب بانٹنے لگا۔ شفیق نے روٹی کا ٹکڑا لیا اور اس سے کباب کا ایک کونہ پکڑ کر کھانے لگا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے آج ناشتہ بھی نہیں کیا تھا کیوں کہ صبح ہی صبح وہ تین قبائلی آ گئے تھے۔ پتہ نہیں کباب ہی اچھا بنا تھا یا پھر وہ اتنا بھوکا تھا کہ اسے یہ کھانا بہت لذیذ معلوم ہوا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اکثر قیدی سر جھکائے آہستہ آہستہ روٹی سے کباب کے لقمے توڑ توڑ کر کھا رہے تھے۔

کباب ختم ہوا تو شفیق نے لتھڑی ہوئی انگلیاں کپڑوں پر مار کر صاف کیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ منشی دکھائی دینے والا شخص کمرے سے نکل آیا اور اپنی کاپی میں دیکھ کر پکارا، 'شاہنواز علی، شاہنواز علی کون ہے؟'

ایک موٹا سا شخص جس کے سر کے آدھے بال اڑ چکے تھے، زمین پر دونوں ہاتھ لگا کر

Scanned with CamScanner

بمشکل اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا پٹہ اس کی تومند پر جھولنے لگا۔ منشی نے اسے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد منشی نے ایک اور نام پکارا اور اسے بھی کمرے کی طرف لے گیا۔

پانچ سات منٹ بعد موٹا اندر سے نکل آیا۔ اس کا پٹہ ایک لمبے تڑنگے مرد کے ہاتھوں میں تھا جو اسے کھینچتا ہوا احاطے سے باہر لے گیا۔ منشی واپس آیا اور دو اور لوگوں کے نام پکار کر انھیں اندر لے گیا۔

شفیق کی باری اس وقت آئی جب سورج ڈھلنے کے قریب تھا اور احاطے میں چند ہی قیدی باقی بچے تھے۔ کچھ دیر پہلے کباب والا بھی اپنا کڑاہ کندھے پر لاد کر چلتا بنا تھا۔ منشی شفیق کے علاوہ ایک اور شخص کو کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ آٹھ دس ہتھیوں والی کرسیاں پڑی تھیں جن پر وہی قبائلی بیٹھے ہوئے تھے جنھیں شفیق نے آتے وقت برآمدے میں کھڑے دیکھا تھا۔ منشی جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دوسری کرسیوں کے برعکس اس کرسی کے آگے میز بھی تھی۔ انھیں کسی نے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا اس لیے شفیق اور دوسرا مرد قطار کے سامنے کھڑے رہے۔ منشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا، چودھری غفار؟'

شفیق کے ساتھ آنے والے شخص نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ بھاری ٹھسے اور چوڑے کلے والا پچاس پچپن برس کی عمر کا شخص تھا۔ شاید چند دن پہلے تک وہ بہت بارعب اور دبدبے والا رہا ہو گا لیکن اب شفیق کو اس کی آنکھوں سے ایسی بے چارگی پھوٹتی نظر آ رہی تھی جو مچھلی فروش کے تھڑے پر دھری مچھلی کے کھلے دیدوں میں نظر آتی ہے۔

شفیق کو اچانک احساس ہوا کہ وہ دراصل کسی سکول کے اندر موجود ہیں۔ قبائلیوں کی کرسیوں کی قطار کے پیچھے ایک تختہ سیاہ تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹی پھوٹی بینچوں کا ڈھیر پڑا تھا جو عام طور پر سرکاری سکولوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ تو یہ سکول ہے، لیکن اس کے اندر کیا ہو رہا ہے؟ شفیق کو اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔

زرجانان نے گاڑی سٹارٹ تو کر دی لیکن پاؤں بریک سے نہیں ہٹا سکا۔ حویلی کے اندر سے دو فائر اور ہوئے اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر تذبذب کے عالم میں رہنے کے بعد زرجانان نے ٹھنڈی سانس لے کر انجن بند کر دیا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر حویلی کے بڑے دروازے پر نظریں گاڑ دیں۔ پانچ سات منٹ گزرے۔ پھر دروازہ بھاری چرچراہٹ سے کھلا اور اندر سے طالبان برآمد ہوئے اور ایک قطار میں گاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔

اس بار ان کے ہمراہ ایک اور شخص بھی تھا جس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں پر پٹی تھی۔

کماندار فرنٹ سیٹ پر، لنگڑا اس سے پچھلی سیٹ پر اور باقی لوگ ٹھنس ٹھنسا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہاتھ بندھے شخص کو گاڑی کے فرش پر بٹھا دیا گیا۔

زرجانان نے سوالیہ نظروں سے کماندار کی جانب دیکھا۔ 'واپس ارغنداب'، اس نے کہا۔ گاڑی ڈھلوان سے لڑھکتے ہوئے نیچے اترنے لگی۔ جب نیچے میدان میں پہنچ کر گاڑی قندھار جانے والی سڑک پر رواں ہو گئی تو کماندار نے زرجانان کی طرف مڑ کر پوچھا، 'زرجانان، اس آدمی کو پہچانتے ہو جو پیچھے بیٹھا ہوا ہے؟'

'نہیں ملاصیب، میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا۔' زرجانان نے نوٹ کیا تھا کہ باقی طالب کماندار کو ملاصیب کہہ کر پکار رہے تھے۔

'یہ موسیٰ خان ہے۔ تمھارے ارغنداب کا جنگی غنڈہ۔ یہی ہے وہ شخص نے جس کا بقول تمھارے بس چلتا تو پہاڑوں اور ٹیلوں سے بھی خون نچوڑنے سے باز نہ آتا۔ ڈاکہ، چوری، دوسروں کی بہو بیٹیاں اٹھانا اس کا روز کا معمول تھا، حتیٰ کہ یہ تخم حرام لڑکوں تک کو نہیں بخشتا تھا۔ بہت

Scanned with CamScanner

چھپتا پھرا، لیکن آج قابو میں آ ہی گیا۔'

راستے میں وہی مقام آیا جہاں زرجانان نے سڑک کے کنارے پر گاڑی الٹی پڑی دیکھی تھی۔ وہاں سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر زرجانان کی ہتھیلیوں پر ہلکا سا پسینہ آ گیا۔ اس نے کوشش کر کے ٹائر ہو بہو وہیں سے گزارے جہاں سے پہلے گاڑی گزری تھی۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ملاصیب نے اچانک کہا، 'بس گاڑی یہیں روک دو۔'

زرجانان نے کوئی خطرہ مول نہ لیتے ہوئے گاڑی کنارے پر کرنے کی کوشش نہیں کی اور سڑک پر ہی روک دی۔ کوئی گاڑی آتی ہے تو خود ہی نیچے اتر کر گزر جائے گی۔

'نیچے لے آؤ اسے،' ملاصیب نے گاڑی سے اترتے ہوئے حکم دیا۔

طالبان نے موسیٰ خان کو گھسیٹتے ہوئے نیچے اتار دیا۔ یہاں دور تک دھول سے اٹا دشت حدِ نگاہ تک پھیلا تھا جس کے بیچ میں کہیں کہیں بدرنگ جھاڑیاں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔

'موسیٰ خان!' ملاصیب نے بلند آواز سے کہا جیسے سینکڑوں کے مجمعے سے خطاب کر رہے ہوں۔ 'تم پانچ سال تک پورے علاقے میں قہر برساتے رہے۔ اس دوران تم نے کتنے گھر اجاڑے، کتنے لوگوں کی زندگیوں میں زہر گھول دیا۔ جب یہاں بدبخت طلدروی آئے تھے تو تم اپنے دین اور اپنے ملک سے غداری کر کے ان سے جا ملے تھے۔ تم سمجھتے تھے کہ تم سے کوئی حساب لینے والا نہیں ہے۔ لیکن آج میں تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ تمھارا یوم حساب آ گیا ہے۔'

موسیٰ خان چپ چاپ سر جھکائے کھڑا سنتا رہا۔ ملا کی تقریر کے دوران اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔

'تمھارے بے شمار گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ یہ تھا،' ملاصیب نے اپنا خطاب جاری رکھا۔ 'کہ تم نے روسیوں کے ساتھ مل کر اس علاقے کو بارودی سرنگوں سے بھر دیا تاکہ یہاں مجاہدین نقل و حرکت نہ کر سکیں۔ آج وہ وقت آ گیا ہے جب تمھیں وہ کانٹے اپنے نگوں سے چننا ہوں گے جو تم نے دوسروں کے لیے بوئے تھے۔ یہ سامنے پہاڑ دیکھ رہے ہو؟' ملاصیب نے

مغرب کی طرف اشارہ کیا۔ موسیٰ خان بدستور سر جھکائے کھڑا رہا۔ زرجانان نے ملاصیب کے اشارے کی طرف گردن گھمائی۔ دشت کا مغربی حصہ کٹا پھٹا اور ناہموار تھا اور بتدریج اوپر اٹھتے ہوئے ایک ڈیڑھ کلومیٹر دور پست قامت پہاڑیوں کے سلسلے سے جا ملتا تھا جن کے پیچھے سرحد کی دوسری طرف کے نیلے پہاڑ چوٹیاں تانے کھڑے تھے۔

'لیکن تمھارے تمام تر سیاہ نامہ اعمال کے باوجود میں پھر بھی تمھیں ایک موقع دے رہا ہوں،' ملاصیب نے کہا۔ 'تھری ناٹ تھری کی گولی چھ سو گز تک آسانی سے مار کر سکتی ہے۔ اچھا نشانہ باز ہو تو سات آٹھ سو گز تک بھی شکار کر سکتا ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں پائندہ خان کا نشانہ سب سے اچھا ہے۔ پائندہ خان آگے آؤ۔' یہ وہی لنگڑا تھا جس کے پاس تھری ناٹ تھری دیکھ کر زرجانان کو حیرت ہوئی تھی۔ اس نے اپنی رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ 'پائندہ خان نے ساڑھے سات سو گز تک بھی ٹھیک نشانے پر گولی ماری ہے۔ کیوں پائندہ خان، صحیح کہہ رہا ہوں میں؟'

'جی ملاصیب،' پائندہ خان نے کہا۔ اس کی آواز اس کے جسم سے بالکل لگا نہیں کھاتی تھی اور کہیں زیادہ مہین تھی۔

'اور پائندہ خان وہ پہاڑی تمھارے خیال میں کتنے فاصلے پر ہوگی یہاں سے؟'

'ملاصیب، سی سی تو پتہ نہیں ہے لیکن اندازہ ہے کہ ہزار، بارہ سو گز تک ہوگی۔'

'تو اگر کوئی بندہ اس پہاڑی کے دامن تک پہنچ جائے وہ تمھاری زد سے باہر نکل جائے گا؟'

'جی ملاصیب، وہاں تک سی نشانہ نہیں لگایا جا سکتا۔ بہت مشکل ہے۔'

'سن لیا موسیٰ خان؟ میں تمھیں موقع دے رہا ہوں۔ وہی موقع جو تم نے کبھی کسی کو نہیں دیا۔ اگر تم اس پہاڑی کے دامن میں اس سیاہ چٹان تک پہنچ کر پائندہ خان کی بندوق کی زد سے نکل جاؤ تو تمھارے اگلے پچھلے گناہ معاف ہیں۔ بس آئندہ کبھی ہمیں نظر آنا۔ شرط یہی ہے کہ تم نے دس

Scanned with CamScanner

منٹ کے اندر اندر بالکل ناک کی سیدھ میں چلتے ہوئے چٹان کی طرف چلنا ہے، اگر تم نے ادھر ادھر ہونے کی کوشش کی یا دس منٹ تک چٹان کو ہاتھ نہیں لگایا تو پھر تم سمجھ جاؤ گے کہ پائندہ خان کا نشانہ اتنا مشہور کیوں ہے۔ پائندہ خان اس کے ہاتھ کھول دو۔'

موسیٰ خان کے ہاتھ کس کے باندھے گئے تھے۔ گرہ کھولتے ہوئے دیر ہونے لگی تو ایک اور طالب نے چاقو نکال کر وہ رومال کاٹ دیا جس سے اسے باندھا گیا تھا۔ موسیٰ خان نے اپنے ہاتھ سہلائے اور پھر اپنی پگڑی سیدھی کی جو ڈھیلی ہو کر اس کی آنکھوں کے آگے آ گئی تھی۔ اس نے شاید پورے سفر کے دوران پہلی بار سر اٹھا کر دیکھا۔ مغربی پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے منہ سے خرخر آواز نکلی جیسے ذبح ہوتے ہوئے جانور کے کٹے ہوئے گلے سے برآمد ہوتی ہے۔

'نہیں ملاصیب، یہ ظلم نہ کرو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں مر جاؤں گا۔' وہ ملاصیب کے قدموں پر گر گیا۔ ملاصیب پیچھے ہٹ گئے۔ دو طالبان نے موسیٰ خان کو پکڑ کر اپنے قدموں پر کھڑا کر دیا۔

'موسیٰ خان، شرعی عدالت سے تمھارے لیے سزائے موت کا فیصلہ آ گیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں تمھیں ارغنداب کے بڑے چوک میں بجلی کے کھمبے سے لٹکا کر پھانسی دے دیتا۔ میں تو تمھیں یہ سہولت دے رہا ہوں۔ فیصلہ تمھارے ہاتھ میں ہے۔ تم آج شام تمام ارغنداب کے سامنے کھمبے سے جھولنا چاہتے ہو یا آٹھ نو سو گز کا یہ راستہ پار کر کے جان بچانے کی کوشش کرنا چاہتے ہو۔'

ملاصیب کے اشارے پر ایک طالب نے موسیٰ خان کے جوتے اتار دیے۔ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور اس کا پورا بدن کپکپا رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس طرح سفید پڑ گیا تھا جیسے کسی نے منہ پر پاؤڈر کا پورا ڈبہ تھوپ دیا ہو۔ زرجانان کو لگا جیسے وہ ابھی زمین پر ڈھیر ہو جائے گا۔ 'چلو، جلدی کرو،' پائندہ خان لنگڑا کر آگے بڑھا اور اسے اپنی رائفل کی

نال سے ٹہوکہ دیا۔ موسیٰ خان کچھ دیر پڑا رہا۔ پھر اس کے بدن میں ایک لہر دوڑی اور وہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر اٹھ کھڑا۔

'چلو! تمھارا وقت شروع ہو گیا ہے!' ملاصیب نے تیز آواز سے کہا۔

موسیٰ خان مرے ہوئے قدموں سے چٹان کی جانب چل پڑا۔ وہ ہر قدم ایسے اٹھا رہا تھا جیسے اس کے ساتھ بیس بیس سیر کا لوہا بندھا ہوا ہو۔

'موسیٰ خان، دو منٹ ہو گئے اور تم نے ابھی پچاس گز بھی طے نہیں کیا۔ پائندہ خان شست لے رہا ہے،' ملاصیب نے کہا۔

یہ سن کر موسیٰ خان نے رفتار تیز کر دی۔ 'چار منٹ،' ملاصیب نے بلند آواز میں کہا۔ موسیٰ خان اب لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ 'اور تیز، چھ منٹ ہو گئے، موسیٰ خان،' ملاصیب نے پکار کر کہا۔ موسیٰ خان نے تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔ زرجانان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا موٹا اور ناٹا شخص، جس کے بدن کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اس نے کبھی ٹیکوں لگے صوفے سے اتر کر پانی تک نہیں پیا ہوگا، وہ کیسے بچوں کی سی پھرتی سے بھاگ سکتا ہے۔ اس کا ہر قدم دشت کی خشک مٹی میں دھول کا ایک چھوٹا سا مرغولہ چھوڑتا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے ہتھیلیاں کھول لی تھیں اور دونوں بازو کہنیوں سے مڑے ہوئے ہر قدم کے ساتھ تیزی سے اوپر نیچے چل رہے تھے۔

چٹان اب موسیٰ خان سے زیادہ دور نہیں تھی۔ تمام طالبان سڑک کے کنارے کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زرجانان نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ اگر موسیٰ خان کا دل نہیں پھٹا اور وہ اسی رفتار سے بھاگتا رہا تو اگلے تین منٹ کے اندر اندر اپنی منزل تک پہنچ جائے گا۔ اس نے ملاصیب کی طرف دیکھا۔ ان کا ہاتھ تیزی سے تسبیح پر چل رہا تھا۔ کیا انھوں نے فاصلے کا تعین کرنے میں غلطی کر دی ہے؟ یا پھر انھیں موسیٰ خان کی پھرتی کا درست اندازہ نہیں لگا یا۔ اس نے نظریں دوبارہ موسیٰ خان پر ٹکا دیں۔ وہ شاید اپنے بدن میں موجود توانائی کا آخری قطرہ تک جھونک کر اڑا چلا جا رہا تھا۔ اب چٹان اس سے صرف سو قدم دور رہ گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

پائندہ خان گھٹنے پر رائفل ٹکائے، اپنی لنگڑی ٹانگ ایک عجیب زاویے پر موڑے، دشت میں سے دیکھتے ہوئے نال بھاگتے ہوئے موسیٰ خان کے ساتھ ساتھ گھما رہا تھا۔ لیکن شاید اسے اپنے ہنر کی نمائش کا موقع نہیں ملے گا۔ موسیٰ چٹان کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کی رفتار تھوڑی سست پڑ گئی تھی لیکن اتنی نہیں کہ وہ چٹان تک نہ پہنچ سکے۔ ابھی زرجانان یہی سوچ رہا تھا کہ جہاں موسیٰ خان بھاگا جا رہا تھا وہاں مٹی کا ایک بادل زمین میں سے تیزی سے نکل کر بیس پچیس فٹ تک ہوا میں بلند ہوا اور پھر بکھر گیا۔ دھماکے کی گھٹی ہوئی آواز ایک لمحے کے بعد آئی۔ زرجانان نے موسیٰ خان کی پگڑی ہوا میں دور تک فٹ بال کی طرح اچھلتے دیکھی۔ دھول آہستہ آہستہ نیچے بیٹھنے لگی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ دشت میں سورج کی زرد آلود آخری کرنیں رخصت ہونے لگیں۔

"خس کم جہاں پاک"، ملاصیب مڑ کر گاڑی کی طرف چل دیے۔ زرجانان دوسری طرف سے گیا اور اوپر چڑھ کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک بار پھر قندہار کی طرف رواں دواں تھا۔ ملاصیب بولے: "یہ بدبخت جنگی سردار بننے سے پہلے روسیوں کا مخبر تھا۔ یہ جو مشرق میں پہاڑیاں ہیں، یہ کوہِ سلیمان کا حصہ ہیں۔ ان کے پیچھے تو بہ معروف ہے، افغانوں کے جد بابا ابدالی کا آبائی علاقہ۔ وہیں سے ہو کر راستہ پاکستان جاتا ہے۔ اس موسیٰ خان نے تو بہ معروف سے پاکستان جانے والے مجاہدین کی آمد و رفت کے راستے روسیوں کو بتا کر انھیں بارودی سرنگوں سے ڈھکوا دیا تھا۔ میرے استاد، ملا عبداللہ جان، جنھوں نے نہ صرف مجھے الف بے کی پہچان کروائی تھی بلکہ پہلی گولی چلانا سکھائی تھی، وہ اسی میدان میں پاکستان سے آتے ہوئے ایک سرنگ کا نشانہ بن گئے تھے۔ اللہ ان کی ہڈی ہڈی کو جنت میں اعلیٰ مقام دے۔"

باقی راستہ خاموشی سے کٹا۔ ارغنداب کے بازار میں ملاصیب نے گاڑی رکوا دی۔ دوسرے طالبان اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے لیکن ملاصیب کے پہلے اترنے کے انتظار میں احتراماً رکے رہے۔ ملاصیب نے زرجانان کی طرف دیکھا۔ "زرجانان، تم بہت اچھے ڈرائیور معلوم ہوتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ آ جاؤ۔ تمھیں کوچ کا مالک جتنی تنخواہ دیتا ہے، میں اس سے

ایک ہزار روپے زیادہ دوں گا۔ ہماری گاڑیاں دو چار دن تک آ جائیں گی۔"

ملاصیب نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور بغیر گنے چند نوٹ نکال کر زرجانان کی طرف بڑھائے۔ اس نے روایتی تکلف کیا لیکن ملا نے نوٹ زبردستی اس کی مٹھی میں پکڑا دیے اور گاڑی سے اتر گئے۔

زرجانان گاڑی لے کر اڈے کی طرف چلا گیا۔ اب غزنی جانے کا وقت نہیں رہا تھا اس لیے اس نے گاڑی بند کی اور گھر کی طرف جانے لگا۔ بڑے چوک میں خاصی بھیڑ تھی۔ زرجانان نے چوک کے بیچ میں لگے بجلی کے بڑے کھمبے کی طرف دیکھا۔ وہاں پلاسٹک کے چند شاپنگ بیگ اور ایک سفید رنگ کی پتنگ ہلکی ہلکی ہوا میں جھول رہے تھے۔ البتہ موسیٰ خان کی لاش یہاں نہیں لٹک رہی تھی بلکہ یہاں سے سو کلومیٹر دور ادھڑی ہوئی حالت میں دشت میں پڑی تھی اور شاید اس وقت گیدڑوں اور لومڑیوں کی ضیافت کا سامان بن رہی ہو گی۔ وہی موسیٰ خان جس کا اگر بس چلتا تو وہ پہاڑوں اور دروں کو بھی زنجیروں میں جکڑ کر ان سے خون نچوڑتا رہتا۔

Scanned with CamScanner

30

پاؤجان جب سخت چڑھائی چڑھ کر تورا ایزر رغزہ پہنچا تو مشرقی چوٹیوں پر صبح کی دھندلی سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ وہ کاہو کے ایک بڑے اور گھنے درخت کے نیچے پڑے مستطیل شکل کے کالے پتھر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا اور نیچے وادی میں دیکھنے لگا۔ وادی ابھی تک اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی، البتہ کہیں کہیں سے کسی چڑیا کی چہکار خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔ یہاں ہوا میں خنکی تھی۔ مشکل راستے اور مشقت کی وجہ سے بدن پسینے سے شرابور ہو گیا تھا، اس لیے بلندی کی خنک ہوا اسے بہت خوشگوار محسوس ہوئی۔

پاؤجان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ وہ چند منٹ سستانے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا اور رغزہ پر نگاہ ڈالی۔ اس کی شکل لمبوتری افغانی نان کی طرح تھی، درمیان میں سے چوڑی اور دونوں طرف سے پچکی ہوئی۔ اس کی چوڑائی ایک میل کے قریب ہوگی، جب کہ لمبائی میں یہ پہاڑ سے لپٹتی ہوئی دور تک چلی گئی تھی۔ پہاڑ نیچے جھاڑیوں اور اوپر اوپر درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ خاردار جھاڑیوں اور اونچی گھاس سے اٹی ہوئی وادی کے بیچوں بیچ ایک الگڈ تھا جس کے کناروں پر شرول کے درختوں کے جھنڈ قطار بنا کر چلے آ رہے تھے۔ الگڈ کے بیچوں بیچ صاف ستھری ریت میں سے پانی کی ایک چھوٹی سی نالی بہہ رہی تھی۔ پاؤجان نے سوچا کہ یہ نالی بھی چند ہفتوں کے اندر اندر سوکھ جائے گی اور پھر اگلے سال بہار میں کہیں جا کے دوبارہ رواں ہوگی۔ اس نے بندوق ایک سلیٹی رنگ کے پتھر پر رکھی اور جھک کر چلو میں بھر بھر کر الگڈ کا ٹھنڈا پانی پینے لگا، جس نے اس کے سارے بدن میں تراوٹ بھری دی۔

وہ الگڈ کے کنارے پر جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا اور پہاڑ کے مشرقی پہلو پر آنکھیں جما دیں۔ یہیں پہاڑ کے پیچھے سے چنکارہ رات کو چرنے کے لیے نیچے اترتے تھے، اور

پو پھٹنے کے بعد واپسی کا رخ کرتے تھے۔ ابھی آدھا گھنٹہ نہیں گزرا ہوگا کہ اس نے ایک ڈار ڈھلوان کی طرف سے لاپروائی سے ٹہلتے ہوئے آتے دیکھی۔ ڈار میں چھ یا سات جانور تھے، جن کے بدن بھورے اور پیٹ سفید تھے اور دمیں بمشکل ایک بالشت لمبی ہوں گی۔ بعض جانوروں کے سفید پیٹ اور بھوری کمر کے بیچ میں کالے رنگ کی موٹی آڑی لکیر تھی جو نہایت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ ان کی جسامت بکری کے تین چار ماہ کے بچے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ پاؤجان نے اندازہ لگایا کہ اس میں ایک نر تھا جو چلتے چلتے رکتا تھا اور جھاڑیوں میں منہ مار کر پھر اپنے راستے پر چل پڑتا تھا۔ تین مادائیں اور تین بچے اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

اسی وقت ایک قریبی جھاڑی سے بھرررر کی آواز آئی اور پاؤجان چونک کر اچھل پڑا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس رغزہ میں زہریلے اڑن سانپ پائے جاتے ہیں جو اچانک آ کر گردن یا چہرے پر یوں ڈستے ہیں کہ ان کے شکار کو کلمہ پڑھنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ لیکن پھر اس نے دیکھا کہ رغزہ کے کنارے پر ایک بھورا تیتر پھڑ پھڑاتا ہوا سر کے اوپر سے تیرتا چلا گیا تو اس کی سانسیں معمول پر آ گئیں۔ تیتر پر گولی ضائع کرنا بے معنی تھا اس لیے وہ دوبارہ مشرقی پہاڑ کی متوجہ ہو گیا۔

دور مغرب کی طرف نصف میل کے فاصلے پر پاؤجان کو چنکارہ کی ایک اور ڈار سست قدموں سے چلتے ہوئے نظر آئی، لیکن وہ اس کے نشانے کی زد سے باہر تھی اس لیے اس نے دوبارہ اپنی توجہ پہلی ڈار پر مرکوز کر لی۔ نر خاصا پلا پلایا تھا، جب کہ مادائیں سب سوکھی ساکھی سی تھیں۔ 'لگتا ہے یہاں بھی نر سب کچھ چٹ کر جاتا ہے اور عورت کے لیے کچھ نہیں چھوڑتا'، پاؤجان زیرِ لب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے پہلے فربہ نر کو نشانہ بنانے کا ارادہ کیا لیکن پھر سوچا کہ ایسا نہ ہو کہ پورا کنبہ لاوارث ہو جائے۔ اس نے ایک صحت مند مادہ منتخب کی جو سعادت مندی سے نر کے پیچھے پیچھے کنوتیاں ہلاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا پاؤجان سے فاصلہ چار سو گز کے قریب ہوگا، پاؤجان کو کسی حد تک اعتماد تو تھا کہ وہ اپنی تھری ناٹ تھری سے اس فاصلے سے مادہ کو مار گرا سکتا ہے لیکن پھر اس نے سوچا کہ خطرہ مول لینے سے بہتر ہے کہ اس کے دو سو گز پر آنے کا انتظار کیا جائے تاکہ

Scanned with CamScanner

نشانہ خطا جانے کا امکان کم سے کم رہے۔ اس نے بندوق کی نال ایک پتھر پر ٹکا دی اور ایک آنکھ بند کر کے بندوق کی شست برابر کی اور لبلبی پر انگلی رکھ کر مناسب موقعے کی تلاش کرنے لگا۔

پاؤجان شاہی گرام میں اپنے دوست مسعود کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ موسیٰ نیکہ کی مسماری کے بعد ملک جم خان اور اس کے پالتو پاؤجان کے جانی دشمن بن گئے تھے اور انھوں نے سارا الزام اسی کے سر پر دھر دیا تھا کہ اس نے جرگے کے دوران اپنی رائفل ملک کے حوالے کرنے سے انکار کر کے باقیوں کو بھی بغاوت کی شہ دی تھی۔ پوری ایجنسی میں موسیٰ نیکہ واحد گاؤں تھا جس نے انگریز سے معاہدے کی شرائط پر عمل نہیں کیا تھا، جس کا نتیجہ گاؤں کی بربادی میں نکلا۔ ملک جم خان نے ایک اور جرگہ بلا کر پاؤجان کو گاؤں سے بے دخل کروا دیا تھا۔

بے دخلی کے بعد اس نے کئی مہینے ادھر ادھر بھٹک کر گزارے۔ کبھی ہندوستان پر دھاوا بولنے کے لیے کوئی جتھا تیار ہوتا تھا تو وہ اس کا حصہ بن کر چلا جاتا تھا، کبھی کسی کاروان پر چھاپہ مارنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس سے اتنا کچھ وصول ہو جاتا تھا کہ ایک دو ماہ آرام سے گزر بسر ہو جاتی تھی۔ آخر اس کے بچپن کے ساتھی مسعود نے اسے اپنے حجرے میں ٹھہرنے کی دعوت دی تو اس نے خوشی خوشی قبول کر لی۔ لیکن چند دن سے اس نے محسوس کیا تھا کہ مسعود کے والد اپنے بیٹے کا اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ آج کے شکار کا منصوبہ دونوں نے مل کر تیار کیا تھا لیکن رات کو اچانک مسعود نے پیٹ میں درد کی شکایت کر کے معذرت کر لی اور پاؤجان کو اکیلے ہی آنا پڑا۔ لیکن خیر، جب وہ چنکارہ کاندھے پر لاد کر لے جائے گا تو اس کے لذیذ سکے کھا کر شاید مسعود کے والد کی شکایت دور ہو جائے۔

چنکارہ کی ڈار قریب آتی گئی۔ پاؤجان کی منتخب کردہ مادہ کا فاصلہ ساڑھے تین سو گز ہوا، پھر تین سو گز، پھر ڈھائی سو گز۔ پاؤجان کی انگلی لبلبی پر دھیرے دھیرے دباؤ بڑھاتی گئی۔ اس نے سانس اندر کھینچی اور فائر کرنے کے لیے مناسب زاویہ ڈھونڈنے لگا۔

مشرقی ڈھلوان سے ایک تیز اور کرخت آواز بلند ہوئی جسے سن کر ہرن ایک لحظے کو ٹھٹک

گئے۔ انھوں نے ہراسانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے لمبی لمبی قلانچیں بھر کر اس قدر تیزی اور پھرتی سے واپس پہاڑ کی سمت بھاگنا شروع کیا کہ پاؤجان کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس نے شست کو ہرنوں کے ساتھ گھمانے کی کوشش کی لیکن ہر قلانچ اس کے ہدف کو پانچ گز دور لے جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام ڈار پہاڑ کے پہلو میں غائب ہو گئی۔

پاؤجان نے با آواز بلند بہن کی گالی دی اور آواز کے ماخذ کی طرف دیکھنے لگا جو اب بلند تر ہو گئی تھی۔ جلد ہی یہ اس کے سر تک پہنچ گئی۔ یہ برطانوی فوج کا جہاز تھا جو وانہ کے ہوائی اڈے سے اڑا تھا اور شاید لوئی خرہ کنڈاؤ سے ہو کر کانڑی گرام پر بمباری کرنے جا رہا تھا۔

جہاز دیکھ کر پاؤجان ہمیشہ انگریز کی عقل پر حیرت زدہ رہ جاتا تھا کہ یہ مشینی چرخہ کیسے نہ صرف ہوا میں اڑتا ہے بلکہ وہاں سے موت بھی برساتا ہے۔ بندوقوں کی جنگ کے زمانے میں آسانی تھی کہ دونوں طرف ایک ہی قسم کا یا کم از کم ملتا جلتا اسلحہ استعمال ہوتا تھا اور چوٹ برابر کی پڑتی تھی۔ پھر انگریز مشین گنیں لے آیا جو ایک میل دور سے بھی گولیوں کی بوچھاڑ کرنے پر قادر تھیں۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو اس نے میدانِ جنگ میں توپیں استعمال کرنا شروع کر دیں جو نہ صرف کئی میل سے بلکہ پہاڑ کے دوسری طرف بھی گولہ پھینک سکتی تھیں۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ علاقے کا جغرافیہ اس قسم کا تھا کہ یہ مشین گنیں اور بھاری توپیں ہر جگہ نہیں پہنچائی جا سکتی تھیں۔ پاؤجان سوچتا تھا کہ جنگی حربے بے شک بدلتے رہیں، انگریز نئی مشینیں لاتا ہے، وہ چیز جسے انگریز بدل نہیں سکتا وہ اس علاقے کا جغرافیہ ہے، جو ہمیشہ سے انگریزوں کی ایجادات کا جواب رہا ہے اور رہے گا۔ لیکن اب پچھلے ایک دو سال میں یہ نئی مصیبت شروع ہو گئی تھی کہ اب انگریزوں نے آسمان سے بھی حملے کرنا شروع کر دیے تھے۔ پاؤجان ہمیشہ سے جنگ میں مشین گن اور توپ استعمال کرنے کو بے غیرتی کی انتہا سمجھتا تھا کہ ڈرپوک دشمن سامنے آنے سے کتراتا ہے، اور چھپ کر دور سے وار کرتا ہے، لیکن اس شیطانی چرخے نے تو بے شرمی کا نیا باب رقم کر دیا تھا کہ اکثر صبح کے اندھیرے میں کالے چور طرح چپکے سے آتے تھے اور گاؤں پر بم پھینکنے کے بعد دم دبا کر

Scanned with CamScanner

بھاگ جاتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ قبائلیوں کو سبق سکھانے کے لیے مویشیوں پر گولیاں برسا کر انھیں بھگا دینے سے بھی انھیں عار نہیں تھا۔ بعض اوقات وہ کسی قبیلے کو سبق سکھانے کے لیے تیار فصلوں پر آگ لگانے والے بم برسا کر انھیں بھسم کر دیتے تھے۔ تاہم یہ سارے کام وہ تہذیب اور انسانیت کے دائرے میں رہ کر کرنے کی کوشش کرتے تھے جن پر قبائلی خوب ٹھٹھا اڑایا کرتے تھے۔ ایک بار جب پاؤجان کمین قصبے میں ٹھہرا ہوا تھا تو ایک جہاز نے کاغذ کے ٹکڑے پھینکے جن پر پشتو اور اردو زبان میں تحریر تھا:

اس گاؤں پر بمباری ہونے والی ہے۔ اپنی عورتوں اور بچوں کو گاؤں سے دور لے جائیں۔ اگر آپ انھیں کسی محفوظ مقام پر نہیں لے جا سکتے تو سرکاری تحویل میں دے دیں۔ ان کا خیال رکھا جائے گا اور جب

آپ حکومت کی اطاعت کی ہامی بھر لیں گے تو انھیں آپ کے حوالے

کر دیا جائے گا۔

قبائلی اس لطیفے پر خوب ہنسے کہ ہم پہلے تو اپنی عورتیں اور بچے جانی دشمن کے حوالے کر دیں اور پھر اطمینان سے انھی کے خلاف جنگ لڑیں۔ تاہم دس بارہ دن سردی کے موسم میں غاروں میں رہنے کے بعد عورتوں، بیماروں اور بوڑھوں کی تکلیف دیکھتے ہوئے قبیلے نے فیصلہ کیا کہ فی الحال مصلحتاً صلح کر لی جائے، چنانچہ انھوں نے انگریزوں کے پاس ایک وفد بھیج دیا۔ اس کے دو تین دن کے بعد ایک اور جہاز آیا اور اب کے اس نے جو پرچیاں گرائیں ان پر لکھا تھا:

ہر آنکہ حکومت نے اطمینان کر لیا ہے کہ قبیلہ امن کا خواستگار ہے، اور اس نے حکومت کی عداوت اور مخالفت سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اب آپ اپنے گھروں کو سلامتی کے ساتھ لوٹ سکتے ہیں۔ ازراہِ کرم یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ کسی ان پھٹے بم کو کسی صورت میں ہاتھ نہ لگایا جائے ورنہ حکومت نتائج کی ہرگز ذمہ دار نہ ہوگی۔

پاؤجان کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ یہ جہاز کس قدر تباہی مچا سکتے ہیں۔ یہ صرف مشین

گن سے گولیاں نہیں برساتے تھے بلکہ ان میں تباہ کن بم برسانے کی صلاحیت بھی تھی۔ انھوں نے کانزی گرام کے ملک کا تین منزلہ عالی شان برج ایسا ملیا میٹ کیا تھا کہ جہاں برج کھڑا تھا اب وہاں زمین پر کئی گز گہرا گڑھا بن گیا تھا۔

اور آج تو اس خانہ خراب نے پاؤجان ذاتی نقصان بھی پہنچایا تھا کہ اس کے چنکاروں کو بھگا کر کئی گھنٹوں کی مشقت خاک میں ملا دی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ چاہے جہاز اسے گولیوں سے بھون دے یا بم پھینک کر راکھ کر دے، وہ اسے مزا چکھائے بغیر نہیں رہے گا۔

Scanned with CamScanner

31

'کیا کرتے ہو تم؟' منشی نظر آنے والے شخص نے چودھری غفار سے اردو میں پوچھا۔

'جی، میرا لاہور میں پراپرٹی کا کاروبار ہے' چودھری غفار نے منمناتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

'تمھارے گھر میں کون اے؟'

چودھری نے حیرانی سے منشی نما شخص کی طرف دیکھا۔ 'تمارے گھر میں کون اے جس سے تمارے لیے بات کرے؟' منشی نے اپنا سوال دہرایا۔

'میرے دو بیٹے ہیں مائی باپ۔'

'کیا کرتا اے وہ؟'

'پڑھتے ہیں سرکار۔'

گھر کتنا اے تمھارا؟

'گھر؟۔۔۔ ایک ہی گھر ہے مائی باپ۔'

'دیکھو، ہم سے مکر کرنے کا کوشش مت کرو۔ یہ امارے سامنے کاغذ میں سب لکھا ہے' اس نے اپنے سامنے کھلے رجسٹر پر الٹا ہاتھ مار کر کہا۔ 'پلاٹ کتنا ہے؟'

'پ پ پلاٹ؟'

'سنائی نئیں دیتا تم کو؟' منشی نے ڈپٹ کر کہا۔ 'دو کروڑ کا انتظام کرے گا تمارا گھر والا؟'

چودھری غفار لڑکھڑا گیا اور گرتے گرتے بچا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ شفیق پوری کوشش کر رہا تھا کہ اپنے آپ کو بالکل غیر متعلق ظاہر کرے۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر جمی تھیں لیکن کن انکھیوں سے سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

منشی نے تیز آواز میں کہا، 'ملک، ٹیم خراب مت کرو، بولو، دو کروڑ کا انتظام کتنی دیر میں کرے گا وہ؟'

ملک نے رندھی ہوئی آواز میں کچھ کہا جو شفیق کی سمجھ میں نہیں آیا۔ منشی نے اسے گھور کر دیکھا تو اس نے تھوک نگل کر دوبارہ کوشش کی: 'مائی باپ، رحم کرو، میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ کو خدا رسول کا واسطہ، میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں۔ میں، میں۔۔۔'

اس سے آگے ملک کچھ نہ کہہ سکا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ روتے روتے اس کا پورا بدن ہل رہا تھا اور ساتھ ہی اس کی گردن میں پڑا پٹہ بھی دائیں بائیں جھولنے لگا۔ کرسیوں پر بیٹھے پگڑیاں پہنے قبائلیوں نے کراہت سے منہ بنایا۔

قبائلیوں کے درمیان بحث شروع ہو گئی۔ خاصی دیر تک تیز تیز بولنے کے بعد بالآخر ان میں سے ایک قبائلی اٹھا جس نے داڑھی سرخ رنگ سے رنگی ہوئی تھی۔ اس نے قمیص اٹھا کر نیچے پہنی ہوئی واسکٹ کی جیب میں سے پیلے رنگ کے نوٹوں کی دو گڈیاں اٹھا کر میز پر رکھ دیں۔ تھوڑی سی اور بحث ہوئی، پھر اس نے نہ نہ کرتے ہوئے پانچ پانچ ہزار کے چند اور نوٹ گڈیوں پر پٹخے، اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ سامنے آیا اور چودھری کے گلے میں پڑا پٹہ تھام کر اسے اپنے ساتھ کھینچ کر کمرے سے باہر لے گیا۔

پانچ ہزار کا نوٹ ابھی نیا نیا ہی آیا تھا۔ شفیق نے ٹرکوں کے لین دین کے دوران ایسے نوٹ چند موقعوں پر ضرور دیکھے تھے لیکن پانچ ہزار کے نوٹوں کی پوری گڈی کبھی اس کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ پانچ ہزار کی گڈی میں کتنے روپے ہوتے ہیں؟ اس نے جلدی جلدی حساب لگایا۔ دس نوٹ: پچاس ہزار، سو نوٹ: پانچ لاکھ۔ دو گڈیاں دس لاکھ کی ہوئیں۔ اس کے علاوہ اس نے بیس پچیس ہزار روپے مزید رکھے ہیں۔ تو کیا اس شخص نے چودھری کو سوا دس لاکھ میں خرید لیا ہے؟ لیکن کیوں؟ کس لیے؟ شفیق نے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کی لیکن اسے کسی فلم کا ایسا کوئی

Scanned with CamScanner

سین یاد نہیں آیا جس میں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آیا ہو۔ اس کی بجائے اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا وجود اس تمام صورتِ حال کا حصہ نہیں ہے بلکہ وہ کہیں دور سے یہ سارا منظر دیکھ رہا ہے۔

اب شفیق کا نمبر تھا۔ اسے سردی لگنے لگی، اور ایسے محسوس ہوا جیسے اس کا سارا بدن کپکپانا شروع کر دے گا۔

منشی نے نام پوچھا، اور اپنی کاپی کے صفحے الٹنے پلٹنے لگا۔ پھر اس نے آواز دے کر باہر سے ایک شخص کو بلایا اور کچھ دیر تک اس سے بات کرتا رہا۔ وہ شخص کچھ کہہ کر کندھے اچک کر ایک طرف ہو گیا۔ منشی نے شفیق سے دوبارہ نام پوچھا، اور پھر کہا، 'تم کیا کرتے ہو؟'

'جی میں رنگساز ہوں، ٹرکوں پر رنگ روغن کرتا ہوں۔'

منشی نے پیچھے مڑ کر اپنے قطار میں بیٹھے قبائلیوں کی جانب دیکھا۔ پھر بولا، 'تمارا ٹرک اے؟'

'نہیں جناب، میں غریب مزدور ہوں۔ پنڈی میں بابو کی ورکشاپ پر چار سو روپیہ دیہاڑی پر کام کرتا ہوں۔ میرے چار چھوٹے بچے ہیں جناب،' شفیق نے دو بچے اپنی طرف سے بڑھا دیے۔

کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ایک چھجے دار داڑھی والے شخص نے بہن کی گالی دی۔ منشی باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔ اس کے پیچھے وہی ناٹا تھا جو صبح شفیق اور اس کے ساتھیوں کو لے یہاں لے کر آیا تھا۔ چھجے دار داڑھی والے نے شفیق کی طرف اشارہ کر کے ایک اور گالی دی اور تیز تیز آواز میں اس آدمی سے بحث میں جٹ گیا، جس میں قریب بیٹھے ہوئے دو تین اور لوگ بھی شریک ہو گئے۔

کئی منٹ اسی طرح گزرے پھر ناٹا برہمی سے شفیق کے پاس آیا اور چٹاخ سے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا جس سے وہ لڑکھڑا گیا اور گرتے گرتے بچا۔ لڑکپن میں بابو پینٹر کے ہاں تربیت کے زمانے میں بابو نے اسے ایک دو بار مارا تھا، لیکن اس کے بعد سے کبھی اس حد تک

نوبت نہیں پہنچی تھی۔ اس آدمی نے زور سے شفیق کے گلے کا پٹہ کھینچا اور اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا اور لات مار کر اسے احاطے میں چھوڑ دیا۔ شفیق نے بڑی مشکل سے خود کو گرنے سے بچایا۔

شفیق نہ جانے کتنی دیر صحن میں گھاس پر بیٹھا رہا۔ قیدیوں کی ٹولیاں سست روی سے کمرے کے اندر جاتی رہیں اور ایک ایک کر کے قیدی آتے رہے اور گاڑیوں میں بٹھا کر لے جائے جاتے رہے، یہاں تک کہ احاطہ ویران ہو گیا۔ اندر کمرا بھی خالی ہو گیا۔ عمارت میں شفیق کے علاوہ صرف منشی رہ گیا۔

پھر احاطے کے باہر ایک گاڑی آ کر رکی۔ کمرے کے اندر سے تین چار آدمی نکل کر باہر لپکے۔ منشی بھی اپنا رجسٹر لیے دوڑا دوڑا آیا۔ چند لمحوں بعد ایک شخص شفیق کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ 'شفیق؟' اس نے پکارا۔

شفیق نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ ایک لمبا تڑنگا، چوڑے چکلے شانوں اور مضبوط ہڈیوں والا شخص اس کے اوپر مینار کی طرح سایہ کیے ہوئے کھڑا تھا۔ وہ سبز فوجی جیکٹ میں ملبوس تھا اور اس نے سر پر سیاہ پگڑی باندھ رکھی تھی جس کے اندر سے سیاہ بال نکل کر کندھوں تک آ رہے تھے۔ اس کی داڑھی بھی سیاہ اور بے حد گھنی تھی، اور اس کی عمر کا اندازہ لگانا بے حد مشکل تھا۔ شفیق نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر شفیق کا ہاتھ تھاما اور سہارا دے کر اسے اپنے قدموں پر کھڑا کر دیا۔

شفیق کے گلے میں زنجیر والا پٹہ دیکھ کر اس شخص نے غصے سے منشی سے کچھ کہا۔ منشی لپک کر آیا اور پٹہ اتار کر پرے پھینک دیا۔ نووارد نے دوبارہ تیز لہجے میں ایک دو باتیں کیں، منشی ہاتھ باندھے مودب کھڑا رہا اور منہ سے ایک لفظ نہیں بولا۔ نووارد نے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور منشی کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ منشی نے نہ نہ کرتے ہوئے انھیں واپس کرنا چاہا لیکن نووارد، جسے منشی خطیب صیب کہہ رہا تھا، اس کا ہاتھ جھٹک کر شفیق کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے

Scanned with CamScanner

چل دیا۔ باہر سفید رنگ کی ڈبل ڈور پک اپ کھڑی تھی۔ خطیب صیب ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا جب کہ شفیق اور دو بندوق بردار پچھلی سیٹ پر سوار ہو گئے۔

سکول میں خود پر گزرنے والے ڈراؤنے خواب کے بعد خطیب صیب کا رویہ شفیق کے لیے نہایت نرم تھا۔ انھوں نے گاڑی میں بھی اس کا حال پوچھا، لیکن اس کے بعد سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر سو گئے۔ شفیق خاصی دیر تک شیشوں سے باہر بے آب و گیاہ پہاڑیوں کے مناظر دیکھتا رہا، پھر کسی وقت اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد پک اپ ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں میں جب آ کر رکی تو سورج دور مغرب میں گھاس پھونس سے عاری پتھریلی پہاڑیوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا۔ فضا پر ایک سوگوار سی خنکی چھائی ہوئی تھی۔ گاؤں میں مٹی کی دیواروں والے پچیس تیس گھر تھے۔ اکثر گھروں پر ایک اونچا مینار بنا ہوا تھا۔ ایک طرف چنار کا بہت بڑا درخت شامیانے کی طرح دور تک شاخیں پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کے نیچے ایک ہینڈ پمپ نصب تھا جس کے آس پاس کی زمین کیچڑ سے لت پت تھی۔ درخت کے عین نیچے ایک کھوکھا نما دکان تھی جس کے آگے پانچ چھ لڑکے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی عمریں دس اور پندرہ کے درمیان ہوں گی اور ان سب کے سروں پر سفید ٹوپیاں تھیں۔ گاڑی کو دیکھ کر لڑکے تیز تیز چلتے ہوئے مکانوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔

شفیق اور اس کے ساتھی تنگ گلی میں سے چل کر گاؤں کے عقب میں ایک بڑی اور پکی عمارت میں داخل ہو گئے۔ یہاں کوئی سائن بورڈ نصب نہیں تھا لیکن شفیق کو فوراً احساس ہو گیا کہ یہ عمارت مدرسے اور مسجد کی دہری خدمت انجام دے رہی ہے۔

32

جب یہ دشمن طیارہ گھاٹی میں سے برآمد ہو کر تیز، کانوں کو پھاڑنے والی پھٹ پھٹ کے ساتھ پاؤ جان کے اوپر سے گزرا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور رائفل جو مادہ چنکارہ پر تان رکھی تھی، جہاز کی طرف کر لی۔ موئی نیکہ کے بازار میں سبز خان اسلحہ فروش تھری ناٹ تھری کی ایک گولی آٹھ آنے کی بیچتا تھا، البتہ پاؤ جان نے دانہ قلعہ سے انگریز کے انخلا کے وقت ستاون گولیاں حاصل کی تھیں، جنھیں بڑی احتیاط سے استعمال کرنے کے باوجود اب اس کے پاس صرف دس گولیاں بچی تھیں۔ لیکن اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنی گردنی اس شیطان کے چرخے پر خالی کر دے۔ یہ جہاز دو چوڑے لوہے کے تختوں جیسے اوپر نیچے نصب پروں پر مشتمل تھا، جو کئی پتلے پتلے شہتیروں کے علاوہ درجنوں آڑی ترچھی تاروں کی مدد سے جہاز کے لمبوترے مرکزی حصے سے جڑا ہوا تھا جس میں دو انگریز آگے اور پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ پاؤ جان کو معلوم تھا کہ اگلا انگریز جہاز چلاتا تھا جب کہ اس کے پیچھے والے کا کام مشین گن گھما گھما کر گولیاں برسانا ہوتا تھا۔

پہلے تو پاؤ جان کو لگا کہ اس کی گولیاں ضائع گئی ہیں کیوں کہ جہاز اس کے سر کے اوپر سے زوں کر کے بندوق کی زد سے باہر چلا گیا۔ لیکن پھر اس نے دیکھا کہ اس کی پرواز ناہموار ہو گئی ہے، اور وہ دائیں طرف کو ڈولنے لگا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی آواز بھی تیز اور مہین پھٹ پھٹ سے بھاری گھر گھر میں بدل گئی۔ وہ تیزی سے الگڈ کے اندر اندر جہاز کے پیچھے بھاگنے لگا، ویسے ہی جیسے وہ اڑتے ہوئے تیتر کو نشانہ بنانے کے بعد اس کے پیچھے یوں بھاگتا تھا کہ ایک نظر آسمان سے گرتے ہوئے شکار پر ہوتی تھی اور دوسری زمین پر تا کہ گڑھوں اور جھاڑیوں سے بچا جا سکے۔ بھاگتے بھاگتے وہ اپنی کمر سے لٹکتا خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیتا تھا تا کہ پرندہ مردار ہونے سے

Scanned with CamScanner

پہلے پہلے حلال کرلیا جائے۔

دوڑتے دوڑتے الکڈ کے کنارے اونچے ہونے لگے اور جہاز اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ تیزی سے الکڈ کے دائیں کنارے پر چڑھا اور جہاں آخری بار جہاز نظر آیا تھا اس طرف دوڑنے لگا، لیکن جہاز کا کہیں اتہ پتہ نہ چلا۔ اس کا دل مایوسی سے بھر گیا، کہیں وہ ڈولتے ڈولتے سنبھل تو نہیں گیا؟ کیا پتہ اسے گولی لگی ہی نہ ہو اور پائلٹ ویسے ہی کوئی کرتب دکھا رہا ہو۔ لیکن پھر اسے وادی کے مشرقی کنارے پر ڈھلوان کے قریب سے دھواں اٹھتا نظر آیا۔ وہ فوراً بھاگم بھاگ وہاں پہنچ گیا۔ چند لمحے قبل وہی جہاز جو کانوں کو پھاڑ دینے والا بے ہنگم شور مچا رہا تھا اور جو گولیاں اور بموں کی بارش کر کے گاؤں کے گاؤں کو نیست و نابود کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، اب خاموشی سے پہیے آسمان کی طرف اٹھائے الٹے پڑے حلال کیے ہوئے بیل کی طرح بے یارو مددگار اور لاوارث دکھائی دے رہا تھا۔

پاؤجان بندوق تانے ہوئے جہاز کے ملبے کا جائزہ لینے لگا۔ پرٹوٹ چکے تھے اور تاریں مڑ تڑ کر ادھر ادھر جھول رہی تھیں۔ جہاز کے اوپر کو اٹھے ہوئے پہیے ابھی تک ہولے ہولے گھوم رہے تھے، جیسے انھیں یقین نہ آرہا ہو کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ دونوں انگریز خون میں لت پت بے حس و حرکت تھے۔ ایک ابھی تک جہاز کے ملبے کے اندر ہاروت ماروت کی طرح الٹا لٹکا ہوا تھا جب کہ دوسرا جہاز سے کچھ دور جا گرا تھا۔ پاؤجان نے جہاز کو ٹوٹے ہوئے پر سے پکڑ کر ہلایا جلایا تو اسے حیرت ہوئی کہ یہ اس کے اندازے سے کہیں ہلکا تھا۔ اس نے زور لگا کر جہاز کو سیدھا کرنے کی کوشش کی تو اس کے اندر پھنسے ہوئے انگریز کے کھانسنے اور کراہنے کی آواز آئی۔ پاؤجان نے جہاز کا پر چھوڑ کر دوبارہ بندوق تان لی۔ انگریز کا موٹا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور ایک ٹانگ ٹوٹ کر عجیب زاویے پر مڑی ہوئی تھی۔ پاؤجان نے گالی دے کر نال اس کے ماتھے کی طرف کرلی اور انگلی لبلبی پر رکھ لی۔

'اوورے گا، اوورے گا، اوورے گا!' جہاز میں الٹا لٹکا انگریز چلایا تو اس کے منہ سے

خون کی کلی نکل گئی جس کے چند چھینٹے پاؤجان کے کپڑوں پر آ گرے۔ اس نے نفرت سے زمین پر تھوکا اور نال اس کی آنکھوں کے درمیان ماتھے پر چبھو دی۔ 'اوورے گا' انگریز نے دوبارہ کہا۔ اب پاؤجان کو شک ہوا کہ شاید وہ پشتو کا لفظ بولنے کی کوشش کر رہا ہے جس کا مطلب ہے، کھڑے ہو جاؤ یا رک جاؤ۔ 'کیا کہہ رہے ہو خنزیر کے تخم؟' پاؤجان نے کہا۔ 'شکر کرو کہ میں ان محسودوں کی طرح نہیں ہوں جو تم حرام کے پلوں کے بدن میں ہزار چرکے لگا کر ان میں گھاس اور مٹی بھر دیتے ہیں، میں تو بس ایک وار میں تمھیں جہنم پہنچا دوں گا۔'

انگریز زور زور سے سر ہلانے اور انگلی سے اپنی قمیص کی اوپری جیب کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ 'کیا ہے تمھاری جیب میں؟ کوئی نیا تماشا کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟ مرتے مرتے بھی کرتب دکھانے سے باز نہیں آتے، باندر کی اولاد؟' انگریز زور زور سے سانس لے کر کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا لیکن پاؤجان کو صرف 'انعام انعام' کا لفظ سمجھ میں آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر انگریز کی وردی کی جیب ٹٹولی۔ اس کے سینے پر طرح طرح کے فیتے اور تمغے جڑے ہوئے تھے۔ جیب میں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ پاؤجان نے بندوق کندھے پر ڈال لی اور خون سے لتھڑا ہوا کاغذ کھولا تو اس کی انگلیاں بھی گیلی ہوگئیں۔ اس نے گالی دے کر ہاتھ اپنے دامن پر رگڑ کر خشک کیا۔ کاغذ پر پشتو اور اردو میں لکھا ہوا تھا:

آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ایک سرکاری افسر کی جان بچا کر سرکار انگلیشیہ کی مدد کی۔ آپ کی اس بے مثال خدمت کا صلہ دینا ممکن نہیں ہے لیکن اگر آپ اس سرکاری افسر کو بحفاظت حکومت تک پہنچا دیں تو آپ کی وفاداری کی قدر کرتے ہوئے حکومت آپ کے قبیلے کو تعریفی سند کے علاوہ نو ہزار روپے نقد انعام عطا کرے گی۔

مشرق میں پیر غل کی چوٹی کے پیچھے سے سورج طلوع ہو رہا تھا، اس کی پہلی کرنیں جہاز کے شیشوں سے منعکس ہو کر پاؤجان کی آنکھوں سے ٹکرائیں تو اس نے منہ پھیر لیا۔

نو ہزار روپے؟ اس کا منہ مارے حیرت کے کھل گیا۔ نو ہزار روپے؟ انگریزی تھری

Scanned with CamScanner

ناٹ تھری ڈھائی سو روپے کی آتی ہے، گائے پچاس روپے کی اور پچاس ہی میں بیوی آجاتی ہے۔ نو ہزار میں تو پورا قبیلہ خریدا جاسکتا ہے۔ لیکن اس میں انگریز کی کوئی چال نہ ہو؟ آخر انگریز اپنی مکاری اور عیاری کے بل ہی پر تو سارے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے، ورنہ اور ان کے پاس ہے کیا۔ بہادری اور شجاعت میں تو یہ ہمارے ادنیٰ سے ادنیٰ قبائلی کے پاسنگ بھی نہیں۔ پاؤجان نے سوچا کہ انعام و نعام پر لعنت بھیج کر ماتھے میں دہکتا ہوا سیسہ اتار کر اس بھدے اور کریہہ صورت انگریز سے بمباری کر کے قبائل کے گاؤں کے گاؤں تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہرن بھگانے کا بدلہ بھی لے لے۔

لیکن اگر اس پرچی پر لکھی بات سچی نکلی تو پھر کیا ہوگا؟

وہ شش و پنج کے عالم میں رائفل ہاتھوں میں لیے کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اسی دوران تیز تیز بولنے کی آوازیں آئیں اور چند لمحوں کے اندر اندر وہ محسود وہاں پہنچ گئے۔ 'ہٹ جاؤ یہاں سے منحوس وزیر، یہ جہاز ہم نے گرایا ہے، اس پر ہمارا حق ہے' ان میں سے ایک نے کہا۔

پاؤجان کا تو جیسے دماغ ہی گھوم کر رہ گیا۔ اس نے رائفل انگریز سے ہٹا کر بولنے والے کی طرف تان لی۔ اس کا چہرہ بھاگ کر آنے کی وجہ سے تمتمایا ہوا اور سانس چڑھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں رخسار پر چاقو کا گہرا زخم تھا جو ہونٹوں کے اوپر تک آیا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کم از پانچ فٹ لمبی سرخ پھندنوں سے سجی ہوئی جریل تھی جو اس کے قد سے اگر لمبی نہیں تو کچھ زیادہ چھوٹی بھی نہیں ہوگی۔ دوسرے محسود کے پاس دونالی بندوق تھی۔

'جہاز تم نے گرایا ہے؟ شکل دیکھی ہے تم نے اپنی؟ کبھی زندگی میں چڑیا بھی گرائی ہے تم نے؟ بے ایمان، زیادتی خور کہیں کے، شرم نہیں آتی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولتے ہوئے؟' پاؤجان نے کہا۔

محسود نے اپنی جریل اٹھا کر پاؤجان کی طرف کر لی۔ 'تم مسعود کے ساتھی ہو اس لیے لحاظ کر رہا ہوں۔ زیادہ بک بک کی بجائے سیدھے سیدھے دم دبا کر جہاں سے آئے ہو وہیں

واپس چلے جاؤ، ورنہ مار کر یہیں دفنا دوں گا' محسود نے کہا۔ اس کے ساتھی نے کمر سے چھرا کھول کر تلوار کی طرح ہاتھ میں پکڑ لیا۔

پاؤجان نے سوچا کہ وہ ٹھگنے محسود کو تو آسانی سے ٹھکانے لگا سکتا ہے، لیکن اس دوران خود اس کے بدن میں دونالی کی دو گولیاں اتر جائیں گی۔ لیکن دوسری طرف اگر وہ میدان چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو پھر زندگی بھر اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکے گا۔ وہ کچھ دیر اسی حالت میں رہے کہ پاؤجان کی بندوق ٹھگنے محسود کے سینے کی طرف اور ان کی تین نالیں اس کے جسم پر تنی رہیں۔ پھر پاؤجان نے اپنی بندوق اوپر اٹھا لی۔ 'اچھا بھئی، تم جیتے، ہم ہارے، میں چلتا ہوں' یہ کہہ کر پاؤجان پیچھے ہٹا اور بجلی کی سی پھرتی سے چمک کر تھری ناٹ تھری کی نال ابھی تک جہاز میں الٹے لٹکے ہوئے انگریز کے گال پر رکھ دی۔

'تمھیں یہ انگریز چاہیے نا؟ اسی کے لیے اپنا تم ایمان بیچ رہے ہو؟ لو میں اسی کو اڑا دیتا ہوں، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری'

Scanned with CamScanner

'شفیق خانا بھائی، معافی چاہتا ہوں کہ تم کو تکلیف ہوا۔ کسی کام میں پھنس گیا تھا، ادھر تم کو لینے نہیں جا سکا اور تم دو دن ان جنگلیوں میں پھنسا رہا۔'

خطیب صیب نے اگلی صبح شفیق کو ناشتے کے بعد ایک وسیع کمرے میں بلا لیا تھا جو سطحِ زمین سے کم از کم دو فٹ نیچے ہوگا۔ کمرے کی لمبائی چالیس فٹ سے کم نہیں تھی۔ اس کے فرش پر دریاں بچھی ہوئی تھیں جن پر منقش لکڑی کے رحل قطاروں میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے اندر خانے بنے ہوئے تھے جن میں بھوری اور سیاہ جلدوں والی کتابیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی اور چیز موجود نہیں تھی۔

شفیق نے رات مدرسے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں گزاری تھی، جہاں نصیب گل نامی ایک شخص اس کے ساتھ تھا۔ اسی نے صبح سویرے اسے نماز کے لیے اٹھایا اور بعد میں اس کے لیے پراٹھے اور چائے پر مبنی ناشتہ لے کر آیا تھا۔ خطیب صیب سے ملنے کے لیے نصیب گل کے ساتھ آتے ہوئے شفیق نے دیکھا تھا کہ قطاروں میں بنے کمروں کے اندر مختلف عمروں کے لڑکوں کے درس جاری تھے۔

خطیب صیب بڑی سہولت سے آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھے ہوئے تھے، جب کہ شفیق زمین پر بیٹھنے کا عادی نہیں تھا، اس لیے اسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد پہلو بدلنا پڑتا تھا۔ خطیب صیب نے اب سیاہ واسکٹ پہنی ہوئی تھی اور پیروں میں سیاہ رنگ کی جراب تھی۔ ان کی بولتی ہوئی آنکھیں شفیق کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ شفیق کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کے خیالات پڑھ رہے ہوں۔ ان کے پیچھے والی دیوار پر ایک شیلف مجلد کتابوں سے ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا۔ باہر صحن میں لڑکوں کی باتوں اور چلنے پھرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

خطیب صیب کا لہجہ دھیما لیکن آواز بے حد بھاری تھی۔ وہ ہر لفظ یوں ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے تھے کہ ہر آواز صاف اور شفاف نکلتی تھی۔ وہ ع اور ق کو بھی بڑے واضح انداز میں ادا کرتے تھے۔ شفیق نے چاہا کہ وہ جواب میں کچھ کہے لیکن وہ اپنے ذہن میں چکراتے ہوئے خیالات کو کسی مربوط فقرے میں نہیں ڈھال سکا۔ خطیب صیب کے ہمدردانہ رویے سے اس کے دل میں خود بخود تشکر کے جذبات امنڈ آئے تھے۔

اس نے کوشش کر کے کہنا شروع کیا، 'خطیب صیب۔۔۔ میں غریب رنگساز ہوں، ناوان کا پیسہ نہیں دے سکتا، میں چار سو دیہاڑی کا مزدور۔۔۔'

خطیب صیب نے ہاتھ اٹھا کر اسے وہیں ٹوک دیا، 'نہیں نہیں، تم سے ناوان کون خانہ خراب مانگتا ہے؟ ناوان ماوان کا فکر مت کرو۔ بلکہ اپنا گھر والوں کی فکر بھی نہ کرو، ہم نے ان کا انتظام کر دیا ہے۔ تمھارے بیٹے ارسلان کو خرچہ مرچہ بھی بھیج دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ تم ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس چند دن کی بات ہے، پھر ہم تمہیں واپس گھر چھوڑ آئیں گے۔'

شفیق حیرت سے خطیب صیب کو دیکھتا رہا۔ 'خطیب صیب، جب سے انھوں نے مجھے دھمکی دی تھی، قسم اٹھا لیں کہ میں نے کبھی کوئی انسان کی شکل بنائی ہو۔ میں تو اب صرف سینریاں بناتا ہوں۔ تو پھر مجھے یہاں کیوں۔۔۔'

خطیب صیب اٹھ کھڑے ہوئے۔ 'مجھے دھمکی وھمکی کا نہیں پتہ، لیکن میں تمھیں بتاتا ہوں کہ تمھیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔'

شفیق بھی اٹھ گیا۔ خطیب صیب نے ہاتھ سے شفیق کے پیچھے والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ شفیق نے مڑ کر دیکھا، مٹی کی دیوار پر چونا لپا گیا تھا جس میں ہلکے آسمانی رنگ کی آمیزش تھی۔ فرش سے کوئی فٹ اوپر تک گہرے بھورے رنگ کا اناڑی پن سے رنگا ہوا سنجاف تھا، جس کی لکیر بار بار سیدھے راستے سے بھٹک جاتی تھی۔

'تم سینری اور تصویر بنانے کے ماہر ہو نا؟ دور دور سے لوگ تم سے ٹرکوں پر تصویر

Scanned with CamScanner

بنانے کے لیے آتا ہے؟' خطیب صیب نے پوچھا۔

شفیق نے دل میں سوچا کہ اس سوال کی یہاں کیا تک بنتی ہے؟ لیکن پھر اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا کہ کہیں اس کی بیزاری اس کے چہرے سے نہ جھلک اٹھے۔

'میں چاہتا ہوں کہ تم اس دیوار پر میرے لیے ایسی ہی تصویر بناؤ جیسی تم ٹرک کے پیچھے بناتا ہے۔ جو ہنر تمھیں آتا ہے، سب کا سب اس میں لگا دو۔'

شفیق تعجب میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ خطیب صیب نے اس کی الجھن بھانپ لی، اور ان کے لبوں پر پہلی بار خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

'شفیق خانا، تم اتنا حیران کیوں ہو رہا ہے؟ تم تو ساری زندگی یہی کام کرتے رہے ہو۔ میں نے تمھاری بنی ہوئی کوئی سینیری تو نہیں دیکھی، لیکن ٹرکوں کے پیچھے بہت سینریاں دیکھا ہے۔ بس تم کو یہی کام ادھر کرنا ہے۔'

'لیکن وہ تو خیالی تصویریں ہوتی ہیں، وہ ڈرائیور فرمائش کر کے بنواتے ہیں۔ بعض ڈرائیور تو کئی کئی دن ساتھ رہتے ہیں، ہوٹل میں کمرا لے کر دن بھر کام کرواتے ہیں۔'

'شفیق خان، میں تم سے کوئی انوکھی چیز نہیں بنوا رہا، بس اِدھر بھی وہی بناؤ جو تم اُدھر بناتے ہو۔ ٹرک کے پیچھے ہم نے دیکھا ہے کہ جھیل، درخت مرخت، سبزہ مبزہ، پھول، پہاڑ، یہ سب کچھ بنا ہوتا ہے۔ وہی چیز تم کو ادھر بھی بنانی ہے۔'

'لیکن میرا سامان تو وہیں رہ گیا۔ رنگ، روغن، برش؟'

'سامان کا فکر مت کرو، سب ہو جائے گا۔ تم سارا چیز نصیب گل کو لکھوا دو، قیمت کا پروا نہ کرنا، جو مہنگا اور سب سے اچھا مال ہو وہی منگوانا، کل تک سب آ جائے گا۔' خطیب صیب نے نصیب گل کو اشارہ کیا جو دروازے کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر دونوں کے قریب آ گیا۔ 'بس جتنی جلدی ہو سکے، کام شروع ہونا چاہیے۔ کام ہمارا مرضی کا ہوا تو ہم تمھیں خوش کر دیں گے۔'

خطیب صیب یہ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ شفیق نے دیواروں کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور

نصیب گل کو سامان لکھوانا شروع کیا۔ چونا، بیس کلو بیج چونے کی بڑی کوچی (دیواروں پر چونا کرنا پڑے گا، نیلے رنگ پر سینری کے رنگ اٹھیں گے نہیں)، نیلا رنگ روبیا ایک دو لیٹر کے چار ڈبے (آسمان اور پانی کے لیے زیادہ رنگ کی ضرورت پڑے گی، لیکن معلوم نہیں چونے پر روغن جمے گا یا نہیں، میں نے تو کبھی چونے پر کام نہیں کیا۔۔۔ خیر، دیکھی جائے گی)، سبز رنگ تین ڈبے (زمین خاصی زیادہ ہے، ہر طرف سبزہ دکھانا ہوگا، اور ویسے بھی خطیب صیب نے سبزہ زار پر خاص زور دیا تھا)، سرخ رنگ ایک ڈبہ (سرخ پھول سبزے پر بہت ابھر کے سامنے آئیں گے)، بھورا، اور سیاہ رنگ، ایک ایک ڈبہ (سائے اور درختوں کے تنے بنانے کے لیے)، پیلا ایک ڈبہ (دوسرے رنگوں میں مل کر شیڈ دینے اور لال رنگ میں ملا کر نارنجی بنانے کے لیے)، سفید ایک ڈبہ (دوسرے رنگوں کے ہلکے شیڈ دینے کے لیے)، تارپین، ایک گیلن، برش چار انچی والا ایک، ایک انچی والے تین برش (دیوار بہت لمبی ہے، سب سے زیادہ کام انھی برشوں سے کرنا پڑے گا)، آدھ انچی دو عدد، اور تین عدد چھوٹے قلم۔

تیسرے دن شفیق نے کام شروع کر دیا۔ نصیب گل کل شام ہی کو سارا سامان لے آیا تھا۔ اس نے ایک چودہ پندرہ سالہ طالب کو بطور مددگار شفیق کے حوالے کر دیا۔ اس کا نام فتح خان تھا۔ اس کے چہرے پر روئیدگی نمودار ہو رہی تھی اور آواز بھی پھٹنا شروع ہو گئی تھی لیکن وہ توتلا بولتا تھا اس لیے ابھی بالکل بچہ ہی لگتا تھا۔ اس کی مدد سے شفیق نے پہلے تو دریاں بٹائیں، پھر دونوں نے مل کر بالٹی میں چونا گھولا اور شمالی دیوار پر موٹی تہہ جما دی۔ دو تین گھنٹے بعد جب چونا سوکھ گیا تو شفیق اور فتح خان نے اس کے اوپر ایک کوٹ کر دیا، جس سے کرا اب خوب روشن روشن معلوم ہونے لگا۔ سنجاف اب بھی نیچے سے نظر آ رہا تھا لیکن شفیق نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پینٹنگ کا بڑا حصہ اس کے اوپر ہی بنایا جائے گا اس لیے اسے اس کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ فتح خان بڑا ذہین اور پھرتیلا شاگرد نکلا۔ شفیق جو کام کہتا تھا، وہ نہایت دلجمعی سے سرانجام دیتا تھا۔ شفیق نے سوچا کہ وہ اڈے پر اس کے ساتھ کام کرنے والے نمی چھوٹوں سے مختلف تھا، جنھیں جب تک ماں بہن کی موٹی سی گالی

Scanned with CamScanner

نہ دی جائے تب تک بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

شفیق ٹرکوں پر سینری بنانے کے لیے پہلے سے کچھ زیادہ منصوبہ بندی نہیں کیا کرتا تھا، بس اس کے ذہن میں جو نقشہ ہوتا تھا، اسے لے اندازے سے ڈالے پر کام شروع کر دیتا تھا۔ ہر ڈالے کا سائز ایک جیسا ہوتا تھا، آٹھ فٹ چوڑا، چھ فٹ اونچا۔ سارا کام اسی مستطیل کے اندر ہوتا تھا۔ لیکن اس دیوار کا معاملہ یکسر مختلف تھا۔ اس کا رقبہ اتنا بڑا تھا کہ اس نے پہلے کبھی اس طرح کا کام نہیں تھا، اس لیے یہاں گہرے سوچ بچار اور خاکہ بندی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے مری روڈ سے گزرتے ہوئے ناز سینما، موتی محل سینما اور پلازہ سینما میں پینٹروں کو جہازی سائز کے بورڈوں پر کام کرتے ہوئے دیکھا تھا جو پہلے چھوٹے بورڈوں پر نقش بناتے تھے پھر انھیں جوڑ کر سینما کے آگے سجا دیتے تھے۔ شاید اس کام کے لیے سینما کے پینٹرز زیادہ مناسب رہتے۔۔۔ لیکن وہ تو لاچا کرتی پہنے بھرپور جوبن والی صحت مند ہیروئنیں بناتے ہیں۔۔۔ اور ہاتھ میں خون سے لتھڑے ہوئے گنڈاسا تھامے انگارہ آنکھوں والے ہیرو۔۔۔ انھیں سینیریاں بنانے کا کیا پتہ؟ خطیب صیب نے خاص طور پر سینیریوں کا حکم دیا ہے، اس لیے یہ کام مجھی کو کرنا پڑے گا۔

اس نے فتح خان سے ایک رجسٹر منگوایا اور پنسل سے اس کے اندر خاکے بنانے لگا۔ مغرب کی جانب ڈھلوان ہوگی، جس پر بیاڑ کا گھنا جنگل دکھایا جائے گا۔ کہیں کہیں چنار کے درخت بھی ہوں گے تاکہ ان کے پتوں کے نارنجی اور پیلے رنگ سے ہرے رنگ کی یکسانی کو توڑا جا سکے۔ اس کے بعد پچیس فٹ چوڑا اونچا نیچا سبزہ زار، جس میں جگہ جگہ پھولوں کے تختے پینٹ کیے جائیں گے۔ سبزہ زار کے پیچھے جھیل ہوگی جس میں سفید راج ہنس تیر رہے ہوں گے، جھیل کے اوپر نیلی فضا میں کونجوں کی دو تین ڈاریں۔۔۔ لیکن یہ تو مولوی لوگ ہیں، پتہ نہیں پسند کریں نہ کریں۔ کہتے ہیں کہ زندہ چیز کی تصویر بنانے والے کو قیامت میں کہا جائے گا کہ اس کے اندر جان ڈال کر دکھاؤ۔۔۔ نہ نہ، فی الحال ہنسوں کے بغیر ہی کام چلانا پڑے گا۔۔۔ لیکن ہنسوں اور کونجوں کے بغیر جھیل اور آسمان خالی خالی لگیں گے، اور یہ تو ہے بھی گزوں پر پھیلی ہوئی سینری۔۔۔ خیر

دیکھتے ہیں۔۔۔ اور کچھ نہیں تو جھیل میں ایک دو کشتیاں بنا دوں گا۔۔۔۔۔۔ زیادہ مسئلہ مشرقی سمت کا ہے، وہاں کیا ہوگا؟۔۔۔ ڈالے پر تو لکڑی سے بنا ہوا ایک گھر ہوتا ہے، جس کے آگے سے ایک سڑک لہراتی ہوئی جھیل کے ساتھ ساتھ گزرتی ہے، جس کے اوپر ایک عدد کار یا ٹرک گزر رہا ہوتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ جنت میں کاریں ٹرک تو ہوں گے نہیں۔۔۔ یا کیا پتہ ہوں؟ اور گھر؟ وہاں گھر کس قسم کے ہوتے ہوں گے؟ سنا ہے کہ وہاں گھر نہیں بلکہ ہیرے موتیوں سے بنے بڑے بڑے محلات ہوں گے۔۔۔ ایک بار محلے کے مولوی صاحب نے جمعے کے خطبے میں بتایا تھا کہ اگر اونٹ جنت کے محل کے ایک سرے سے چلنا شروع کرے تو دوسرے سرے تک پہنچنے کے لیے اسے ستر ہزار سال لگ جاتے ہیں۔۔۔ لیکن اس سے ملتی جلتی بات تو ایک بار کسی نے، مولوی نے یا کسی تبلیغی جماعت والے کسی شخص نے۔۔۔ کہ جنت میں حوروں کے پستان اتنے بڑے بڑے ہوں گے کہ اگر پرندہ ایک چوچی سے دوسری کی طرف اڑنا شروع کرے تو ستر سال۔۔۔ یا پتہ نہیں سات سو سال۔۔۔ گزر جائیں گے۔۔۔ پتہ نہیں پرندے کے سات سو سال اونٹ کے کتنے ہزار سال کے برابر ہی ہوں گے، لیکن ستر ہزار سے تم کم ہی ہونے چاہییں، ورنہ وہ حوریں محل میں سمائیں گی کس طرح۔۔۔ توبہ، توبہ، یہ میں کیا سوچ رہا ہوں، مجھے اپنے کام پر توجہ رکھنی چاہیے۔۔۔ یہاں کسی کو پتہ چل گیا تو بیٹا گئے کام سے۔

Scanned with CamScanner

34

سورج کی کرنیں ابھی مغربی دیوار کے اوپر حصے پر لرز رہی تھیں کہ دروازے پر زرجانان کی مخصوص دستک سنائی دی۔ 'فتح اٹھ گیا ہے؟' اس نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔

'ابھی ابھی سلایا ہے، اتنی مشکلوں سے سویا ہے کہ کیا بتاؤں۔ تم اتنی جلدی کیسے آ گئے؟' گل مینہ نے پوچھا۔

'بس آج کا کام ختم۔' زرجانان فتح کی چارپائی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بازو پیچھے کی طرف موڑے اوندھا سویا ہوا تھا۔ زرجانان نے جیب سے کپڑے کی ایک دھجی نکالی جو عام رومال کا ایک تہائی ہو گی۔ 'جانتی ہو یہ کیا ہے گل مینہ؟' زرجانان نے دھجی اپنی آنکھوں سے لگالی۔

'دکھاؤ مجھے،' گل مینہ نے ہاتھ بڑھایا۔

'ٹھہرو ٹھہرو،' زرجانان نے دھجی اس کی پہنچ سے دور کر دی۔ 'تم پاک ہونا؟ میرا مطلب ہے۔۔۔'

'ہاں ہاں، کیا ہو گیا ہے بھئی۔ سہ پہر کو نہا کر نماز پڑھی ہے۔ آخر یہ ہے کیا چیز؟' گل مینہ نے دھجی اپنے ہاتھ میں لے کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کالے رنگ کی زمین پر باریک سلیٹی دھاریاں تھیں اور کپڑا خاصا میلا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ رومال کی طرح چوکور نہیں تھی بلکہ تکونی شکل کی تھی اور اس کے کناروں سے دھاگے لٹک رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے بڑے بے ڈھنگے طریقے سے پھاڑا گیا ہو۔ 'کہاں سے لائے ہو یہ؟'

'تم سوچ بھی نہیں سکتیں گل مینہ کہ یہ کیا چیز ہے۔ یہ ایک طالب کی پگڑی کا ٹکڑا ہے، لیکن کوئی عام پگڑی نہیں، بلکہ وہ پگڑی جو نبی پاک کے خرقے، ان کے کرتے سے مس ہو کر، اسے

چھو کر آئی ہے۔'

زرجانان نے پگڑی کا ٹکڑا گل مینہ سے لے کر احتیاط سے سوئے ہوئے فتح کے منہ اور گردن پر ملا۔

'میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا چیز ہے۔ صاف صاف بتاتے کیوں نہیں؟'

'اچھا اچھا بتاتا ہوں۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔ تم چائے کا پانی تو رکھ دو، بڑی تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے۔' زرجانان نے کپڑا ایک بار پھر آنکھوں سے لگایا اور پھر تہہ کر کے بغل والی جیب میں رکھ لیا۔ گل مینہ نے گھڑے سے تین پیالی پانی ناپ کر دیگچی میں ڈالا اور اسے چولھے پر رکھ کر آگ جلانے کے لیے لکڑیوں میں پھونکیں مارنے لگی۔ زرجانان اس کے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر اور ٹانگیں لمبی کر کے بیٹھ گیا۔

'آج صبح جب میں ملا داؤد کی طرف گیا،' اس نے بات شروع کی۔ 'تو پتہ چلا کہ امیر المجاہدین ملا عمر نے انھیں فوری طور پر قندھار آنے کا حکم دیا ہے۔ ہم جب قندھار پہنچے تو پتہ چلا کہ ملا عمر جامع مسجد میں تقریر کریں گے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ سینکڑوں لوگ مسجد میں جمع ہیں اور ہر طرف سے مزید لوگ آتے چلے جا رہے ہیں۔ میں مسجد کے صحن میں کھڑا ہو گیا۔ چند منٹوں کے اندر اندر صحن اس طرح بھر گیا کہ کہنی سہلانے کی جگہ تک نہ رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد مسجد کی چھت پر ایک شخص نمودار ہوا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن آس پاس کے لوگوں نے کہا کہ یہ ملا عمر ہیں، طالبان کے سربراہ، امیر المومنین۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی ایک آنکھ روسیوں سے لڑتے ہوئے ضائع ہو گئی تھی، لیکن مجھے تو دور سے اس کا پتہ نہیں چلا۔ ملا عمر نے ہاتھوں میں ایک پرانا کرتا اٹھایا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ چھت پر تین چار لوگ موجود تھے۔ انھوں نے نیچے کھڑے لوگوں کو خاموش کروایا۔

ملا عمر بولنا شروع ہوئے: 'میرے مسلمان ساتھیو، میرے ہاتھوں میں جو کرتا آپ دیکھ رہے ہیں یہ کوئی عام کپڑا نہیں ہے۔ یہ وہ خرقہ ہے کہ دو جہان کی حکمرانی ترازو کے ایک پلڑے میں

Scanned with CamScanner

رکھ دی جائے اور یہ خرقہ دوسری طرف، تو یقیناً خرقے والا پلڑا زمین سے جا لگے گا اور دو جہان کی حکمرانی آسمان سے ٹکرا جائے گی۔'

ملا عمر کی آواز کسی قدر ہلکی لیکن بلند اور اعتماد سے بھرپور تھی۔ میں نے سنا تھا کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں لیکن اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مجمعوں پر چھا جانے کا ہنر جانتے ہیں۔

وہ کہہ رہے تھے: 'یہ وہ خوش نصیب اور بابرکت کپڑا ہے جسے ہمارے نبی پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس بدن سے مس ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہی نبی جن کی خاطر یہ کائنات تخلیق کی گئی تھی اور جو تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ یہ خرقہ آج سے ڈھائی سو سال پہلے بابا احمد شاہ ابدالی رحمۃ اللہ علیہ بخارا سے لے کر آئے تھے۔ پچھلے ڈھائی سو سالوں میں یہ صرف ایک بار صندوق سے نکلا ہے۔ جب آج سے پون صدی قبل افغانستان میں خسرے کی ایسی وبا پھیلی تھی کہ قندہار کی گلیاں لاشوں سے اٹ گئی تھیں، انھیں کتے نوچتے پھرتے تھے اور کوئی دفنانے والا نہیں ملتا تھا۔ قریب تھا کہ شہر کا شہر اجڑ جاتا، اس وقت کے بادشاہ شاہ امان اللہ خان نے یہ خرقہ صندوق سے نکال کر ہوا میں لہرایا اور اس کی برکت سے اس وبا کے زہریلے اثرات دیکھتے ہی دیکھتے یوں ختم ہو گئے جیسے وبا نے کبھی اس علاقے کا رخ ہی نہیں کیا تھا۔'

'ملا عمر نے خرقہ دونوں ہاتھوں میں بلند کیا اور اسے آہستہ آہستہ دائیں سے بائیں لہرانے لگے تاکہ سب لوگ اسے اچھی طرح دیکھ سکیں۔ اس وقت مسجد سے باہر گلیاں اور بازار بھی مکمل طور پر بھر چکے تھے اور لوگ چپ چاپ گردنیں اوپر کیے دیکھے جا رہے تھے۔

'ملا عمر کہہ رہے تھے: 'میرے مومن بھائیو، آج افغانستان پھر وبا کی زد میں ہے۔ خسرے کی وبا نے تو صرف جسموں کو متاثر کیا تھا، اس وقت کفر، ظلم اور شرک و بدعت کے جراثیم اس ملک کے کوچے کوچے میں سما گئے ہیں، جو جسموں کے ساتھ ساتھ روحوں تک کو اندر سے کھا

رہے ہیں۔ ہمارے بدن کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جو صرف ایک خول لیے پھر رہے ہیں، جو اندر سے بالکل خالی ہے۔'

خرقے پر نظریں گاڑے ہوئے اور ملا عمر کی باتیں سنتے سنتے میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں دھندلانے لگی ہیں۔ ادھر ادھر دیکھا تو دوسرے کئی لوگوں کے چہروں پر بھی آنسو رواں تھے۔ پھر کچھ لوگوں نے تو باقاعدہ اونچی آواز سے رونا شروع کر دیا۔

'آج اگر اس پاک خرقے کی مالک ہستی یہاں اس ملک میں تشریف لے آئے تو اسے کیا دیکھنے کو ملے گا؟ وہ ہماری اس پارہ پارہ ملت کو دیکھ کر کیا سوچیں گے؟'

لوگوں نے اب دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔

'میں آج امان اللہ خان کی وہ روایت دوبارہ زندہ کر رہا ہوں جس نے خسرے کی وبا کو مار بھگایا تھا۔ آج اللہ رب العزت نے مجھے سعادت بخشی ہے کہ میں آپ کو نہ صرف اس مقدس خرقے زیارت کروا سکوں بلکہ اس کے صدقے اس ملک کو ہر قسم کی روحانی بیماریوں سے پاک کروانے کی دعا بھی کر سکوں۔'

ہر طرف سے ہچکیوں کی آوازیں تھیں۔ پھر صحن کی اگلی طرف نیچے کھڑے ہوئے کسی شخص نے اپنی ٹوپی اٹھا کر اوپر پھینکی۔ پھر کسی نے واسکٹ اتار کر زور سے اچھال دی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ان کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگوں نے اپنی پگڑیاں فٹ بالوں کی طرح ہوا میں اچھالنا شروع کر دیں۔ ان میں سے کچھ پگڑیاں واپس آ جاتیں یا پھر مسجد کی چھت پر گر جاتی تھیں۔ ایک پگڑی ملا عمر کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے خرقے کو چھو کر نیچے آئی، تو وہاں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اب میں سمجھا کہ لوگ دراصل اپنی پگڑیوں کو خرقے سے مس کروانے کے لیے اوپر پھینک رہے تھے۔ بڑا عجیب و غریب منظر تھا۔ جب کوئی پگڑی اوپر جاتی تو ایسا لگتا جیسے کوئی سر گردن کی قید سے آزاد ہو کر اچھل کر خرقے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر جب کوئی پگڑی خرقے کو مس کر کے نیچے آتی تو اسے پکڑنے کے لیے لوگ

Scanned with CamScanner

ٹوٹ پڑتے تھے۔

اتنے میں میرے قریب کھڑا ایک شخص لڑکھڑایا اور مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں نے ناگواری سے مڑ کر اسے دیکھا تو وہ دھڑام سے نیچے گر گیا۔ شاید وہ ہیبت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ لیکن یہاں اتنی فرصت کسے تھی کہ اس کی طرف دھیان دیا جاتا۔ اتنے میں کسی نے نعرہ لگایا، 'امیر المومنین۔' ہجوم نے اونچی آواز میں جواب دیا، 'ملا عمر۔' بس پھر کیا تھا، وہ نعرے بلند ہوئے کہ لگتا تھا ان کی گونج سے جامع مسجد قندھار کے مینار لرزنے لگے ہیں۔

میرے آگے کھڑے کئی لوگ آگے کی طرف لپکے۔ میں بھی آگے بڑھا۔ اس وقت مجھے بھی خیال آیا کہ میں بھی اپنی ٹوپی اچھال دوں لیکن میں صحن میں خاصا پیچھے کھڑا تھا اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ میری ٹوپی وہاں تک پہنچ سکے گی۔ البتہ آگے کھسکتے کھسکتے میرے ہاتھ بھی ایک پگڑی پر پڑ گیا جو خرقے کو مس کر کے نیچے آئی تھی اور اب لوگوں کے ہاتھوں میں کھل گئی تھی جو اسے پھاڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے جیب میں سے چاقو نکال کر اس کا ایک ٹکڑا کاٹ لیا۔

تم کتنے عرصے سے کہہ رہی تھیں نا کہ فتح خان کو کسی بابا، کسی پیر فقیر کے مزار پر لے چلیں، اس کا موقع تو نہیں مل سکا، لیکن میں اس کے لیے دنیا کا عظیم ترین تحفہ یہاں گھر کے اندر لے آیا ہوں۔

35

جرگہ موسیٰ نیکہ زیارت کے قریب ایک کھلے میدان میں منعقد ہوا۔ موسیٰ نیکہ وزیروں اور محسودوں کے مشترکہ جدِ امجد تھے اور ان کی قبر دونوں قبیلوں کی مقدس زیارت تھی، اس لیے یہ عین مناسب تھا کہ مشترکہ جرگہ ان کی زیارت کے قریب منعقد کیا جاتا۔ سفید ریش اور جوان دو چوڑی قوسوں کی شکل میں زمین پر بیٹھ گئے۔ ایک طرف پاؤجان کے قبیلے کے طوری خیل وزیر، دوسری طرف محسود۔ دونوں طرف سے بیس بیس لوگ شریک تھے۔ جن کو زمین پر خشک گھاس ملی وہ وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ بعضوں کے حصے میں مٹی آئی۔ جنھیں کپڑے خراب ہونے کا ڈر تھا، وہ اکڑوں ہی بیٹھے رہے، دوسرے مٹی ہی میں پھسکڑا مار کر براجمان ہو گئے۔ محسود اور وزیر ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان میں سے کئیوں کی آپس میں رشتے داریاں اور دوستیاں تھیں۔ بیچ بیچ میں لطیفوں، خبروں اور تازہ افواہوں کا تبادلہ بھی جاری تھا۔ جب بھی کوئی چٹ پٹا چٹکلہ چھوڑتا تو پورا جرگہ لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

طوری خیلوں کی جانب سے ملک جم خان وزیر نے مقدمہ پیش کیا:

'جیسا کہ آپ سب معزز ساتھی جانتے ہیں، ہم سب اپنی صدیوں پرانی روایات کے مطابق ایک تنازعے پر غور کرنے اور اس کا حل ڈھونڈنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ پاؤجان، جو آپ کے سامنے موجود ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اس مہینے کی بارہ تاریخ کو تورا ایزر رغزہ میں انگریز کا ایک جہاز تنِ تنہا بغیر کسی کی مدد کے اپنی رائفل سے فائر کر کے مار گرایا ہے۔ جہاز میں دو انگریز موجود تھے جن میں سے ایک جہاز گرنے سے مر گیا، دوسرا زندہ بچ گیا اور ہماری تحویل میں اب بھی موجود ہے۔

'دوسری جانب مدار خان محسود ہے جو میرے بائیں طرف موجود ہے،' ملک نے اپنے

عصا سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ 'اس کا کہنا ہے کہ جہاز کو اس نے اور اس کے ساتھی سحل خان نے گرایا ہے، اس لیے جہاز پر اور اس کے انگریز پر ان کا حق ہے۔ موقعے پر کوئی گواہ موجود نہیں تھا جس نے فریقین کو گولیاں چلاتے یا جہاز کو گرتے دیکھا ہو، اس لیے اب اس معزز جرگے پر یہ ذمہ داری آن پڑی ہے کہ وہ دونوں کے بیانات کی روشنی میں حالات و واقعات کا جائزہ لے اور فیصلہ کرے کہ اس واقعے میں بچ جانے والے انگریز پر کس کا حق بنتا ہے۔ دونوں فریقوں کو جرگے کا فیصلہ منظور ہوگا۔'

شام تک بحث ہوتی رہی، پاؤ جان اور مدار خان نے اپنا اپنا موقف اور دعویٰ پیش کیا، لیکن جرگہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اگلے دن جرگے کے آٹھ نسبتاً تندرست ارکان، چار وزیر اور چار محسود، پاؤ جان اور مدار خان کے ساتھ چڑھائی چڑھ کر جائے وقوعہ کے معائنے کے لیے گئے۔ پاؤ جان نے واقعے کی جزئیات ان کے پیش آنے کے وقت اور محل وقوع کی مناسبت سے پیش کیں۔ اس نے لیٹ کر، بیٹھ کر، کھڑے ہو کر اور دوڑ کر بتایا کہ کب کیا ہوا تھا۔ جہاز کس طرف سے نمودار ہوا، پہلی گولی کہاں سے چلائی گئی، الکڈ کے اندر وہ کہاں تک دوڑا، کس جگہ سے الکڈ کے کناروں سے چڑھ کر باہر آیا۔ جرگے نے الکڈ کی ریت میں اور ادھر ادھر جھاڑیوں میں اس کی چلائے ہوئے تھری ناٹ تھری کے کچھ کھوکھے بھی اکٹھے کر لیے۔ جہاز کے ملبے میں سے بھی تھری ناٹ تھری کا ایک چپٹا سکہ برآمد ہو گیا۔

دوسری جانب مدار خان نے بتایا کہ وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ ایک شادی میں شرکت کرنے شاہی گرام جا رہا تھا کہ اس نے جہاز اڑتے ہوئے دیکھا اور اس پر فائر کھول دیا۔ تاہم وہ نہ تو جرگے کو تفصیلات کے بارے میں مطمئن کر سکا اور نہ ہی اس کی جرنیل کے کارتوسوں کے کھوکھے کہیں پائے گئے۔

اگلے دن جرگے کا متفقہ فیصلہ آ گیا۔ جہاز پاؤ جان نے اکیلے مار گرایا ہے، اس لیے جہاز کے ملبے اور انگریز پر صرف اسی کا حق ہے۔ پاؤ جان اور اس کے دوست اٹھ کر اتن ناچنے

لگے۔ گاؤں کا ڈھولچی بھی آ گیا اور اس نے اس قدر زور سے اتن کی دھن پر ڈھول پیٹنا شروع کر دیا کہ تمام وادی گونجنے لگی۔ رفتہ رفتہ نصف موسیٰ نیکہ اتن میں شامل ہو گیا۔ محسود اٹھ کر آہستہ آہستہ اپنے علاقوں کو جانے لگے۔

انگریز کا نام فیئر برودر تھا۔ حادثے میں اس کی ٹانگ پنڈلی کے قریب سے ٹوٹ گئی تھی اور کندھے پر بھی گہرا زخم آیا تھا۔ قبائلیوں نے اس کے علاج اور آرام میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اسے جس حجرے میں رکھا گیا تھا وہاں ایک لڑکا ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا جو اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا۔ اسے 'ڈیرہ منہ'، 'خدئے پہ امان' اور اس جیسے چند معمولی الفاظ کے علاوہ پشتو نہیں آتی تھی اور نہ ہی پورے موسیٰ نیکہ میں کوئی انگریزی جانتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے ساتھ ابلاغ میں کسی قسم کا مسئلہ پیش نہیں آیا۔ اسے شروع ہی میں اشاروں میں سمجھا دیا گیا تھا کہ اگر وہ تعاون کرے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ وہ مقامی کھانے کچھ زیادہ رغبت سے نہیں کھاتا تھا، جس کا قبائلیوں کو بڑا دکھ تھا۔ آخر پتہ چلا کہ نیزہ نرئی میں ایک شخص کے پاس کہیں سے لوٹے گئے کھانوں کے ڈبے تھے جس کو اس نے حرام ہونے کے خدشے کے پیشِ نظر کھولا تک نہیں تھا۔ وہ سارے ڈبے لا کر انگریز کو دے دیے گئے، وہ ایک ایک کر کے انھیں بڑے شوق سے چٹ کر گیا۔

دو ہفتوں میں اس کی اچھی خاصی بھوری داڑھی بڑھ آئی تھی۔ گاؤں کے نائی نے آ کر استرے سے اس کی داڑھی مونڈی تو اچھا خاصا پرانے جیسا لال منہ نکل آیا۔

جرگے کے فیصلے کے اگلے ہی دن لاہور کچہری کے ریٹائرڈ منشی محبت نور کو بلا کر اردو زبان میں ایک چٹھی تیار کر لی گئی، جس میں سب سے پہلے مطلوب الیہ کی خیریت دریافت کی گئی،

Scanned with CamScanner

اس کے بعد مارٹن کی خیریت کی اطلاع دی گئی، ساتھ میں اس کی جیب سے برآمد ہونے والی انعام والی پرچی نتھی کر کے اسے تین آدمیوں کے حوالے کر کے بنوں روانہ کر دیا گیا۔

کسی نے کہا کہ رزمک اور میران شاہ کے علاقوں میں رواج ہے کہ لوگ انگریز اسیروں کو آہستہ کر کے حکومت کے حوالے کرتے ہیں اس لیے فیئر برور کے ساتھ بھی یہی عمل کیا جائے۔ ابھی اس پر غور و فکر جاری تھا کہ ٹانک سے پلٹنے والے ایک وزیر کی زبانی معلوم ہوا کہ انگریز پورا تاوان صرف اسی صورت میں ادا کرتے ہیں اگر قیدی کے تمام اعضا سلامت ہوں۔ کوئی بھی عضو کم ہونے کی صورت میں تاوان کی رقم آدھی ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ اب بھی انگریز کو خصی کرنے کے حق میں تھے لیکن پاؤ جان سختی سے آڑے آ گیا۔

اس نے حساب لگا لیا تھا کہ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا ہر خصیہ قبیلے کو ساڑھے بائیس سو روپے میں پڑے گا۔

فتح خان بیٹا، اب جس مکان میں ہم رہتے ہیں وہ تمھارے پرنانا اور میرے دادا پاؤ جان کا ذاتی گھر ہے۔ وہ یہیں پل بڑھ کر جوان ہوئے، یہیں ان کی شادی ہوئی۔ آخر انھیں ایک واقعے کی وجہ سے یہ گھر کیا بلکہ علاقہ چھوڑ کر شوال جا کر آباد ہونا پڑا۔ جب انگریز نے موسیٰ نیکہ جلا دیا تو یہ مکان بھی اس کی زد میں آ گیا۔ پورے گاؤں میں صرف چند مکان ہی بچے، جن میں سے ایک تمھارے دادا نیاز بین کا بھی تھا۔ وہ چونکہ انگریز کی فوج کا حصہ تھے، اس لیے انگریزوں نے ان کا خیال رکھتے ہوئے ان کا مکان نہیں جلایا۔

دادا نے چونکہ ملک کے فیصلے کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی بندوق اس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لیے ملک نے گاؤں کی مسماری کا سارا الزام ان پر دھر دیا اور کہا کہ وہ پندرہ سو روپے جرمانہ دیں، ورنہ انھیں گاؤں سے نکال دیا جائے گا۔ دادا کے پاس اتنے پیسے کہاں تھے۔ ان کے بھائیوں نے بھی الٹا ملک کا ساتھ دیا، اس لیے دادا کو مجبوراً گاؤں سے نکلنا پڑا۔ وہ خاصا عرصہ ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہے۔ ان کی منگنی ہو چکی تھی لیکن ان کے پاس رہنے کی جگہ ہی نہیں تھی اس لیے شادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ آخر ایک دن انھوں نے پتہ ہے کیا کیا؟ اسی بندوق سے، جس کی وجہ سے انھیں جلاوطن ہونا پڑا تھا، انگریز کا جہاز مار گرایا۔

کون سی بندوق سے؟ یہ جو سامنے دیوار پر لٹک رہی ہے۔ یہی وہ بندوق ہے جو دادا سے مجھ تک پہنچی اور اب یہ تمھاری ہے۔ لیکن ابھی نہیں، ابھی تو یہ تم سے بھی لمبی ہے۔ بس تم جلدی جلدی بڑے ہو جاؤ تو میں تمھارے بابا سے کہوں گی کہ وہ تمھیں اس سے نشانہ لگانا سکھائے۔ اس کا نشانہ بہت زبردست ہے۔ وہ سامنے چٹان کے پاس سوکھا درخت نظر آ رہا ہے؟ یہ یہاں سے اس میں سوراخ کر سکتی ہے۔

Scanned with CamScanner

خیر، میں کہہ رہی تھی کہ پاؤجان دادا نے انگریز کا جہاز مار گرایا۔ اب کے ملک جم خان نے پاؤجان کو خوب ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسی ملک جم خان نے، جس نے تمھارے پرنانا کو جلاوطن کیا تھا۔ کیوں؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ جہاز اڑانے والے ایک انگریز کی جان بچانے کا انعام نو ہزار روپے تھا۔ لیکن یہ ملک جم خان بہت لالچی انسان تھا۔ تمھارے بابا نے بتایا ہے کہ اس کی اولاد اب بہت مالدار ہوگئی ہے۔ یہ نیچے سڑک کے کنارے جو بڑی چار دیواری ہے، یہ انھی کی حویلی ہے۔ تو ہوا یہ کہ جب انگریز کے بدلے نو ہزار روپے ملے تو وہ سارے کے سارے ہڑپ کر گیا۔

پاؤجان دادا نے کہا کہ اس میں سے جرمانے کی رقم کاٹ کر باقی پیسے میرے حوالے کر دو۔ جرمانہ کتنا تھا؟ پندرہ سو۔ اور انعام نو ہزار۔ نو ہزار میں سے پندرہ سو نکالے تو بتایا کیا بچا؟ کاپی پنسل رہنے دو یہیں تنکے سے حساب کرو۔ شاباش میرے لال، بالکل ٹھیک۔ جواب ہے، سات ہزار پانچ سو۔ تو دادا نے کہا کہ سات ہزار پانچ سو میرے حوالے کر دو، لیکن پتہ ہے لالچی ملک نے کیا کہا؟ اس نے کہا کہ یہ پیسے اکیلے دادا کی ملکیت نہیں ہیں، بلکہ ان میں تمام گاؤں کا حصہ ہے۔ دادا نے کہا کہ مکانوں کی تعمیر کے پندرہ سو اس میں سے نکال لو، لیکن اس نے گاؤں کے لوگوں کے دس دن تک غاروں میں یا رشتہ داروں کے ہاں رہنے کو بھی دادا کے کھاتے میں ڈال کر ساری رقم ہتھیالی اور دادا کو صرف تین سو روپے دینا چاہے۔ دادا کے بھائی بہت ڈرپوک اور دو تھے، انھوں نے دادا کا بالکل ساتھ نہیں دیا۔ دادا پورے گاؤں سے کیسے لڑتے، انھوں نے گاؤں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ملک جم خان کو انھوں نے چھوڑا نہیں۔ جاتے جاتے وہ اس پر گولی چلا کر آئے تھے۔ قسمت اچھی تھی کہ اس کی جان بچ گئی، اور گولی گھٹنے میں لگی۔ اس کے بعد وہ جب تک زندہ رہا، لکڑی کی ٹانگ کے سہارے چلتا رہا۔

دادا اپنی دلھن کو لے کر اس علاقے سے چلے آئے اور شوال میں بس گئے۔ پھر کبھی ساری زندگی واپس موسیٰ نیکہ نہیں جا سکتے، وہی موسیٰ نیکہ جس کا نام اب انگور اڈا ہو گیا ہے۔ ویسے میری کہانی بھی ایک طرح سے تمھارے پرنانا سے ملتی جلتی ہے۔ میں شوال میں پیدا ہوئی تھی، اور

مجھے بھی بالکل تمھارے پرنانا کی طرح ایک ملک کی وجہ سے جلاوطن ہونا پڑا، اور مجھے بھی تمھارے پرنانا کی طرح ساری زندگی یہ غم رہے گا کہ میں جیتے جی کبھی اس علاقے میں واپس نہیں جا سکوں گی۔

Scanned with CamScanner

گل مینہ، تم نے پوچھا تھا کہ یہ خرقہ قندہار کیسے پہنچا۔ اس دن مجھے خود معلوم نہیں تھا اس لیے میں نے گول مول جواب دیا تھا لیکن تمھاری بات میرے دل میں کھٹکتی رہی۔ ایک دن میں نے ملاواؤد سے دریافت کیا۔ مزے کی بات ہے کہ وہ بڑے عالم ہیں لیکن انھیں بھی پتہ نہیں تھا۔ خیر آج جب میں انھیں قندہار لے گیا تو انھوں نے خرقہ شریف کی زیارت کے ایک محافظ کو بلوالیا اور اس سے ساری تفصیل حاصل کر لی۔

جو کچھ اس نے بتایا وہ میں تمھیں کوئی چیز کم یا زیادہ کیے بغیر بتا رہا ہوں۔

یہ خرقہ شریف اصل میں آج سے ڈھائی سو سال پہلے بخارا شہر میں تھا۔ افغانستان کے بانی احمد شاہ ابدالی نے بخارا پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ ان کے ہاتھ خاصا مال و اسباب، نوادرات، سونا، چاندی اور ہیرے جواہرات آئے۔ اسی دوران کسی نے انھیں بتایا کہ یہ ہیرے موتی کچھ نہیں، بخارا کا سب سے انمول خزانہ تو ایک خرقہ ہے جو حضور پاک کی ملکیت میں رہ چکا ہے اور جو پچھلے پانچ سو سال سے بخارا کی ایک درگاہ میں موجود ہے۔ بابا ابدالی وہاں پہنچ گئے۔ درگاہ کے متولی شاہ صدرالدین بغدادی کی عمر اسی برس سے متجاوز تھی۔ وہ سفید جبہ پہنے درگاہ کے ایک کمرے میں اونچی کرسی پر عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں بیٹھے تھے۔ درگاہ کی دیواروں کا ہر مربع انچ اس قدر باریک، نفیس اور پیچیدہ پچی کاری سے مزین تھا کہ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ انسانی ہاتھوں کی فنکاری کا نمونہ ہے۔ اس ماحول میں شاہ بغدادی کا سادہ براق جبہ اور جبے سے بھی زیادہ سفید داڑھی وہ منظر پیش کر رہی تھی جیسے کرسی پر نور نے پگھل کر انسان کی شکل اختیار کر لی ہو۔ شاہ کا خاندان پچھلی پانچ صدیوں سے اس جبے کا واحد وارث تھا۔

بابا ابدالی اپنے وزیروں اور جرنیلوں کے ہمراہ شاہ کے سامنے پہنچے۔ انھوں نے کرسی

سے اٹھنا تو ایک طرف، نظر اٹھا کر نہیں دیکھا کہ کون آیا ہے۔ بابا ابدالی نے انھیں سلام کر کے کہا:

'شاہ جی، میں بڑی دور سے آیا ہوں، خرقہ شریف کے مقدس جلوے سے اپنی آنکھیں روشن کرنا چاہتا ہوں۔'

شاہ بغدادی نے اپنی آنکھیں اٹھائیں۔ ان کے چہرے پر اس قدر نور تھا کہ بابا ابدالی جیسے زبردست جنگجو اور سورما پر بھی ایک پل کو ہیبت طاری ہو گئی۔ وہ خاصی دیر کو بابا ابدالی کی طرف دیکھتے رہے، پھر کہا، 'تمھیں خرقہ نہیں دکھایا جا سکتا۔' یہ کہہ کر شاہ اٹھے اور اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔

بابا ابدالی کو غصہ تو بہت آیا لیکن شاہ بغدادی بخارا کی بڑی مذہبی شخصیت تھے اور مقدس خرقے کے نسل در نسل وارث۔ پورے خطے کا بچہ بچہ ان کا معتقد تھا۔ بابا ابدالی تھوڑی دیر شاہ کی خالی کرسی کے آگے کھڑے رہے، پھر مڑ کر وہاں سے واپس چلے گئے۔

اگلے دن آ کر انھوں نے دوبارہ خرقہ دیکھنے کی درخواست کی۔ شاہ جی نے دوبارہ انکار کر دیا۔

تیسرے دن بھی یہی ہوا۔ لیکن اب کی بار بابا ابدالی نے کہا، 'مجھے معلوم ہے آپ مجھے خرقہ دکھانے سے انکار کیوں کر رہے ہیں۔ لیکن میں آپ کی تسلی کے لیے قسم اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔' یہ کہہ کر بابا نے وہیں طاق میں پڑا ایک قرآن مجید اٹھایا اور اسے سر پر رکھ کر کہا، 'میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اس مقدس خرقے کو اس چٹان سے بیس قدم دور بھی نہیں لے جاؤں گا۔'

درگاہ کی باہری دیوار کے بالکل پیچھے سلیٹی رنگ کی ایک بہت بڑی چٹان تھی جس پر پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ درگاہ میں شاہ بغدادی کے درجنوں معتقد اور بابا ابدالی کے بیسیوں عمائدین موجود تھے۔ بابا ابدالی کے ایک وزیر نے کہا، 'حضور شاہ جی، اتنا بڑا شہنشاہ، عظیم سپہ سالار اور فاتح اس بھری محفل میں قرآن سر پر رکھ کر قسم کھا رہا ہے، اب تو اعتبار کر لیجیے۔'

شاہ بغدادی خاصی دیر سوچ میں گم رہے۔ 'ٹھیک ہے،' انھوں نے کہا۔ 'اندر صرف احمد

Scanned with CamScanner

شاہ جائے گا، اس سے پہلے وہ وضو بنا لے۔' بابا ابدالی نے حوض میں وضو بنایا، اور پھر شاہ جی کے پیچھے پیچھے چلتے درگاہ کے سب سے پچھلے حصے میں بنی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں آ گئے، جس کی دیواریں موٹے اور ان گھڑ پتھروں کی بنی تھیں اور فرش پر موٹی ریت بچھی تھی جس میں پاؤں دھنس رہے تھے۔ مرصع و منقش درگاہ کے اندر یہ کوٹھڑی کچھ ایسا عجیب تضاد پیش کر رہی تھی کہ دلوں پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ شاہ بغدادی کے دو بیٹے بھی ساتھ چلے آئے۔ کوٹھڑی کے اندر طاق میں شمع جل رہی تھی۔ کہیں سے عود اور لوبان کی لپٹیں آ رہی تھیں جو مدہوش کیے جا رہی تھیں۔ کوٹھڑی کے وسط میں سنگِ مرمر کا اونچا تخت بنا تھا جس پر تانبے کا بھاری صندوق پڑا تھا۔ صندوق بہت سادہ تھا البتہ اس کے چمکتے ہوئے طلائی تالے پر رنگ برنگے جواہر اس نفاست سے جڑے تھے جیسے کسی ماہر سنار نے اس پر برسہا برس صرف کیے ہوں۔ شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے نے جیب سے ایک ڈبیا نکالی جس کے اندر ایک چابی تھی۔ اس نے تالے میں چابی لگا کے اسے کھول دیا۔

صندوق کا بھاری ڈھکن اٹھا۔ بابا ابدالی نے اشتیاق سے اس کے اندر جھانکا لیکن وہاں چاندی کا صندوق پڑا تھا، جس کے ساتھ ایک بوسیدہ پوٹلی بھی تھی۔ اب شاہ کا بڑا بیٹا آگے آیا اور اس نے وہ صندوق دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔ اس نے بھی جیب سے چابی نکالی اور صندوق کھول دیا۔ بابا نے دیکھا کہ اس کے اندر بھی خرقہ نہیں بلکہ ایک صندوقچی ہے جو سونے کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں ایک خنجر بھی پڑا ہوا تھا۔ بڑے بیٹے نے صندوقچی اٹھا کر تخت پر رکھ دی۔ اب کے خود شاہ آگے بڑھے اور اپنے جبے کی جیب سے ایک چابی نکالی تو شمع کی روشنی میں اس پر جڑا ہیرا جگمگا اٹھا۔ شاہ نے تالے میں چابی گھمائی۔ تالا نہیں کھلا۔ انھوں نے دوبارہ چابی گھمائی، اب کے بھی کچھ نہیں۔ بڑا بیٹا آگے بڑھا لیکن شاہ نے اسے نظر انداز کر دیا۔ 'جانتے ہو، یہ صندوق بیس برس کے بعد کھل رہا ہے،' انھوں نے بابا ابدالی کو مخاطب کر کے کہا۔ 'میرا یہ چھوٹا بیٹا تیس سال کا ہے، اس نے زندگی میں صرف ایک بار ہی یہ صندوق کھلتے دیکھا ہے۔'

انھوں نے تالے میں سے چابی باہر نکال دی، اور تالا اوپر اٹھا کر احتیاط سے دوبارہ

اندر داخل کی۔ اب کے کھٹاک کی آواز آئی اور تالہ کھل گیا۔ شاہ نے تالہ کنڈے میں سے نکال کر تخت پر رکھ دیا اور صندوق کا پٹ آہستہ آہستہ اوپر کیا۔ بابا ابدالی نے سانسیں روک دیں۔

صندوق کے اندر خرقہ پڑا تھا۔

موٹی کھردری اون سے بنے اس خرقے کا رنگ مٹ گیا تھا اور اس کی سلائی موٹے کالے دھاگے سے کی گئی تھی۔ بابا ابدالی نے خرقہ صندوق سے نکال لیا۔ 'احتیاط سے، بارہ سو سال پرانا ہے یہ،' شاہ بغدادی نے کہا۔ بابا ابدالی نے خرقہ دوبارہ تہہ کر کے اپنے دونوں ہاتھوں پر ایسے رکھ لیا جیسے قرآن مجید اٹھایا جاتا ہے، اور کوٹھڑی سے باہر نکل کر درگاہ کے صحن میں آ گئے۔ شاہ اور ان کے بیٹے ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

وہاں شاہ کو کچھ شور سنائی دیا۔ انھوں نے گردن گھما کر دیکھا تو ایک عجیب نظروں کے سامنے تھا۔ درگاہ کی دیوار کے باہر سینکڑوں مزدور بیلوں، اونٹوں اور خچروں کی مدد سے سلیٹی چٹان پر رسے اور زنجیریں ڈال کر اسے لڑھکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مزدوروں کے ہاؤ ہو، اوزاروں کی کھٹک پٹک اور جانوروں کے ہنہنانے اور ڈکرانے کی آوازوں نے جیسے درگاہ کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ شاہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بابا ابدالی کی طرف دیکھا۔

بابا مسکرائے اور کہا، 'فکر نہ کیجیے شاہ جی، میں اس خرقے کو کبھی بھی اس چٹان سے بیس قدم سے زیادہ دور نہیں جانے دوں گا۔'

Scanned with CamScanner

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ شفیق کو اجنبیوں نے سرِ راہ پکڑا ہو۔

آج سے پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ وہ دن کا کام اطمینان بخش طریقے سے ختم کر کے سیٹی بجاتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے رک کر ایک ریڑھی سے بچوں کے لیے دو رجن کینو اور دو رجن کیلے خریدے۔ آج اس نے ٹرک کے ڈالے پر ایک ملنگ کی تصویر مکمل کی تھی جس پر اس کو بڑا ناز تھا۔ کل جب ٹرک کا ڈرائیور اور مالک آئیں گے تو وہ یقیناً خوشی کے مارے جھوم کے رہ جائیں گے۔ کیا پتہ جوش کے مارے اسے گلے سے لگا لیں اور معاوضے سے ہٹ کر انعام سے بھی نوازیں۔ لیکن اس موقعے پر بابو پینٹر کو آس پاس نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ انعام کی رقم بھی ہڑپ کر لے گا۔ شفیق کے ذہن میں ناگواری کا سایہ لہرایا، لیکن اس نے جلد ہی سنبھل کر آج کے کام پر توجہ مرکوز کر دی۔ سیاہ لباس پہنے، لمبی زلفوں والے اس ملنگ کے ایک ہاتھ میں کشکول تھا اور وہ دوسرے ہاتھ میں چرٹا اٹھائے جھوم رہا تھا۔ اس نے تصویر کے ایک ایک حصے پر سخت محنت کی تھی۔ خاص طور پر ملنگ کے کشکول نے اسے بہت تنگ کیا تھا۔ پہلے تو اس نے ویسے ہی سیاہ رنگ کا کٹورہ سا بنانا چاہا لیکن اس کی شکل کچھ عجیب سی بن گئی۔ کئی بار ڈرائنگ کر کے بھی وہ مطمئن نہ ہو سکا۔ آخر تنگ آ کر وہ اصل کشکول کی تلاش میں نکل گیا۔ ادھر ادھر سے پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ کہیں نہیں بکتے۔ پھر کسی نے بتایا کہ کشکول جرمنی سے بن کر آتے ہیں۔ شفیق کو اس پر یقین نہ آیا لیکن اس سوال کا جواب نہ مل سکا کہ آخر بھکاری کہاں سے اپنا کشکول حاصل کرتے ہیں۔ اس زمانے میں ویسے بھی کشکول کا استعمال تھوڑا کم پڑ گیا تھا، اب جو اس نے کسی کشکول بردار بھکاری کو ڈھونڈنا چاہا تو وہی مل کے نہ دے۔ اس نے ڈرائیوروں سے کہا، اپنے شاگرد دوڑائے، خود بازاروں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ بڑی مشکل سے کہیں جا کر ایک کشکول کچھ

دیر کے لیے ہاتھ آیا اور اس کے لیے بھی فقیر کو کرایہ دینا پڑا کیوں کہ اس نے کہا تھا کہ کشکول کے بغیر اس کی دیہاڑی آدھی رہ جاتی ہے۔

تصویر میں دکھائے گئے ملنگ کی گدڑی پر جگہ جگہ رنگ برنگے پیوند لگے ہوئے تھے لیکن شفیق نے کوشش کی تھی کہ رنگوں میں ہم آہنگی ہو اور وہ آنکھوں کو بھلے لگیں۔ اپنا کام عمدگی سے مکمل کرنے پر اسے بے حد خوشی ملتی تھی، اور اس خوشی میں اس وقت چار چاند لگ جاتے تھے جب کوئی دوسرا اس کے جاننے والوں، خصوصی طور پر اس کے حریفوں کے سامنے اس کی تعریف کرے۔ اس موقعے پر وہ اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتا تھا۔ اس کی باچھیں دونوں کانوں تک کھل جاتیں اور اس کا دل کرتا کہ وہ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی گلے لگا لے۔ حتیٰ کہ اس دن اسے بابو پینٹر کی پھنکار بھی ناگوار نہ گزرتی۔

شفیق ریلوے پھاٹک سے گزر کر دائیں ہاتھ مڑا اور سینما کی جانب چل پڑا۔ یہاں سڑک پر رکشوں، ریڑھیوں اور پیدل چلنے والوں کا سیلاب رواں تھا۔ بھیڑ اس قدر تھی جیسے کوئی جلوس جا رہا ہو، صرف پیشہ ور نعرے بازوں کی کمی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے دو شاپنگ بیگ بار بار لوگوں کے گھٹنوں سے ٹکراتے تھے۔ خان ہوٹل کے سامنے پہنچ کر اس نے سڑک پار کی اور فٹ پاتھ کے اوپر دھری سبزی فروشوں کی چھابڑیوں اور سستی گھڑیوں کے خوانچوں سے بچ بچا کر چلنے لگا۔ اسی دوران تین آدمی اس کے دائیں بائیں ہو گئے۔ ایک نے اسے کندھے سے پکڑ دو دکانوں کے بیچ میں دیوار کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ شفیق سمجھا کہ وہ اسے ہٹا کر آگے نکلنا چاہتے ہیں، اس نے جھنجھلا کر ایک طرف ہونے اور انھیں راستہ دینے کی کوشش کی، لیکن اب دوسرے شخص نے بھی اسے پکڑ لیا تھا۔ اس نے ان کی طرف دیکھا لیکن وہ دونوں اس کے اتنے قریب تھے کہ اسے کچھ نظر نہیں آ سکا۔

وہ دونوں اسے رگیدتے ہوئے دیوار کے قریب لے گئے۔ ایک نے اس کے کندھا چھوڑ کر گریبان زور سے پکڑ لیا اور جھٹکے سے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ شفیق کے ہاتھوں سے شاپنگ

Scanned with CamScanner

بیگ زمین پر گر گئے اور کینوئکل کر سڑک کی طرف لڑھکنے لگے۔ 'کون ہو تم لوگ؟ کیا چاہتے ہو؟' اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلا۔

اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے جس آدمی نے گریبان پکڑ رکھا تھا، اس نے کہا، تمھی شفیق ہو؟ شفیق رنگساز؟' اس آدمی کا قد شفیق سے کوئی ایک فٹ اونچا ہو گا اور اس کے ایک شانے کا دوسرے سے فاصلہ اتنا تھا کہ اس میں دو شفیق سما سکتے تھے۔ مغرب میں مکانوں کے چھتوں پر سے ڈھلتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں اس کی سیاہ داڑھی میں سے چھن کر آ رہی تھیں۔

'ہاں، میں ہوں، لیکن تم کون ہو اور اس طرح مجھے پکڑنے کا مطلب کیا ہے؟' شفیق نے کہا۔

'تم ٹرکوں پر تصویریں بناتے ہو؟' اس نے گریبان کو جھٹکا دے کر کہا۔ شفیق نے مزاحمت کرنے یا آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگوں کو مدد کے لیے آواز دینے کا سوچا لیکن اس آدمی کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے بے حس و حرکت کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔ اسی دوران دوسرے دونوں آدمی بھی اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے جس سے آڑی بن گئی تھی۔

'ہاں۔ ل ل لیکن۔۔۔'

'تم مسلمان ہو یا کافر؟'

'م مسلمان۔'

'تمھیں شرم نہیں آتی مسلمان ہو کر رنڈیوں کی تصویریں بناتے ہوئے؟ گھر گھر بے حیائی پھیلاتے ہوئے؟'

شفیق پوری طرح گڑبڑا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ 'م م میں تو صرف ٹرکوں پر۔۔۔'

'جن ٹرکوں پر تم تصویریں بناتے ہو، وہ پورے پاکستان کی گلی گلی میں جاتے ہیں،

وہاں انھیں مرد، عورتیں، نوجوان لڑکے، لڑکیاں، بچے سبھی دیکھتے ہیں۔ کیا پیغام دے رہے ہو تم انھیں؟'

'جی، وہ تو ڈرائیور اپنی مرضی سے بنواتے ہیں، وہ پوسٹر اور تصویریں لے کر آتے ہیں میرے پاس،' شفیق نے کہا۔

اس آدمی نے شفیق کے گریبان کو جھٹکا دیا اور تھوڑا پیچھے ہٹ کر چناخ سے ایک تھپڑ اس کے بائیں گال پر رسید کر دیا۔ شفیق نے اضطراری طور پر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی تو اس کا سر زور سے دیوار سے جا ٹکرایا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک شخص نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا پھر گردن پھیر کر اپنے راستے پر ہو لیا۔

'تصویریں وہ لے کر آتے ہیں، لیکن انھیں تمھارا باپ بناتا ہے، بے غیرت آدمی؟ کون انھیں گلی گلی نشر کرتا ہے؟ بچوں، نابالغ لڑکیوں اور پردہ دار عورتوں کے سامنے یہ فحاشی کی نمائش کون چلاتا ہے؟ بولو تم کہ تمھارا باپ؟ بولو!' اس نے شفیق کے گریبان کو زور زور سے جھٹکے دیتے ہوئے پوچھا۔

شفیق نے دیکھا کہ دو تین راہگیر تماشا دیکھنے کے لیے رک گئے تھے۔ اس آدمی نے شفیق کا گریبان یوں جکڑ رکھا تھا کہ وہ سٹ کر اس کے گلے کے گرد گھیرا تنگ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اسے سانس لینے میں دقت ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گرد تماش بینوں کا نیم حلقہ بن گیا، بالکل ایسے ہی جیسے چھچھوندر کا تیل بیچنے والے عطائی یا سانپ نیولے کی لڑائی دکھانے والے مداری کے گرد بن جاتا ہے۔

شفیق روہانسا ہو گیا۔ اس کی زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی نے اسے یوں سرِ عام رسوا کیا ہو۔ ورکشاپ میں اکثر لوگ اس کی اور اس کے کام کی عزت کیا کرتے تھے اور اسے استاد کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ پورے شہر میں درجنوں ایسے پینٹر ہوں گے جنھیں اس نے تربیت دی تھی اور اب وہ مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ کبھی وہ اس کے سامنے آ جاتے تو

Scanned with CamScanner

جھک کے ملتے تھے اور اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تعظیم سے تھام کر مصافحہ کرتے تھے۔ لیکن اب اس ناگہانی افتاد نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

'تمھیں معلوم نہیں ہے کہ اسلام میں جاندار کی تصویر بنانا منع ہے؟ تمھیں معلوم نہیں ہے کہ قیامت کے روز جاندار کی تصویر بنانے والے سے کہا جائے گا کہ اس میں جان ڈالو؟ کیا جواب دو گے اس وقت؟'

اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن الفاظ کی بجائے آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور بھل بھل گالوں پر بہنے لگے۔

'اب عورتوں کی طرح رو رہا ہے یہ بے غیرت۔' اس آدمی نے اس کا گریبان مزید مروڑتے ہوئے کہا۔ 'دل تو کرتا ہے کہ خنجر نکال کر یہیں گردن پر پھیر دوں، لیکن میں جانتا ہوں کہ تمھارے بچے ہیں، ان کی یتیمی کے خیال سے معاف کر رہا ہوں، ورنہ۔۔۔' اس نے جھٹکا دے کر شفیق کا گلا چھوڑ دیا۔ 'لیکن یاد رکھو، اگر اس کے بعد تم نے کوئی انسانی تصویر بنائی تو پھر کوئی سوال جواب نہیں ہوگا، آئی سمجھ؟' اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی شفیق کے گلے پر پھیرتے ہوئے کہا۔

تینوں تماشائیوں کا حلقہ توڑ کر چلے گئے۔ شفیق خاصی دیر وہیں کھڑا گلا سہلاتا رہا۔ پھر سر جھکا کر دھیرے دھیرے بس سٹاپ کی طرف چل پڑا۔ کینوؤں اور کیلوں کے تھیلے کا خیال اسے گھر پہنچ کر آیا۔

اس واقعے نے شفیق کو اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اسے گھر جاتے ہی بخار چڑھ گیا اور وہ تین دن تک ورکشاپ نہیں جا سکا۔ اس واقعے کے بعد اس نے اپنی ساری توجہ صرف سینریاں بنانے پر مرکوز کر دی۔ انسانی تصویروں کی فرمائشیں ٹھکرانے پر بابو پینٹر نے اسے کئی بار ڈانٹا پھٹکارا، بلکہ نوکری سے نکالنے کی دھمکی بھی دی، لیکن شفیق ٹس سے مس نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ فرمائشیں خود ہی دم توڑ گئیں۔ اب دوسرے پینٹروں نے بھی انسانی تصویریں بنانی چھوڑ دی تھیں۔ کچھ

عرصے تک اسے اپنی یا دوسرے پینٹروں کی بنائی ہوئی اداکاروں، ملکاؤں، فوجیوں اور سیاست دانوں کی تصاویر ڈالوں پر نظر آتی رہیں لیکن پھر اس نے دیکھا کہ کئی ٹرک والوں نے ان کے اوپر سینریاں پینٹ کروالی ہیں۔

Scanned with CamScanner

پاؤ جان نے ٹیلے کی چوٹی پر اونٹ کی کوہان کی طرح ابھری ہوئی چٹان کے اوپر چڑھ کر نیچے جھانکا۔ اوٹ ہٹتے ہی نیچے میدانوں سے اٹھنے والی گرم ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ قصبہ گہری نیند میں مدہوش تھا۔ صرف کہیں کہیں مٹی کی چھتوں کے اندر سے چھن کر لالٹین یا دیے کی روشنی کی کرنیں باہر نکل پا رہی تھیں۔ پاؤ جان نے نیاز بین خان اور ابراہیم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔

یار محمد کے پاس توڑے دار بندوق تھی جس پر پاؤ خان کو کچھ زیادہ اعتبار نہیں تھا، البتہ وہ اس کا بچپن کا دوست تھا جس کی بے جگری اور وفاداری میں کوئی شک نہیں تھا اس لیے وہ ہر مہم میں اسے ساتھ لے جاتا تھا۔ ابراہیم ان سے پانچ سات سال بڑا اور منجھا ہوا کھلاڑی اور پہاڑی راستوں کا کھرا تھا، مزید یہ کہ وہ وانہ کیمپ کے نقشے سے بخوبی واقف تھا اور اس لیے وہ اس مہم کی کامیابی میں کنجی کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے پاس بھی توڑے دار بندوق تھی لیکن اس کی حالت بہت بہتر تھی اور وہ اس کا استعمال بھی بخوبی جانتا تھا۔ خود پاؤ خان کے پاس تھری ناٹ تھری رائفل تھی جو اس نے پچھلے سال ایک گورکھا سپاہی سے ہتھیائی تھی جس کا تذکرہ وہ اتنی بار کر چکا تھا کہ بچے بچے کو اس واقعے کی جزئیات ازبر ہو چکی تھیں۔ موسیٰ خیکہ کے بازار میں چلتے ہوئے ہر شخص اس کے کندھے سے لٹکتی ہوئی رائفل کو احترام بھرے رشک کی نگاہ سے تکتا تھا۔

وہ اس رائفل کی یوں دیکھ بھال کرتا تھا کہ گویا کوئی نئی نویلی ماں اپنے نومولود بچے کا خیال رکھتی ہوگی۔ اس کی ماں نے بندوق سے اس کا اس قدر لگاؤ دیکھ کر رنگین دھاگوں سے اتنا دلکش پٹہ بنا تھا کہ ہر کوئی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ دو مہینے پہلے پاؤ جان نے نشانے بازی کے مقابلے میں اسی رائفل سے ایک منٹ کے اندر اندر تیس گولیاں نشانے پر داغ کر اپنے سارے

حریفوں کو دھول چٹا دی تھی۔

یہ تینوں بغر چینہ میں چلغوزے اور صنوبر کے درختوں کے اندر سے گزرتے ہوئے سرہ کنڈا اور پھر منزہ او بو کے الگڈوں سے ہوتے ہوئے آ رہے تھے۔ یہ راستہ اکثر پاوندوں کے استعمال میں رہتا تھا جو ہندوستان سے افغانستان آتے جاتے رہتے تھے۔ شام سے اب تک وہ دس میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے، اس کے باوجود منزل قریب آنے سے پاؤ جان کے بدن میں نئی توانائی کی لہروں نے ہلکورے لینا شروع کر دیے۔ ڈھلوان سے اترتے ہوئے تینوں بے حد محتاط تھے کہ کوئی کنکر پاؤں کی ٹھوکر سے نیچے لڑھک نہ جائے، کہیں کسی جگہ خشک مٹی میں پاؤں رپٹ نہ جائے جس سے آواز پیدا ہو۔

قصبے کے مشرق میں بازار سے آدھ میل کے فاصلے پر فوجی کیمپ کے دونوں برج گیس کے ہنڈولوں سے روشن تھے۔ دور بٹانی کی پہاڑیوں کے پیچھے سے آخری راتوں کے چاند کی مدھم بھانک نمودار ہو رہی تھی جس نے ماحول کو جادوئی اثر بخش دیا تھا۔ لیکن اس کی روشنی اس قدر کم تھی کہ تاروں کی آب و تاب کو زیر کرنے کے قابل نہیں تھی۔ ان دور روشنیوں کی مدد سے نیچے پہاڑیوں کے دامن میں بچھی وانہ کی سنگلاخ وادی کا ہیولا کئی میل تک نظر آ رہا تھا جس کے سروں پر دور پہاڑیاں دھوئیں میں لپٹے ہوئے بھوسے کے ڈھیروں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔

آدھے گھنٹے بعد قصبے کے گرد لمبا چکر کاٹ کر وہ کیمپ کے جنوب میں پہنچ گئے۔ روشن ہنڈولوں والے برج مرکزی دروازے کی جانب تھے، جب کہ پچھلا حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ابراہیم نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ پاؤ خان نے قریب جا کر سن گن لینے کی کوشش کی۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے ایک گھوڑے کے گھر کنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے خوش ہو کر ابراہیم کی پیٹھ ٹھونکی۔

ابراہیم کئی دفعہ اس کیمپ میں آ چکا تھا اس لیے وہ یہاں کے حدود اربعہ سے اچھی طرح سے واقف تھا۔ بلکہ وہ گذشتہ روز کرنل الفنسٹن کے اس جرگے میں بھی شامل تھا جس میں کرنل نے

Scanned with CamScanner

ایک خصوصی تحفے کی آمد کا ذکر کیا تھا جو برطانیہ سے بحری جہاز کے ذریعے کراچی، پھر وہاں سے ریل کے ذریعے بنوں، اس کے بعد لاری میں مرتضیٰ اور پھر وہاں سے پیدل وانہ پہنچا تھا۔ یہ فراخ دلانہ تحفہ سرکار برطانیہ کی جانب سے علاقے کی بہبود کے لیے بھیجا گیا تھا۔ البتہ تحفے، بلکہ دو تحفوں کے پہنچنے سے پہلے ہی سارے علاقے میں ان کی آمد کی خبریں پہنچ گئی تھیں، اور پاؤ جان نے تین دن پہلے حرکت میں آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

آخر یہ انگریز اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں، وہ پچھلی پون صدی سے ان پہاڑوں سے سر ٹکرا رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں زیر نہیں کر سکے، ہر بار پہاڑوں سے سر ٹکراتے ہی رہ گئے تو اب انھوں نے ہماری مونچھ نیچی کرنے کے لیے یہ گھٹیا اور نیچ طریقہ سوچا ہے۔ لیکن ہم بھی انھیں دکھا دیں گے کہ ہم کون ہیں۔ یاد کرتے رہیں گے کہ کس سے پالا پڑا تھا۔

تین فٹ موٹی اور گیارہ بارہ فٹ اونچی مٹی کی دیوار پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ کہیں کوئی رخنہ بھی نہیں تھا جس پر پاؤں ٹکائے جا سکیں۔ پاؤ جان تینوں میں سب سے ہلکا تھا، ابراہیم نیچے بیٹھا اور پاؤ جان اس کے کندھوں پر سوار ہو گیا اور پھر دیوار پھلانگ کر اندر کود گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور تینوں اندر داخل ہو گئے۔ یہاں پیشاب اور لید کی ملی جلی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ لمبے برآمدے میں کم از کم پچاس خچر اور گھوڑے بندھے تھے، ان میں کچھ ساکت و صامت مورت کی طرح کھڑے کھڑے سو رہے تھے، جب کہ کچھ سدا کے بھوکے عادت سے مجبور ہو کر سامنے کھرلی سے کبھی کبھی پیال کا تنکا اٹھا کر منہ میں پوپلتے تھے، اور پھر گہری گمبھیر سوچوں میں گم ہو کر مٹی کے مادھو بن جاتے تھے۔

مدرسے کی دیوار پر تصویر کی منصوبہ بندی کرتے کرتے شفیق کو اچانک یاد آیا کہ اس نے ایک بار کسی ٹرک پر ایک محل کی تصویر بنائی تھی۔ کوئی سنگِ مرمر سے بنی ہوئی گنبد والی عمارت تھی جس کے اردگرد چار مینار تھے اور سامنے پانی کا حوض جس میں جگہ جگہ فوارے نصب تھے۔۔۔ ہاں، محل کے لیے وہ عمارت مناسب رہے گی۔ لیکن وہ تصویر بنوانے کے لیے تو ڈرائیور ایک بڑا سا پوسٹر لے کر آیا تھا، جسے دیکھ دیکھ کر میں نے تصویر بنائی تھی۔۔۔ کہتا تھا کہ ہندوستان کے کسی بادشاہ نے اپنی ملکہ کے لیے بنایا تھا وہ محل۔۔۔ زبانی تو یاد نہیں ہے وہ، خیر دیکھیں گے، جس حد تک یاد آیا بنا دیں گے۔

شفیق کو کاغذ پر منصوبہ بندی کرتے کرتے دو دن گزر گئے۔ اس دوران اس نے دسیوں نقشے بنا کر پھاڑ ڈالے۔ جب وہ حتمی نقشے سے مطمئن ہو گیا تو اس نے دیوار پر کچی ڈرائنگ کرنا شروع کر دی۔ فتح خان سبق سے فارغ ہو کر سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتا تھا اس کے سارے کام بھاگ بھاگ کر فٹافٹ نمٹا دیتا تھا۔ وہ بے حد توتلا تھا اور ٹ ڈ ر ڑ حتیٰ کہ س جیسے حروف نہیں بول سکتا تھا۔ تاہم شفیق نے اس کی تحریر دیکھی تو اس کے الفاظ کی نشست اور تناسب سے بہت متاثر ہوا۔ شفیق نے یہ بھی محسوس کیا وہ باقی طالبوں سے تھوڑا الگ تھلگ رہتا ہے، اور اسے جب بھی موقع ملتا ہے، چپکے سے آ کر اس کی پیچھے بیٹھ جاتا اور اسے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔

پہلے شفیق نے سوچا کہ دیوار پر سینما کے پینٹروں کی طرح چار خانی لکیریں کھینچ کر کاغذ پر بنا خاکہ منتقل کر دے، لیکن پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے بغیر بھی کام چل جائے گا۔ خاکہ مکمل کرنے کے بعد پہلا مرحلہ آسمان میں رنگ بھرنا تھے۔ سب سے پہلے اس نے میز پر چڑھ کر دیوار

Scanned with CamScanner

کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چالیس فٹ لمبا آسمان بنایا۔ نیلا رنگ ہر جگہ ہموار اور سپاٹ نہیں تھا، شفیق کو معلوم تھا کہ آسمان افق کے قریب ہلکے رنگ کا ہوتا ہے، اور اس کے اوپر گہرا ہوتا جاتا ہے، جب کہ عین سر کے اوپر آسمان کا رنگ سب سے گہرا نیلا ہوتا ہے۔ اصل استادی یہ ہے کہ نیلے رنگوں کے ان تمام شیڈوں کو اس طرح ایک دوسرے میں اس طرح مدغم کرنا پڑتا ہے یہ پتہ نہ چل سکے کہ کون سا رنگ کہاں سے شروع ہوا اور کہاں ختم ہوا۔

جب میز پر کھڑے کھڑے شفیق کے ہاتھ کی پہنچ ختم ہو جاتی اور وہ میز سے نیچے اترتا، فتح خان فوراً میز کھسکا کر آگے کر دیتا تھا۔ مدرسے کے خزانچی نصیب گل نے یہ دیکھ کر دو اور میزوں کا انتظام کر دیا، جس سے کسی قدر آسانی ہو گئی۔ ایک بار جب شفیق کے ہاتھ تھک کر شل ہو گئے تو اس نے فتح خان کو رنگ بنا کر دیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ جیسا اسے بتایا گیا تھا، اس نے بڑی صفائی سے ویسا ہی رنگ بھر دیا۔

جب نیلا رنگ سوکھ گیا تو اگلے مرحلے میں شفیق نے اس میں جگہ جگہ تازہ دھنکی ہوئی روئی کی طرح سفید بادل تیرتے ہوئے دکھانا شروع کر دیے جو اس قدر نرم و ملائم لگتے تھے کہ گویا پھونک ماری تو دیوار سے اڑ جائیں گے۔ طویل تجربے نے اسے بتایا تھا کہ عام لوگوں کو بادل ہمیشہ سفید رنگ کے دکھائی دیتے ہیں لیکن پینٹر کے لیے وہ کبھی بھی مکمل سفید نہیں ہوتے بلکہ ان میں کئی رنگوں کی جھلکیاں موجود ہوتی ہیں، سلیٹی، خاکستری، نیلا، ارغوانی، نارنجی، زرد، حتیٰ کہ سرخ۔ ان سب کا انحصار دن کے وقت، سورج کے زاویے، موسم کی صورتِ حال، اور زمین پر موجود چیزوں سے انعکاس پر ہوتا ہے۔ پینٹر کا کام یہی ہے کہ ان رنگوں کو سفیدی کے اندر اس طرح سے گھلا دے کہ بادلوں کی اصل کیفیت نکھر کر سامنے آ جائے۔ لیکن وہ بادلوں میں یہ رنگ اس وقت بھرے گا جب نیچے کا سارا منظر نامہ مکمل ہو جائے۔

بڑے کمرے میں نصیب گل اور فتح خان کے علاوہ کوئی اور نہیں آتا تھا۔ جب شام کو مغرب کی اذان سے کچھ پہلے کام ختم ہوتا تو نصیب گل کمرے کو تالا لگا کر چابی اپنی بغل والی جیب

میں ڈال لیتا تھا۔

خطیب صیب اکثر باہر رہتے تھے۔ ایک دن شفیق کام میں منہمک تھا کہ انھوں نے اچانک آ کر اس کے کندھے پر تھپکی دے کر اسے سراہا حالانکہ ابھی اصل کام شروع ہی نہیں ہوا تھا اور وہ صرف پس منظر پر کام کر رہا تھا۔

اسی دوران شفیق کو مدرسے کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ یہاں طلبہ کی تعداد سوسے اوپر تھی، اساتذہ بارہ تھے جن کی عمریں بیس سے ساٹھ سال کے درمیان تھیں۔ رات کو وہ اساتذہ کے ہاسٹل میں ایک اور استاد اور نصیب گل کے ساتھ سوتا تھا، جس کے فرائض میں اب مدرسے کے انتظامات کے علاوہ شفیق کی تمام ضروریات پورا کرنا بھی شامل ہو گیا تھا۔ اگلے ہفتوں میں شفیق کو مزید کئی چیزوں کی ضرورت پڑی، جو نصیب گل نے چند گھنٹوں کے اندر اندر مہیا کر دیں۔ کام کے علاوہ وہ شفیق کی ذاتی ضروریات کا بھی خیال رکھتا تھا۔ اسے کپڑوں کا ایک نیا جوڑا اور جوتے بھی دے دیے گئے تھے، جو اس کے پیروں میں تھوڑے کھلے تھے لیکن پھر بھی پرانے جوتوں سے بہتر تھے جو تقریباً جواب دے چکے تھے۔ وہ ایک بھاری اونی جرسی بھی لے آیا تھا، جس سے شفیق کو سردی کا مقابلہ کرنے میں مدد ملی۔

مدرسہ بڑی حد تک خود کفیل تھا اور سارا کام طلبہ اور اساتذہ ہی کیا کرتے تھے۔ کھانا چند استاد مل کر پکاتے، جب کہ لڑکے چاول صاف کرنے، سبزی اور گوشت کاٹنے، آٹا گوندھنے، روٹیاں پکانے اور دوسرے کاموں میں ان کی مدد کرتے تھے۔ مدرسے اور کمروں کی صفائی بھی وہ خود کرتے تھے اور کپڑے بھی جمعے کے جمعے مسجد کے صحن میں بنے تالاب پر خود ہی دھوئے جاتے۔ راولپنڈی میں شفیق عید بقر عید یا پھر رمضان میں کبھی کبھار نماز پڑھا کرتا تھا۔ یہاں کسی نے اسے کہا نہیں تھا، لیکن پھر بھی ہر نماز باجماعت پڑھنا پڑتی تھی۔ موسم خاصا خنک ہو چلا تھا، اس لیے اسے خاص طور پر صبح کے وقت گرم رضائی چھوڑ کر اٹھنا اور یخ بستہ پانی سے وضو بنانا شاق گزرتا تھا، لیکن چند ہی دنوں میں وہ اس کا عادی ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

'فتح خان، یہ تمہارا خطیب صیب کہاں جاتا ہے، میں نے تو اسے ہفتے میں ایک دو دن سے زیادہ کبھی مدرسے میں نہیں دیکھا' شفیق نے ایک روز اپنے شاگرد سے پوچھا جو اب رنگوں کی آمیزش سے لے کر خاکے میں رنگ بھرنے سمیت بہت سے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔

'پتہ نئیں' فتح خان نے کہا۔ وہ اس وقت ہاتھ میں سبز رنگ کی چھوٹی سی ڈبیہ پکڑے گھاس کے ایک شاداب قطعے کو بڑے خشوع وخضوع سے مزید شاداب بنانے میں مصروف تھا۔ وہ تو تلا ہٹ اور زبان لڑکھڑانے کے ڈر سے پہلے تو بولتا نہیں تھا، لیکن جب بولنا ضروری ہو تو مختصر ترین جواب پر اکتفا کرتا تھا، لیکن جب شاید اسے احساس ہوا کہ اس کے استاد کو اس کا مختصر جواب پسند نہیں آیا تو سر اٹھائے بغیر وہیں سے بولا، 'ملکے کہتے ہیں جہاد پل جاتا ہے، کافروں سے لڑنے کے لیے۔'

'اچھا؟ لیکن کہاں جاتا ہے کافروں سے لڑنے؟'

'پتہ نئیں' فتح خان نے کہا۔ 'ملکے کہتے ہیں افغانستان جاتا ہے، پاکستان جاتا ہے۔' پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا، اور آواز دھیمی کر کے بولا، 'کشی کو بتانا نئیں، ملکے اش کو خودکش ملا کہتے ہیں، بولتے ہیں اش نے اپنا ہاتھ سے شوکا فل قتل کیے ہیں۔'

شفیق اس وقت میز پر چڑھا ہوا دیودار کے درختوں کی چوٹیوں پر کام کر رہا تھا۔ اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ جلدی سے برش رکھ کر نیچے اتر آیا، 'خودکش ملا؟ وہ کیوں؟ خودکش ملا کیوں کہتے ہیں اسے؟'

فتح خان گڑبڑا سا گیا۔ 'ہم کو مالوم نئیں ہے، ملکے کہتے ہیں۔ کشی کو بتانا نئیں ہے، نئیں تو وہ مجھے لاتی سے مالیں گے۔'

اتنے میں دروازہ کھلا اور نصیب گل اندر داخل ہو گیا اور بات وہیں آئی گئی ہو گئی۔

شاہ صدرالدین بغدادی اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس چٹان کی طرح گمبھیر لہجے میں دھیرے دھیرے بول رہے تھے جسے تین روز قبل نادر شاہ اپنے ساتھ قندھار لے گیا تھا۔ شمع کی تھراتی ہوئی روشنی میں ان کی لمبی داڑھی کا عکس ان کے پیچھے پتھر کی دیوار پر یوں لرز رہا تھا جیسے ان کی کپکپاتی آواز سے تال ملانے کی کوشش کر رہا ہو۔ لوکا زاویہ کچھ ایسا تھا کہ سامنے دوزانو بیٹھے ہوئے ان کے بڑے بیٹے شمس الدین کو اپنے ضعیف والد کی آنکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن اندازے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی طرف براہِ راست نہیں، بلکہ پیچھے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے بول رہے ہیں۔ شمس الدین کو شاہ بغدادی نے کئی برس پہلے ایک تقریب میں درگاہ خرقہ شریف کا باقاعدہ طور پر جانشین مقرر کیا تھا۔ آہ، وہ درگاہ خرقہ شریف، جس میں سے خرقہ نکل گیا تھا اور جواب صرف درگاہ رہ گئی تھی۔

شاہ صدرالدین کی آواز کسی قسم کے جذبات سے بالکل عاری تھی۔ وہ کہہ رہے تھے، 'ویسے تو ہمارے خاندان کی روایت رہی ہے کہ یہ راز صرف بسترِ مرگ ہی پر جانشین تک منتقل کیا جاتا ہے لیکن تین دن پہلے پیش آنے والے غیر معمولی واقعے نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے اور اب مجھے بھی قدیم روایت توڑنا پڑ رہی ہے۔

'میں چاہتا ہوں کہ تم میری ساری باتیں کان کھول کر سنو اور انھیں اپنے دل و دماغ میں بٹھا لو۔ تمھیں یہ راز سوائے بسترِ مرگ پر اپنے جانشین کے، کسی اور کو بتانے یا لکھنے کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا شمس الدین؟'

'جی بابا، میں ہمہ تن گوش ہوں۔ آپ فرمایئے۔ ہر راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔'

'تو پھر اٹھو اور پہلے صندوق سے پوٹلی اور دوسرے سے خنجر نکال لو۔'

Scanned with CamScanner

شمس الدین اٹھا اور لوہے کا صندوق کھولا۔ ابدالی کی مکاری کے بعد سے سب ایسے حواس باختہ ہو گئے تھے کہ کسی کو ان صندوقوں کو تالا لگانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس نے باپ کے حکم کے بموجب دونوں چیزیں نکال کر ریتلے فرش پر ان کے سامنے رکھ دیں۔ شاہ جی نے پوٹلی کھولی۔ اس کے اندر نہایت خستہ حالت میں کاغذات موجود تھے۔ انھوں نے ایک پیلے رنگ کا کاغذ نکال لیا جس پر لکھی تحریر کی سیاہی اب ماند پڑ گئی تھی۔

'جانتے ہو یہ جھنڈا کس کا ہے؟' انھوں نے کڑھا ہوا ریشمی پارچہ فضا میں بلند کرتے ہوئے پوچھا۔ شمس الدین نے دیکھا کہ اس کا رنگ سفید، سرخ اور زرد تھا۔ اس پر نیلے اور سرخ رنگ سے کچھ نقش و نگار بھی بنے ہوئے تھے تاہم وہ حجرے میں چھائی نیم تاریکی کی وجہ سے ان کی نوعیت جاننے سے قاصر رہا۔

'نہیں بابا' اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

'یہ حسن الصباح کی سند ہے جو ان کے جانشین کو پشت در پشت ملتی چلی آئی ہے۔ آج یہ میرے پاس ہے اور اب میں اسے تمھارے حوالے کر رہا ہوں۔'

شمس الدین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ 'حسن بن صباح؟ جس نے سلسلۂ کوہ البرز کے دامن میں مصنوعی جنت بنا رکھی تھی اور جس کے قاتلوں نے بڑی تباہی مچا رکھی تھی؟'

'تم بالکل صحیح جگہ پہنچے ہو' بابا نے کہا۔ 'میں اسی حسن الصباح کی بات کر رہا ہوں۔ تو اب اپنے دل میں میری بات یوں جذب کر لو جیسے پیالہ بھر پانی روئی کی بوری میں جذب ہو جاتا ہے اور ایک قطرہ ضائع نہیں جاتا۔ ہم آج جو ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ تین دن پہلے تک جو تھے، اس کی وجہ ہمارے ایک جد ہیں جو آج سے تقریباً ساڑھے چھ سو سال پہلے حسن الصباح کے خاص الخاص فدائی تھے۔'

شمس الدین کو ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ شاید خرقہ لٹنے سے اس کے ضعیف والد کا دماغ الٹ گیا ہے اور وہ ہذیان کے عالم میں بول رہے ہیں۔ لیکن ان کے لہجے کی استقامت اور

تسلسل نے اسے اس خیال کو جھٹک دینے پر مجبور کر دیا۔

وہ کہہ رہے تھے، 'ان کا نام رکن الدین تھا اور وہ بغداد میں پیدا ہوئے تھے۔ میں ان کی تمام تر کہانی تمھیں سنا رہا ہوں تاکہ تمھیں سارے حالات و واقعات کا علم ہو سکے، اور اس کے بعد تمھیں جو فیصلہ کرنا ہے، وہ تم زیادہ دلجمعی سے کر سکو۔'

'جی بابا، آپ فرمائیے، میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں' شمس الدین نے کہا۔

'ٹھیک ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ رکن الدین بغداد میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ خلیفہ المستظہر باللہ کا دور تھا جب عباسی خلافت کی چمک دمک پوری طرح ماند ہو کر قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ رکن الدین کے والد تاجر تھے اور جو بغداد سے بخارا تک اسباب لایا اور لے جایا کرتے تھے۔ جب رکن الدین نے ہوش سنبھالا تو وہ اپنے والد کا ہاتھ بٹانے لگے۔

'لیکن یہ زمانہ تجارت و سوداگری کے لیے کچھ زیادہ سازگار نہیں تھا۔ ہر طرف ہاہا کار مچی تھی۔ ایک طرف تو صلیبی فرنگیوں نے قبلۂ اول بیت المقدس کو لوٹ کر تباہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے تمام مسلمان علاقوں میں ہیجان تھا، دوسری جانب مشرق میں سلجوقیوں نے قہر مچایا ہوا تھا۔ المستظہر مرا تو اس کا بیٹا المسترشد باللہ اس کی جگہ خلیفہ بن گیا لیکن اس آشوب میں اس کی وہی حیثیت تھی جو بگولے کی زد پر آئی ہوئی دھجی کی ہوا کرتی ہے۔

'اسی دوران سولہ سالہ رکن الدین اور ان کے والد بغداد سے مالِ تجارت لے کر رے پہنچے، جہاں سے انھوں نے کھجوریں، زعفران، ہندوستانی صندل اور مصری شیشے کے برتن خریدے اور بخارا کی سمت روانہ ہو گئے، جہاں سے انھیں یہ مال بیچ کر ان کے بدلے ریشم کے پارچہ جات، نفیس چینی ظروف اور خشک میوہ خریدنا تھا۔ لیکن مازندران کے پہاڑوں میں انھیں قزاقوں نے گھیر لیا اور رکن الدین کے والد سمیت قافلے کے بیشتر ارکان کو ہلاک کر دیا، اور رکن الدین کو قزوین کے بازارِ بردہ فروشی میں لے جا کر بیچ دیا۔

'وہاں سے اسے چند لوگوں نے خرید لیا اور ساتھ لے کر کسی پہاڑی علاقے کی طرف

Scanned with CamScanner

چلے۔ رکن الدین شدید رنج و غم اور خوف سے بے حال تھے کہ اب ان کی بقیہ زندگی غلامی کی ذلت سہتے ہوئے گزرے گی۔ رات انھوں نے رکن الدین کو کچھ پلا دیا اور وہ نہ جانے کتنی دیر غافل رہے۔

'رکن الدین کو جب ہوش آیا تو وہ یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے کہ ان کا سر ایک لڑکی کے زانو پر دھرا ہے جو مصری سے میٹھی آواز میں دھیرے دھیرے گنگناتے ہوئے ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی ہے۔'

خطیب صیب کچھ دنوں کے لیے مدرسے ہی میں رکے رہے۔ اس دوران وہ روزانہ آ کر شفیق کے کام کا جائزہ لیتے تھے اور اسے ہر بار شاباش سے نوازا کرتے تھے۔ جب مشرقی کونے میں سنگِ مرمر کا محل، اس کے آگے تالاب، تالاب کے اندر فوارے، اور دونوں کناروں پر سرخ اور گلابی پھولوں کے تختے مکمل ہوئے تو انھوں نے وہ مناظر دیکھ کر بڑے لحن سے قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔ خطیب صیب کی آواز میٹھی نہیں بلکہ بھاری تھی، لیکن ان کی تلاوت میں ایک پروقار آہنگ اور ٹھہراؤ تھا جس کو سنتے سنتے شفیق کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ اس نے ہاتھ روک دیا اور برش ڈبے کے پہلو میں رکھ کر توجہ سننے لگا۔

'کمال کر دیا ہے تم نے شفیق خانا' خطیب صیب نے چند آیات پڑھ کر کہا۔ 'جیسا میں سوچتا تھا تم نے اس سے دوگنا بہتر کام کیا ہے۔ آفرین ہے تم پر۔ میں تو سوچتا ہوں کہ جنت ویسی ہی ہوگی جیسی تم نے دکھائی ہے۔'

مولوی صاحب نے اپنی واسکٹ کی جیب سے ہزار ہزار کے کچھ نوٹ نکالے اور شفیق کی طرف بڑھا دیے۔ شفیق برش کو تیل کے پیندے میں ڈال کر کپڑے سے صاف کر رہا تھا، وہ غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ گیا۔ بعض اوقات ٹرک ڈرائیور اس کے کام سے خوش ہو کر اسے دو چار سو انعام دے دیتے تھے، جنھیں وہ بابو پینٹر کی آنکھ بچا خوشی خوشی جیب میں ڈال لیتا تھا۔ آنکھ بچانا اس لیے ضروری ہوتا تھا کہ اگر بابو پینٹر دیکھ لیتا تو وہ ان میں آدھے اڑا لیتا تھا۔ یہاں اسے خطیب صیب سے پیسے لیتے ہوئے تھوڑا حجاب آیا۔ اس نے 'نہ نہ' کیا لیکن خطیب صیب نے آگے بڑھ کے نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیے۔

'اچھا یہ بتاؤ شفیق خانا، تم نے قرآن پڑھا ہے؟'

Scanned with CamScanner

'جی خطیب صیب، بچپن مسجد میں مولوی صاحب سے پڑھا تھا۔'

'میرا مطلب ہے اس کا ترجمہ آتا ہے جو میں نے ابھی آیتیں سنائیں؟'

شفیق نے نفی میں سر ہلا دیا۔

'جنات تجری من تحتہ الانہار۔ اس کا مطلب ہے، جنت میں باغ ہوں گے اور ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، تم نے باغ دکھایا ہے، سبزہ دکھایا ہے، پھول دکھائے ہیں اور ان کے نیچے نہریں چلتی ہوئی دکھائی ہیں، حالانکہ تمھیں پتہ ہی نہیں تھا کہ جنت میں دراصل یہی کچھ ہوگا۔ اصلی اور سچا فنکار اسی کو کہتے ہیں۔ یہ خداوندی توفیق ہے جو تمھیں عطا ہوئی ہے۔'

شفیق نے خطیب صیب کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ وہ خطیب صیب سے اپنے گھر فون پر بات کروانے کی درخواست کرے، لیکن پھر اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ کیا پتہ وہ اس بات کو پسند کریں نہ کریں۔ ویسے ہی موڈ خراب ہو گیا تو کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ سو آدمی اپنے ہاتھ سے۔۔۔

'شفیق خانا' خطیب صیب کی آواز آئی تو وہ جھرجھری لے اپنے خیالات سے باہر آ گیا۔ میں چند دن کے لیے یہاں سے جا رہا ہوں۔ کوئی چیز چاہیے ہو تو نصیب گل کو بول دینا۔ اور ہاں، ایک بار پھر شاباش، بہت اچھا کام کر رہے ہو، بس جلدی جلدی اسے ختم کر دو، مجھے اس کی ضرورت ہے' خطیب صیب نے کمرے سے جاتے جاتے کہا۔

شفیق کو یہاں آئے ہوئے دو ہفتے سے اوپر کا وقت ہو گیا تھا، اس دوران اس کا زیادہ تر رابطہ فتح خان اور نصیب گل ہی سے رہا تھا۔ البتہ نماز پڑھنے یا دوپہر اور رات کے لنگر کے دوران دوسرے طلبہ اور اساتذہ سے بھی سلام دعا ہو جاتی تھی۔ لنگر کے دوران استاد ایک طرف اور لڑکے ہال کے دوسرے کونے میں زمین پر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک لڑکا دیگچے سے ہر پلیٹ میں کفگیر سے سالن انڈیل دیتا، جب کہ ایک اور لڑکا ہر ایک کے ہاتھوں میں ایک ایک روٹی تھماتا جاتا۔ ایک ایک پلیٹ میں چار چار افراد کھانا کھاتے تھے۔ اس دوران بلاضرورت بولنے پر پابندی تھی۔

کھانے کے دوران صرف لقمے چبانے یا پلیٹوں کے کھنکنے کی آوازیں آتی تھیں۔

مدرسے کے قریب ہی گاؤں تھا جہاں سے چند لوگ نماز پڑھنے آتے تھے، لیکن وہ زیادہ تر کھنچے کھنچے رہتے تھے اور نماز پڑھ کر جلدی سے اپنے گھروں کا رخ کرتے تھے۔ جمعے کے دن البتہ خوب رونق رہتی۔ دور سے دور سے لوگ پیدل یا گاڑیوں پر نماز پڑھنے آتے اور گاؤں کی گلیوں میں بھیڑ بھاڑ رہتی۔ اس دن خطیب صیب بھی بہت اچھے موڈ میں ہوتے اور خطبے کے وقت بیٹری سے چلنے والے لاؤڈ سپیکر کی مدد سے ان کی آواز آس پاس کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر گونجا کرتی۔ شفیق اب اتنی پشتو سیکھ گیا تھا کہ مفہوم سمجھ سکے، لیکن اس کا ذہن ادھر ادھر بھٹکتا رہتا تھا جس کی وجہ سے وہ تقریر کے الفاظ پر صحیح طریقے سے توجہ مرکوز نہیں رکھ سکتا تھا، لیکن سامعین کے تائید میں ہلتے سروں اور تمتماتے چہروں سے اسے اندازہ ہوتا کہ وہ لوگوں کو بہالے جانے کے فن پر عبور رکھتے ہیں۔

مدرسے میں شفیق کا تیسرا جمعہ تھا۔ خطیب صیب کا خطبہ جاری تھا کہ یکایک مغربی پہاڑیوں کے پیچھے سے ایک چھوٹا سا سلیٹی رنگ کا جہاز برآمد ہوا اور مچھر کی طرح بھنبھناتا ہوا مدرسے کے اوپر سے تیزی سے گزر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جہاز واپس مڑا اور دوبارہ مدرسے کی طرف آنے لگا۔ خطبہ سننے کے لیے التحیات میں بیٹھے لوگوں میں یوں ہڑبونگ پھیل گئی جیسے کسی نے بھرے مجمعے کے بیچوں بیچ سانپ چھوڑ دیا ہو۔ جس کا جدھر منہ اٹھا، وہ ادھر کو دوسروں کو دھکے دیتا، گرتا پڑتا، ننگے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا۔ سیکنڈوں کے اندر اندر صحن نمازیوں سے خالی ہو گیا۔ شفیق بھی اٹھا اور برآمدے میں ایک ستون کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران وہ جہاز مدرسے کے اوپر سے گزرا اور دور مغرب میں پہاڑیوں کے پیچھے گم ہو گیا۔

بعد میں اسے بتایا گیا کہ یہ امریکی ڈرون تھا جس کے اندر کوئی پائلٹ نہیں ہوتا، یہ ریموٹ کنٹرول سے چلتا ہے اور میزائل مار کر تباہی پھیلا دیتا ہے۔ لیکن جو بات شفیق کئی دن تک اپنے ذہن سے مٹا نہیں سکا وہ یہ تھی کہ اس تمام ہنگامے کے دوران خطیب صیب نہ صرف بدستور

Scanned with CamScanner

منبر پر جمے رہے بلکہ ان کی تقریر بھی جاری رہی۔ کچھ دیر کے بعد مدرسے کے طلبہ اور اساتذہ کونوں کھدروں سے نکل نکل کر صحن میں بچھی دریوں پر دوبارہ آ آ کر بیٹھنا شروع ہوئے۔ اس سارے عرصے کے دوران خطیب صیب کی بھاری آواز لاؤڈ سپیکر کے ذریعے ویران مسجد و مدرسے کے در و دیوار میں بدستور اس طرح گونجتی رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

پاؤ جان جانوروں کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ قطار کے آخر میں اسے وہ دونوں نظر آ گئے۔ زمین پر شاہانہ تمکنت سے بیٹھے ہوئے، جیسے کوئی راجہ مہاراجہ تخت پر براجمان ہو۔ دائیں طرف والے بیل کا رنگ چمک دار سیاہ تھا۔ بھاری بھرکم جثہ جیسے خالص سیسے کا بنا ہوا، نس نس سے زندگی کی مستی ٹپکتی ہوئی۔ اس کی چکنی جلد پر چاند کی کرنیں پھسل رہی تھیں۔ دوسرا ہلکے سے رنگ کا تھا، اور اس وقت بظاہر گہری نیند میں گم تھا۔ پاؤ جان نے سیاہ بیل کی گردن اور کندھوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کیے۔ بیل نے گردن گھما کر دیکھا اور پھر بیزاری سے سر دوسری طرف موڑ دیا، جیسے کہہ رہا ہو 'یار، جو کام ہے اس کے لیے کل صبح آ جانا، کم از کم رات کے اس پہر تو تھوڑا سکھ کا سانس لینے دو۔' پاؤ جان نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی رسی کھولی اور اسے بیل کی نکیل میں ڈال دیا۔ بیل نے ناگواری سے سر ہلایا لیکن پاؤ جان اس کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنی کندھے پر پڑے تھیلے میں سے سبز چکنی گھاس کا ایک دستہ نکالا اور بیل کو کھلانے لگا۔ یہ گھاس وہ شاہ عالم سے آتے ہوئے ایک چشمے کے دامن سے کاٹ کا ساتھ لایا تھا۔ بیل نہ جانے کب سے خشک پیال کھا کھا کر تنگ آیا ہوا تھا، اب جب ملائم اور لچکیلی چوڑے پتوں والی نم گھاس اس کی زبان سے ٹکرائی تو کنوتیاں تتلی کے پروں کی طرح پھڑ پھڑا اٹھیں، اور پوری دلچسپی سے پاؤ جان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پاؤ جان اس دوران بیل کی گردن سہلاتا رہا۔ اس نے بیل کی گردن پر تھپکی دے کر نکیل تھوڑی سی کھینچی تو بیل گھاس کھاتے کھاتے اگلے گھٹنے سکیڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر نیاز بین نے بھورے بیل کو قابو میں کر لیا تھا۔ پاؤ جان نے بیل کو گھاس کا ایک اور دستہ چکھایا اور اس کی رسی پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ابراہیم دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ پاؤ جان اور یار محمد اپنے اپنے بیلوں کو پچکارتے، ان کی ہمت بندھاتے ہوئے شاہ عالم کی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

Scanned with CamScanner

اس واقعے کے پانچ دن بعد دانہ کی فوجی چھاؤنی کے ایک پہرے دار کو صدر دروازے کے قریب ایک لفافے میں بند گمنام دستی خط ملا۔ اس کا مضمون یہ تھا۔

عالی جناب شہنشاہ جارج ہشتم، والیِ ہندوسندھ، والیِ برطانیہ، والیِ ولایت اور پتہ نہیں والیِ کیا کیا۔

حضورِ معظم کا اقبال بلند رہے اور ان کی سلطنتِ عظمیٰ پر سورج تو کیا، چاند اور ستارے بھی کبھی نہ غروب ہوں۔

امابعد عرض ہے کہ آپ کا گراں قدر تحفہ وصول پایا۔ یہ ہم سب قبائل کی خوش بختی ہے کہ حضور شہنشاہ ہماری فلاح کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ ہماری خاطر آپ نے برطانیہ سے دو انتہائی مہنگے اور انتہائی خاندانی بیل بھیجے جن کا شجرۂ مبارک حضورِ معظم کی طرح نجیب الطرفین اور قدیم ہے۔

چند روز پہلے ہم آپ کو دردِ سر سے بچانے کے لیے خود ہی رات کو آ کر اپنی امانت لے گئے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ آپ نے یہ بیل صحرا زدہ ویرانے میں رہنے والے قبائل کی بھلائی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس لیے بھیجے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ان سے یہاں کی مقامی گائیوں کو بارآور کیا جائے جس سے گائیوں کی ایک ایسی نسل پیدا ہو جو دو سیر کی بجائے دس سیر دودھ دے سکے، اور پورے علاقے میں دودھ کی نہریں جاری ہو جائیں جن کی موجوں سے یہ بے آب و گیاہ دشت سیراب ہو کر لہلہاتی ہوئی جنت کا نمونہ بن جائے، اور اس کے ممنون اور شکر گزار باشندے دن رات آپ کے اقبال کا کلمہ پڑھتے رہیں۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم اس ولایتی شاہی تحفے کا کما حقہ خیال رکھنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ یہ جتنے دن بھی ہمارے پاس رہے، ہم نے اپنی توفیق اور استطاعت کے مطابق ہرگز کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔ انھیں عمدہ سرسبز چارا کھلایا جاتا رہا، وقت پر پانی دیا جاتا رہا، ایک لڑکا صبح شام ان کی مالش کیا کرتا تھا جس سے ان کے بدن سرکار کے بنگلوں

میں لگے سنگِ مرمر کی طرح چمکنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ انھیں کسی عام قصائی کے چھرے سے نہیں، بلکہ خالص سیاہ اصفہانی فولاد کے خنجر سے تمام تر عزت و تکریم سے ذبح کیا گیا۔ اس موقعے پر قبیلے کا بچہ بچہ موجود تھا۔ اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ ہر فرد نے ان بیلوں کے قیمتی اور خاندانی گوشت کے لذیذ تکے بہت احترام اور رغبت سے کھائے۔

دراصل ہم اجڈ قبائلیوں میں اتنا صبر کہاں کہ درخت لگا کر سالہا سال اس کا پھل پکنے کا انتظار کر سکیں۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ کیوں نہ گھر آئی ہوئی نعمت کا فوری فائدہ اٹھا لیا جائے۔ امید ہے آپ بھی ہماری اس سوچ سے پورا پورا اتفاق کریں گے۔

ہم ٹھہرے جاہل، گنوار جانگلی قبائل، اس لیے یہ لاہور کچہری کے ایک منشی سے لکھوا رہے ہیں جو اتفاق سے ہمارے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اگر کوئی غلطی ہو تو درگزر فرمائیے گا اور ہمارے لائق کوئی اور خدمت ہو تو اپنی اطاعت گزار اور فرمانبردار رعایا کو بتانے سے ذرا بھر نہ ہچکچائیے گا۔

آپ کی مخلص اور وفادار رعایا۔

Scanned with CamScanner

خطیب صیب نے شفیق کو سینری میں پرندے اور جانور پینٹ کرنے کی اجازت دے دی تھی: 'صرف آدمی مت بنانا، ورنہ قیامت میں جواب دینا پڑے گا، باقی جو دل میں آئے بناؤ' انھوں نے کہا تھا۔

شفیق کو خود اندازہ تھا کہ بغیر جانوروں اور پرندوں کے یہ تمام سینری ایسے ہی لگتی ہے جیسے بڑا عمدہ قورمہ پکا ہو لیکن باورچی اس میں نمک ڈالنا بھول گیا ہو۔ اس نے جھیل میں منتخب مقامات پر ہنسوں کے جوڑے اور وسیع و عریض آسمان پر کونجوں کے پرے اڑتے دکھائے، بلکہ درختوں میں ہرنوں کی ٹکلیں کرتی ڈار بھی بنا دی تھی، جس سے تمام منظر میں گویا چہک اٹھا تھا۔ ٹرکوں کی سائیڈوں پر شفیق کو اکثر اوقات مرغِ زریں، تیتر اور چکور بنانے کی فرمائش ملتی تھی، اس نے مناسب مقامات دیکھ کر وہ بھی بنا دیے۔ پھر اسے خیال آیا کہ بعض ڈرائیور اونچی گھاس کی پتیوں میں آدھا چھپا، دبکتی ہوئی آنکھوں والا دھاری دار شیر بنانے کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ اس نے گھاس کے میدان کے ایک طرف جھاڑی کے اندر شیر بنانے کا سوچا، لیکن پھر خود ہی اس خیال کو مسترد کر دیا کہ اس ماحول میں شیر جچے گا نہیں۔ ویسے بھی اس نے کبھی کسی مولوی سے جنت کے اندر شیر چیتوں کی موجودگی کا کوئی تذکرہ نہیں سنا تھا۔

اس تمام عمل کے دوران فتح خان بے حد ہونہار شاگرد ثابت ہوا۔ اب شفیق کسی جھاڑی، کیاری، یا پرندے کا صرف خاکہ بنا کر سینری کے کسی دوسرے حصے میں مشغول ہو جاتا تھا اور فتح مہارت سے تصویر مکمل کر دیتا تھا۔ شفیق کو بعد میں صرف معمولی نوک پلک درست کرنا پڑتی تھی۔ بعض جگہوں پر اس نے بڑے مناسب مشورے بھی دیے، جنھیں شفیق نے بھی خوش دلی سے قبول کر لیا۔ شفیق نے اسے ملاخوکش کے معاملے پر مزید کریدنے کی بڑی کوشش کی، لیکن لکنت یا

پھر خوف کے مارے اس نے اس بارے میں مزید کچھ نہیں بتایا۔

البتہ شفیق کو بعد موقع مل گیا کہ وہ خود خطیب صیب کو کرید سکے۔

مسجد کے صحن کے اوپر سے ڈرون کی پرواز کے بعد خطیب صیب کچھ دن کے لیے غائب ہو گئے تھے۔ تاہم ایک بڑے ہال کا دروازہ کھلا اور خطیب صیب داخل ہو گئے۔ علیک سلیک کے بعد وہ حسب معمول سامنے والی دیوار کے ساتھ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے شفیق کو کام کرتے ہوئے دیکھنے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ شفیق نے جی کڑا کر کے ان سے ڈرون کے بارے میں سوال کر ڈالا۔ 'خطیب صیب، یہ جہاز آیا تھا، وہ یہاں کیا کر رہا تھا، یہ تو مدرسہ ہے؟'

شفیق نے خطیب صیب کو مسکراتے تک نہیں دیکھا تھا، لیکن اس کے سوال پر وہ اس قدر ہنسے کہ ان کے دانت نمایاں ہو گئے۔ 'شفیق خانا، تم بہت سادہ بندہ ہے۔ تمھیں خبر ہے کہ کتنے زمانے سے کفر اور اسلام کے درمیان جنگ ہو رہا ہے؟ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی کفر کی دنیاوی طاقت بہت زیادہ ہے، لیکن مجاہدین کا قوتِ ایمانی اور فدائین کا سرفروشی سے دنیا کا سب سے طاقتور ملک اتنا گھبراتا ہے کہ کبھی سامنے آ کر وار نہیں کرتا، زنخوں کی طرح چھپ کر مکاری سے بم پھینک کر بھاگ جاتا ہے۔'

شفیق کو احساس ہوا کہ خطیب صیب نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس نے سوال دہرانا چاہا، لیکن مناسب نہیں معلوم ہوا، اس لیے خاموش رہا۔ خطیب صیب کی بات جاری رہی۔ 'دشمن کے پاس دولت ہے، ایک سے بڑھ کر ایک خطرناک اسلحہ ہے، ٹکنالوجی ہے، سارا دنیا کی حمایت ہے، لیکن ہمارے پاس وہ ہتھیار ہے جس نے بزدل دشمن کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ اس ہتھیار کو استعمال کر کے ہم جب چاہیں، جہاں چاہیں دشمن کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی بے بسی سے سب کچھ دیکھتا ہے لیکن کچھ کر نہیں سکتا۔'

شفیق اس وقت باریک قلم سے ایک مور کے پروں میں جامنی رنگ بھر رہا تھا لیکن

Scanned with CamScanner

خطیب صیب کے احترام میں وہ قلم ہاتھ میں لیے ان کی طرف نیم رخ کیے کھڑا رہا۔

'شفیق خانا، تمھیں معلوم ہے کہ میں تمھاری کیوں قدر کرتا ہوں؟ اس لیے کہ تم خانہ خراب دشمن کے ساتھ لڑنے میں ہماری مدد کر رہے ہو۔ تمھاری مدد سے ہم وہ ہتھیار بنائیں گے کہ دشمن کو ہمارا سرزمین سے نکل کر بھاگنے کا راستہ نہیں مل سکے گا۔'

'میری مدد سے؟' شفیق مور کو بھول کر خطیب صیب کی طرف مڑ گیا۔ 'لیکن میں تو ایک معمولی رنگساز ہوں۔ میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟'

خطیب صیب دوسری بار مسکرائے۔ 'معمولی رنگساز؟ تمھیں خود اپنی قدر معلوم نہیں ہے۔ تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تم اپنے دین کی کتنی خدمت کر رہے ہو، بس جلدی جلدی یہ دیوار ختم کرو، پھر تمھیں ایک اور جگہ لے کر جانا ہے۔' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ دروازے سے نکلتے نکلتے انھوں نے کہا، 'اور ہاں، میں آج شام کو ہی تمھارے گھر خرچہ بھجوا دوں گا۔ ادھر سے بالکل بے غم ہو جاؤ۔'

مدرسہ جس گاؤں میں واقع تھا اس کا نام بانڈہ میرا تھا۔ شفیق کے اندازے کے مطابق اس میں گھروں کی تعداد پچیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس طرح گاؤں کی آبادی مدرسے کی آبادی سے کم بنتی تھی۔ گاؤں والوں نے گاؤں کے آگے اور دائیں طرف پتھریلی زمین کے سینے سے چند کھیت تراش لیے تھے، اس کے علاوہ پانی کی کمی کی وجہ سے باقی تمام علاقہ بنجر تھا۔ گاؤں کے شروع میں ایک ہٹی تھی جس میں ضرورت کی ہر چیز ملتی تھی، چینی، چائے، آٹا، دالیں، بسکٹ، ٹافیاں، نسوار، اور سب سے بڑھ کر سگریٹ۔

شفیق عادی سگریٹ نوش نہیں تھا لیکن کبھی کبھی اس کا دل ایک آدھ کش لگانے کو کرتا

تھا۔ یہاں کسی نے منع نہیں کیا تھا لیکن اس نے خود ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ مدرسے کے اندر سگریٹ پینا معیوب سمجھا جائے گا۔ کبھی کبھی وہ کام کے دوران وقفہ کر کے درخت کے نیچے قائم کھوکھے میں جا کر ریڈ اینڈ وائٹ کا ایک سگریٹ سلگا لیتا تھا جس کا اس قدر سرور طاری ہوتا تھا کہ آسمان جھومنے لگتا تھا۔

اس دوران شفیق کی شیو نے بڑھ کر داڑھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مدرسے میں تو اسے کہیں آئینہ نظر نہیں آیا لیکن کھوکھے میں اس نے نسوار کی ڈبی کی پشت پر لگے آئینے میں خود کو دیکھا تو چونک پڑا۔ اس کی داڑھی مکمل نہیں تو بڑی حد تک سفید تھی۔ اسے اپنی شکل دیکھ کر اپنے والد صاحب کی یاد آ گئی جو بالکل اسی کی طرح تھے۔ وہی نوکیلی ٹھوڑی، انھی کی طرح اندر کو دھنسی آنکھیں اور اب انھی جیسی کھچڑی داڑھی۔ اس نے جلدی سے ڈبیا الٹ کے دکاندار کے حوالے کر دی۔

بوڑھا دکاندار مہمان سمجھ کر شفیق کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ پہلے چند دن تک تو وہ مہمان داری کی خاطر شفیق سے پیسے لینے ہی میں تکلف کرتا رہا۔ شفیق کی جیب میں موجود پیسے چند دن کے اندر اندر ختم ہو گئے تھے اس کے بعد خطیب صیب کے دیے ہوئے انعام کے پیسے کام آنے لگے۔

اسی بوڑھے نے شفیق کو بتایا تھا کہ گاؤں کے تقریباً ہر گھر کا کم از کم ایک فرد پاکستان کے کسی شہر میں یا پھر ملک سے باہر کہیں نوکر ہے اور گاؤں کی تمام تر معیشت انھی پردیسیوں کے بھیجے ہوئے پیسے پر کھڑی ہے۔

مدرسے کے بالکل پیچھے چند سو فٹ اونچی پہاڑی تھی۔ شفیق ایک دن انگلیوں میں سگریٹ لیے لیے چہل قدمی کرتا ہوا اس پہاڑی پر چڑھ گیا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی، اونچے نیچے پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن پر جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جنوب کی طرف کہیں کہیں وہ کچی سڑک نظر آتی تھی اور پھر کسی ٹیلے کے پیچھے غائب ہو جاتی تھی جس پر شفیق کو لایا گیا تھا۔ گاؤں اور سڑک کے علاوہ تمام علاقے میں کہیں انسانی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔

Scanned with CamScanner

شفیق پہاڑی کے پیچھے ٹیلے پر بڑے درخت تک جانا چاہتا تھا، لیکن اس نے دیکھا کہ دور مدرسے کے پیچھے دو لڑکے بظاہر آپس میں باتیں کر رہے ہیں لیکن بار بار مڑ کر اس کی طرف دیکھ لیتے ہیں۔

وہ وہیں سے واپس ہو لیا۔

رکن الدین طویل غفلت کے بعد ہوش میں آئے تو لڑکی کا چہرہ اپنے بالکل اوپر دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ لڑکی کا چہرہ جیسے ملائی میں تھوڑا سا شہد ملا کر تخلیق کیا گیا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ نرم ہوا میں اس کے مرمریں بدن پر ہوا ہی کی طرح ملائم ہلکے نیلے رنگ کا لبادہ سرسرا رہا تھا۔ رکن الدین اس کے ساتھ ایک لمبے سنگی تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ یک لخت اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے بدن پر رات والے پھٹے پرانے کپڑوں کی بجائے بادلوں کی مانند سفید خلعت نما لباس تھا اور پاؤں میں گھسے ہوئے جوتوں کی بجائے نفیس سنہرے کفش تھے۔

یا حیرت، یہ لباس کہاں سے آیا اور مجھے کس نے پہنایا ہے؟ انھوں نے ادھر ادھر دیکھا۔

یہ کوئی باغ تھا۔ گھاس اس قدر سبز تھی جیسے کسی مصور نے تازہ تازہ اس پر گہرے سبز رنگ کا قلم پھیرا ہو۔ ان کے بالکل پیچھے پھولوں کا تختہ تھا جس میں اتنے رنگوں کے پھول کھلے تھے کہ انھیں گننا محال تھا۔ گھاس کے قطعے کے آخر میں سرسبز جھاڑیاں تھیں، جنھیں دو موروں کی شکل میں تراشا گیا تھا۔ مور کے پھیلے ہوئے پروں میں بڑی نفاست سے قوسِ قزح کے رنگوں کے پھول کھلے تھے۔ ان جھاڑیوں کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی آبشار کا دودھیا دھارا ایک مترنم رل ترل کے ساتھ ندی میں گر رہا تھا جو ایک ادا سے لہرا کر درختوں کے کنج کے پیچھے غائب ہو گئی تھی۔ سفید پتھروں کی ایک روش گھاس کے قطعے کے ایک طرف سے ہو کر آبشار تک گئی تھی اور پھر وہاں سے ندی کے ساتھ ساتھ دور تک چلی گئی تھی۔ جھاڑیوں، درختوں اور گھاس پر پیلے، لال، ہرے، نیلے رنگوں کی چڑیاں ادھر ادھر پھدک رہی تھیں، اور کبھی کبھی ان کے قریب بھی آ جاتی تھیں۔ ظاہر تھا کہ

Scanned with CamScanner

انھیں انسانوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ ان کی پرمسرت چہکار کانوں کو لبھا رہی تھی۔ دور کہیں سے بانسری کی مدھر تان آبشار کی متواتر صدا میں گھل کر کانوں میں رس ٹپکا رہی تھی۔ فضا چنبیلی، گلاب اور موتیے کی خوشبو سے معطر تھی۔

رنگ و صوت و خوشبو کی اس پے بہ پے یلغار سے رکن الدین کا سر اس قدر چکرا گیا کہ انھیں گھاس کے قطعے پر بیٹھنا پڑا اور نہ وہ کٹے درخت کی طرح تیورا کر گر پڑتے۔ میں ہوش میں ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں؟ زندہ ہوں یا مر گیا ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے، کون سا ملک ہے؟ یہ لڑکی کون ہے؟ ایسے ہی سوالات نے ان پر ہلہ بول رکھا تھا۔

اس لڑکی نے ملکوتی آواز میں ان سے کہا، 'رکن الدین، گھبراؤ نہیں، تم جنت میں ہو۔ یہاں صرف امن، سکون اور چین کا سکہ چلتا ہے۔ سب فکریں، پریشانیاں بھلا دو۔'

رکن الدین نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ان کی بڑی بڑی روشن آنکھیں دو قمقموں کی طرح جگمگا رہی تھیں جن میں شوخی اور ناز کی لہریں موج زن تھیں۔

'جنت؟ کیا میں مر گیا ہوں؟ کب؟ کیسے؟ مجھے تو پتہ نہیں چلا؟'

لڑکی ہنسی تو اس کی آواز ایک پل کو آبشار کے جلترنگ سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اس نے اپنے دودھیا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا: 'توبہ، اتنے سوال ایک ساتھ! نہیں، تم ابھی زندہ ہو۔'

'لیکن زندہ لوگ تو جنت میں نہیں جا سکتے؟'

'جا سکتے ہیں بھئی، کیوں نہیں جا سکتے؟ میں نے کہا نا، میں سب سمجھا دوں گی، ادھر آؤ، بیٹھو میرے پاس،' لڑکی نے کہا۔

رکن الدین دوبارہ سنگی تخت پر بیٹھ گئے، انھوں نے لڑکی سے تھوڑا فاصلہ رکھا تھا لیکن وہ سرک کر پھر ان کے قریب آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بلوریں جام تھا جس میں سنہرے رنگ کا کوئی مشروب ہلکورے لے رہا تھا۔ 'یہ لو، اسے پیو۔ اس سے تمھارے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون ملے گا، تم اتنا لمبا سفر کر کے یہاں پہنچے ہو۔'

رکن الدین نے جام تھامنے کی کوشش کی لیکن لڑکی نے جام اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا اور رکن الدین کے منہ کے قریب لے آئی۔ کہیں یہ شراب تو نہیں؟ رکن الدین نے سوچا۔ لیکن اگر شراب ہے بھی تو سنا ہے کہ جنت میں شراب حلال ہے۔

انھوں نے جام ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کا ذائقہ کسی ایسے میٹھے پھل کی طرح تھا جو ابھی رکن الدین نے نہیں چکھا تھا۔ ایک گھونٹ لیا تو وہ ان کے رگ و پے میں نرم تپش لیے اترتا چلا گیا۔ انھوں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائی تو اس کے سفید دانت دمک اٹھے۔ اتنے میں جھاڑیوں کے پیچھے سے سفید موروں کا ایک جوڑا آیا اور انکھیلیاں کرتا ہوا ان کے آگے سے گزر کر ندی کی طرف چلا گیا۔

'اچھا اب تو بتا دو، مجھے یہاں کون لایا ہے اور تم کون ہو؟ اب یہ نہ کہنا کہ تم جنت کی حور ہو۔'

لڑکی مسکرا دی۔ اس کے ہونٹ تربوز کی قاش کی طرح لال تھے۔ 'کیوں، میں حور نہیں ہو سکتی؟ کیا کمی ہے مجھ میں؟'

'نہیں، کمی تو کوئی نہیں، دراصل میں نے سنا تھا کہ حوروں کی پنڈلیوں کے اندر کا گودا ستر پردوں سے نظر آتا ہے۔'

اب کے لڑکی اس قدر زور سے ہنسی کہ اس کے گلے میں پڑا ہوا یاقوت کا ہار لرز کر رہ گیا۔ دور ندی کے کنارے اپنی مادہ کے پہلو بہ پہلو چہل قدمی کرتا مور ٹھٹک کر ایک لحظے کو رکا، پھر چل پڑا۔

لڑکی نے خالی جام تخت پر رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ 'ارے، باتوں باتوں میں خیال ہی نہیں آیا کہ تمھیں کتنی بھوک لگی ہو گی۔ چلو، چل کر کچھ کھا لو۔'

رکن الدین اٹھ کھڑے ہوئے تو اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور ان کے کندھے پر سر رکھ کر آبشار کی طرف چل پڑی۔

Scanned with CamScanner

چھوٹے چھوٹے سفید پتھروں کی روش پر چلتے ہوئے وہ آبشار کے دوسری طرف جا پہنچے۔ وہاں ایک ایسے نظارے نے رکن الدین کا استقبال کیا کہ وہ ٹھٹک کر وہیں رک گئے۔ ان کے سامنے ایک سیاہ رنگ کا محل تھا لیکن وہ اینٹوں یا پتھر سے تعمیر نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے پہاڑ کے پہلو میں سنگِ خارہ کی ایک کوہ پیکر سالم چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہو۔ بے عیب سیاہ پتھر سے کاٹے گئے درجنوں اونچے نیچے مینار اور کئی چھوٹے بڑے گنبدیوں چمچمار ہے تھے جیسے انھیں ابھی ابھی آب دی گئی ہو۔ قلعے کا سب سے بڑا گنبد کم از کم بیس گز اونچا ہوگا۔ اس کے کلس کے گرد سونے کے کنول کی نازک پتیاں جاتے سورج کی سنہری روشنی کو مزید سنہرا بنا کر منعکس کر رہے تھے۔

تو یہ واقعی جنت ہے؟ رکن الدین کا سر مسلسل سوچ سوچ کر چکرا رہا تھا۔ لیکن اگر جنت نہیں تو پھر کون سی جگہ ہے؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ قزاقوں کے ہاتھ چڑھ گیا ہوں جس کا واحد مطلب یہ ہے کہ مجھے بقیہ زندگی کسی تاجر یا زمیندار کا غلام بن کر گزارنا پڑے گی، لیکن میں اس حیرت کدے میں کیسے پہنچ گیا؟ کہیں یہ لڑکی سچ تو نہیں کہہ رہی؟ لیکن اگر یہ حور ہے تو اس کی پنڈلی کا گودا۔۔۔

'عالی جاہ قبلہ رکن الدین صاحب، زیادہ سوچیے مت، آگے بڑھیے، کیا رات یہیں کھڑے کھڑے بتانے کا ارادہ ہے؟' لڑکی نے ٹوکا تو رکن الدین کو ہوش آیا اور وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔

رکن الدین کو حیرت تھی کہ لڑکی کو ان کا نام کیسے معلوم ہوا۔ وہ اس بارے میں اس سے پوچھنا چاہتے تھے لیکن عمارت کے اندر کے منظر نے ان کی قوتِ گویائی سلب کر لی۔

محل کا ہشت پہلو پیش دالان اتنا وسیع اور اس قدر اونچا تھا کہ رکن الدین کو چھت دیکھنے کے لیے ٹھوڑی اوپر اٹھا کر دیکھنا پڑا۔ دالان کی آٹھ دیواروں کے کونے اوپر اٹھتے ہوئے چھت کے وسط میں آپس میں مل گئے تھے، جہاں ان کے نقطۂ اتصال پر ایک بہت بڑا فانوس لٹک رہا تھا جس کے بازوؤں میں کم از کم سو شمعیں روشن تھیں۔ آٹھوں دیواروں میں مختلف شکلوں

اور حجم کے طاقچے اور محرابیں ایک خاص ترتیب سے کھدی تھیں جن میں چھوٹی بڑی مشعلیں، شمعیں، چراغ اور دیے روشنی بکھیر رہے تھے۔ دیواروں پر خاص طور پر محرابوں اور طاقچوں کے کناروں پر کاشی کاری و مینا کاری کی گئی تھی جس میں غالباً قیمتی پتھر جڑے تھے جو تاروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ وسیع و عریض فرش پر ایک ہی قالین بچھا ہوا تھا جو اس قدر دبیز اور نرم تھا کہ رکن الدین نے اس میں اپنے پاؤں دھنستے ہوئے محسوس کیے۔ ایک طرف پتھر ہی میں کھدی سیڑھیاں بل کھاتی ہوئی اوپر جا رہی تھیں۔

'کیوں، یقین آیا، یا اب بھی شک ہے؟' لڑکی نے رکن الدین کو ٹہوکا دیا تو وہ چونکے۔ انھیں لگا جیسے ان کے حواس جلووں کی اس بے محابا کثرت کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں، اس لیے انھیں ہر تھوڑی دیر بعد ٹھہرنا پڑتا تھا کہ وہ یہ منظر اپنے اندر سمو سکیں۔

اس سے پہلے کہ رکن الدین جواب دیتے، ان کے کانوں میں گانے بجانے کی آواز آئی۔ انھوں نے مڑ کر دیکھا تو لڑکیوں کا ایک پرا پیش دالان کی چھت سے برآمد ہونے والی چکردار سنگی سیڑھیوں سے اترتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بربط تھا، دوسری لڑکیوں کے پاس چھوٹے چھوٹے دف تھے جنھیں وہ بجاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ ان کے لمبے ریشمی لبادے پیچھے پیچھے قالین پر گھسٹتے چلے آ رہے تھے۔ لڑکیاں ناچتی گاتی اور ہنستی ہوئی ان دونوں کے قریب آ گئیں۔

'ارے امیرہ خاتون، تم نے ابھی تک اپنے مہمان کو کھانا نہیں کھلایا؟ بے چارہ دل میں کہتا ہوگا کہ جنت کی حوریں بھی کیا مہمان نواز ہیں!' بربط والی شوخ و شنگ لڑکی نے کہا اور ساتوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

کچھ دیر پہلے رکن الدین کے دماغ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس نے پہلے والی لڑکی، جس کا نام اب معلوم ہوا کہ امیرہ خاتون ہے، سے زیادہ حسین لڑکی زندگی بھر نہیں دیکھی، لیکن اب ان لڑکیوں کو دیکھ کر اس کا فیصلہ ڈولنے لگا۔ لڑکیاں اسے اور امیرہ خاتون کو پکڑے پکڑے ایک

Scanned with CamScanner

دروازے سے گزار کے اندر کی طرف لے گئیں۔ یہاں ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس پر چوبی ہتھیوں والا محراب دار پل بنا ہوا تھا۔ ہتھیوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے دونوں طرف درجنوں شمعیں ایستادہ تھیں جن کے عکس نیچے پانی میں جھلملا رہے تھے۔ لڑکیوں کے جلو میں چلتے ہوئے وہ پل سے گزر کے حریری پردوں سے ڈھکے ایک نسبتاً چھوٹے دالان میں آ گئے جہاں ایک بہت بڑی میز پر انواع واقسام کے خوان سجے تھے۔ ان میں سے بھاپ کے لپٹے یوں اٹھ رہے تھے جیسے ابھی ابھی کسی نے انھیں لا کر رکھ دیا ہو۔ کمرے میں اشتہا انگیز بو پھیلی ہوئی تھی۔

رکن الدین کو اچانک سخت بھوک کا احساس ہوا، جیسے انھوں نے ایک ہفتے سے کچھ نہ کھایا ہو۔ امیرہ خاتون نے ایک مرصع کرسی گھسیٹ کر رکن الدین کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کے آگے لمبی میز پر بلوریں طباقوں میں اتنی اقسام کی نعمتیں سجی ہوئی تھی جو انھوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر انتظار کرتے رہے کہ امیرہ خاتون اور دوسری لڑکیاں بھی بیٹھ جائیں مگر وہ کھڑی رہیں اور رکن الدین کی قاب میں طباقوں سے قسما قسم خوراکیں ڈالتی اور اصرار کر کے انھیں کھلاتی رہیں۔ بربط والی لڑکی نے ایک مدھر دھن چھیڑ رکھی تھی جو رکن الدین کو بچپن میں سنے کسی گیت کی یاد دلا رہی تھی تاہم ان کا ذہن اصل گیت پر انگلی رکھنے سے قاصر تھا۔ اور وہ کبھی کبھی جھوم کر رقص کے ایک دو قدم بھی ڈال جاتی تھی اور اس کے بربط کی لے تیز تر ہو جاتی تھی۔ امیرہ خاتون بیچ بیچ میں رکن الدین کو تیز سرخ رنگ کا مشروب بھی پلاتی جاتی تھی۔

کھانا ختم ہونے کے بعد وہ رکن الدین کو سیڑھیوں سے اوپر خواب گاہ میں لے گئیں جہاں صرف تین دیواریں تھیں اور ایک طرف خالی تھا۔ باقی لڑکیاں باہر ہی رہ گئیں، صرف امیرہ خاتون ان کے ساتھ حجلے میں داخل ہوئی۔ خواب گاہ کے فرش پر جگہ جگہ ریشمی تکیے اور خوش کن سوزن کاری سے سجی ہوئی رنگین گدیاں سلیقے سے رکھی تھیں۔ چھت سے سرخ اور گلابی رنگ کے مہین پردے کسی آبشار کی طرح لہراتے ہوئے نیچے آ کر ایک اونچے جڑاؤ چھپر کھٹ کے ساتھ مدغم ہو رہے تھے۔ دیواروں پر طاقچوں میں دیے تو روشن تھے ہی، ساتھ ہی بڑی بڑی تصاویر بھی

آویزاں تھیں جن پر شاید کسی پرستان کے مناظر دکھائی گئے تھے۔ رکن الدین نے باہر کی طرف دیکھا تو ان پر انکشاف ہوا کہ خواب گاہ کی ایک سمت خالی نہیں چھوڑ دی گئی بلکہ وہاں کی پوری دیوار ہی بے حد شفاف شیشے کی بنی ہے، جہاں سے دور تک کا نظارہ دکھائی دے رہا تھا۔ اب اندھیرا پھیل رہا تھا لیکن انھوں نے دیکھا کہ آبشار والے جس سبزہ زار میں ان کی آنکھ کھلی تھی، وہاں اور ندی کے آس پاس مشعلیں روشن ہو گئی ہیں۔ انھیں سبزہ زار کی مغربی سمت درختوں کے پیچھے کسی اور عمارت کے میناروں اور گنبدوں کا اوپری حصہ نظر آیا، جس کا نقشہ اس محل سے ملتا جلتا تھا البتہ اسے سیاہ کی بجائے کسی قسم کے سرخی مائل پتھر سے تراشا گیا تھا۔

'کیا اس محل بھی میری طرح کا کوئی مہمان۔۔۔' انھوں نے مڑ کر امیرہ خاتون سے سوال کرنا چاہا لیکن ایک بار پھر الفاظ ان کے منہ ہی میں رہ گئے۔ وہ اپنا نیلا لبادہ اتار کر ارغوانی رنگ کی نیم شفاف پشواز پہن چکی تھی جس کے اندر سے اس کا شہوت انگیز بدن یوں جھلک رہا تھا جیسے سمرقند اور بخارا میں بکنے والی موی کاغذ کی بنی چینی لالٹینوں میں سے شمع کی لو۔ باہر سے شوخ لڑکی کے بربط کے لے اور تیز ہو گئی۔ امیرہ خاتون ہکا بکا رکن الدین کو ہاتھ سے پکڑ کر چھپر کھٹ پر لے گئی۔

Scanned with CamScanner

46

'سب سے پہلے تو یہ جان لو کہ حور کہتے کسے ہیں، اس کے بعد جنت کا مزید احوال بیان کیا جائے گا۔'

فتح خان مدرسے کے بڑے ہال میں فرش پر بچھی سرد چٹائی پر بیٹھا تھا۔ ہال لڑکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ خطیب صیب منبر پر بیٹھے ہوئے تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے سفید جبہ پہن رکھا تھا اور ان کے سر پر بھی سفید ہی پگڑی تھی۔ وہ کئی دنوں کے بعد کل رات مدرسے میں آئے تھے، اور انھوں نے عصر کی نماز کے بعد لڑکوں کو بلا لیا تھا۔

'لڑکو، جنت کی تمنا ہر مسلمان کے دل میں ہونی چاہیے۔ جنت ہر مومن کی آخری منزل، ہر دکھ کا حتمی مداوا اور ہر غم کا شافی و کافی علاج ہے۔ جنت ہر مومن کے لیے خداوند تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑا تحفہ ہے، سب سے خاص انعام ہے۔ جنت کا مطلب ہے باغ، اور اس باغ کا سب سے میٹھا پھل کیا ہے؟ بولو جنت کا سب سے میٹھا پھل کیا ہے؟' خطیب صیب نے اپنا سوال دہرایا اور پھر خود ہی جواب دیا۔ 'وہ ہے حور! حور جنت کا سب سے شیریں پھل ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ حور ہے کیا۔ آج میں تمھیں بتاتا ہوں۔ سب سے پہلے تو جان لو کہ حور کا قد کیا ہو گا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ حور کی پلکوں کی لمبائی گدھ کے پروں کے برابر ہوگی۔ اسی سے قد کا اندازہ لگا لو۔'

فتح خان یہ بات سن کر چونک گیا۔ اس نے ایک بار نیزہ نرئی کے قریب جنگل میں بہت سے گدھ دیکھے تھے۔ دور سے تو وہ سمجھا تھا کہ شاید بندر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن جب ان میں سے ایک نے اڑان بھری تب پتہ چلا کہ وہ گدھ تھے۔ وہ کسی جہاز کی طرح نیچے وادی میں پر ہلائے بغیر اڑتا چلا گیا، اس کا ایک پر اتنا لمبا تھا کہ اگر فتح خان اپنے دونوں بازو پھیلا لیتا تب بھی اس کے

ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہ پہنچ پاتا۔ تو یہ خطیب صیب کیا کہہ رہے ہیں؟

'ہاں بھئی، گدھ کے پروں کے برابر پلکیں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ اتنی لمبی پلکیں کیسے ہو سکتی ہیں، وہ تو اس کے قدموں تک لٹک جائیں گی۔ نہیں بھئی، ایسا نہیں ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ حور کا قد اس دنیا کی عام عورت کی طرح پانچ ساڑھے پانچ فٹ نہیں بلکہ علما نے حساب لگایا ہے کہ 127 فٹ ہو گا۔ کتنا؟'

لڑکوں نے دہرایا: '127 فٹ۔'

'اس قد کی حور پر تو گدھ کے پروں کی لمبائی کی پلکیں ہی جچیں گی، ہے کہ نہیں؟'

درجنوں گردنیں ایک ساتھ اثبات میں ہلیں۔

'لیکن ایک مسئلہ ہے بھئی۔ اگر حور 127 فٹ کی ہے تو پھر مومن کا کیا بنے گا؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے نصیب گل بھائی پریشان ہو گئے ہیں۔ اگر حور 127 فٹ کی ہے تو وہ تو انھیں اٹھا کر جیب میں ڈال لے گی۔ پھر ان کا کیا بنے گا؟'

تمام لڑکے نصیب گل کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔ وہ بھی ہال کے ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے مسکرا رہا تھا۔

'نصیب گل بھائی، پریشان نہ ہوں۔ خدا تعالیٰ جنت میں آپ کو بھی 127 فٹ کا بنا دے گا، یعنی بالکل حور کے قد کا۔

'اب ایک اور مسئلہ ہے۔ دنیا میں اس قد والی بیوی ہو تو وہ مرد کی آمدنی کا کباڑا کر دے گی۔ وہ کیسے بھئی؟' خطیب صیب نے رک کر ہال میں بیٹھے لڑکوں پر ادھر سے ادھر نظر دوڑائی۔ وہاں خاموشی چھائی تھی۔

'بھئی، مرد کی ساری آمدن تو اس کے کپڑے پورے کرنے میں لگ جائے گی۔ اگر پانچ فٹ کی عورت کے سوٹ پر تین گز کپڑا لگتا ہے تو 127 فٹ کی عورت پر کتنا کپڑا لگے گا؟ لیکن جنت میں یہ مسئلہ نہیں ہو گا۔ حور کے کپڑے جنت کے درزیوں کے ہاں سے اس کے ناپ کے

Scanned with CamScanner

مطابق سل کر آئیں گے۔ یہ درزی کون ہوں گے؟ فرشتے، جو خداوند نے اسی کام پر مامور کر رکھے ہیں۔ یہ ایک حور کے لیے کتنے جوڑے تیار کریں گے؟ کل جوڑوں کا تو مجھے علم نہیں، نہ ہی کتابوں میں اس بارے میں کچھ لکھا ہے، لیکن یہ ضرور لکھا ہے کہ ہر حور نے اپنے بدن پر ایک وقت میں 72 لبادے پہن رکھے ہوں گے۔ اور یہ لبادے سوت یا کپاس کے دھاگوں سے نہیں، بلکہ نور کے ریشوں سے تیار کیے جائیں گے۔'

فتح خان نے کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ خطیب صیب اتنی دلچسپ باتیں کر رہے تھے کہ لڑکے پلکیں جھپکائے بغیر سن رہے تھے۔

'نور کی کرنوں سے تیار کردہ لبادہ۔ ہاں، بھئی، کیسا ہوگا نور کی کرنوں سے بنا ہوا لبادہ؟ نور تو شفاف ہوتا ہے۔ اس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔ ہے کہ نہیں؟ تو بھئی، حور کا بدن اس کے 72 لبادوں کے اندر سے بھی جھلک مارتا ہوا دکھائی دے گا۔ یہی نہیں بلکہ اس کی پنڈلی کا گودا گوشت سے باہر نظر آئے گا۔ یہ ہے مومن کا انعام۔'

فتح خان کا ذہن خطیب صیب کی بیان کردہ تفصیلات کا تصور کیے چلا جا رہا تھا۔ وہ آج کل شفیق استاد کے ساتھ مل کر جنت کے مناظر کی تصویریں بنا رہا تھا، اس لیے وہ خطیب صیب کی باتوں کے ساتھ ہی ساتھ حوروں کو ان سبزہ زاروں، چراگاہوں میں چلتے پھرتے بھی دیکھ رہا تھا۔ تقریر کا بلاوہ آنے سے پہلے وہ ایک جھاڑی پر کام کر رہا تھا جس میں کہیں کہیں سفید اور ہلکے گلابی پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر حوریں ایسی ہی جھاڑیوں کے پیچھے چھپتی، بھاگتی دوڑتی، اٹکھیلیاں کرتی ہوں گی۔ اسے خیال آیا کہ استاد شفیق سے کہہ کر کسی درخت پر حوروں کے جھولنے کے لیے جھولا بنا دے۔ لیکن وہ ہیں کہاں؟ اس نے ادھر ادھر استاد کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ آخر وہ دروازے کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے دکھائی دے گئے۔ کیا پتہ وہ خود یہ تقریر سن کر اس سے سینری کے لیے مختلف خیالات اخذ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں؟

خطیب صیب کہہ رہے تھے: 'جنت کی حور کئی اعتبار سے دنیاوی عورت سے مختلف ہو

گی۔ دنیا کی عورت چاہے کتنی بھی حسین و جمیل کیوں نہ ہو، وہ صرف شادی کی پہلی رات تک باکرہ رہتی ہے، اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شادی شدہ عورت کہلاتی ہے۔ جنت میں ایسا نہیں ہوگا، جنتی جب بھی حور کے پاس جائے گا وہ اسے ہمیشہ باکرہ حالت میں ملے گی۔ یعنی ہر ملاپ کے بعد حور کو دوبارہ کنواری بنا دیا جائے گا۔'

فتح خان کی عمر پندرہ سال ہو چکی تھی اور اس کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ اسے خطیب صیب کی بہت سی باتوں کی پوری طرح سمجھ نہیں آئی لیکن پھر بھی وہ اپنے خون میں ایک پر لطف سی گرمی محسوس کرنے لگا۔ ویسی ہی گرمی جیسے وہ اپنے پڑوس میں رہنے والے دوست فہیم کی بڑی بہن شبانہ کے لیے محسوس کرتا تھا۔ وہ اس سے عمر میں کئی سال بڑی تھی اور اس کی شادی ہونے والی تھی لیکن وہ جب بھی سامنے آتی، فتح خان کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور اس کا تو تلا پن اس قدر بڑھ جاتا کہ وہ منہ سختی سے بند کر لیتا تھا۔ اگر وہ اس سے کوئی بات پوچھتی بھی تو فتح صرف ہوں ہاں یا سر کی جنبش میں جواب دیتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اس کے آس پاس ہی رہے۔

'یہ بات تو تمھیں معلوم ہی ہوگی کہ جنت میں سب سے اعلیٰ مقام کسے نصیب ہوگا؟' خطیب صیب نے سوال کیا لیکن کسی نے جواب نہیں دیا۔ 'بھئی بولو، جنت میں سب سے اعلیٰ درجے پر کون فائز ہوگا؟' انھوں نے سوال دہرایا۔

ایک کونے سے کسی نے کہا: 'شہید۔'

'شاباش،' خطیب صیب نے کہا۔ 'شہید کو جنت میں سب سے اعلیٰ مقام ملے گا، اور مقام کے ساتھ ساتھ اسے دو چار یا آٹھ دس نہیں، بلکہ بہتر حوریں عطا کی جائیں گی۔ یہ حوریں دنیاوی عورتوں کی طرح گندی مندی نہیں ہوں گی، نہ انھیں ہر مہینے خون آئے گا، نہ ان کے بدن سے بدبودار پسینہ بہے گا، نہ کوئی اور آلائش اور گندگی ہوگی۔ بلکہ ان کا پسینہ مسک و زعفران سے زیادہ معطر ہوگا اور اسے سونگھ کر دلوں کو فرحت نصیب ہوگی۔ اور جانتے ہو ان کے حسن و جمال کا کیا عالم

Scanned with CamScanner

ہوگا؟ اگر جنت سے کوئی حور دنیا میں آ کر اپنے چہرے سے گھونگھٹ اٹھا دے تو سورج چاند ایسے بجھ جائیں گے کہ دوبارہ کبھی روشن نہیں ہوں گے۔ ان بہتر میں سے ہر حور دوسری سے زیادہ خوبصورت ہوگی۔ جنتی اپنی خواب گاہ میں ایک حور کے ساتھ مصروف ہوگا، اور جانتے ہو کتنے وقت کے لیے؟ دنیا میں تو مرد کی طاقت دو تین چار منٹ ہوتی ہے، جنت میں ہر مرد کو سو مردوں کی طاقت دی جائے گی اور یہ مخصوص دورانیہ بڑھا کر ایک ہزار سال پر محیط کر دیا جائے گا، سوچو ذرا ہزار سال! تو میں کہہ رہا تھا کہ جنتی اپنی خواب گاہ میں ایک حور کے ساتھ مصروف ہوگا کہ دوسری حور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہے گی، ''اب بس بھی کرو، ایک نظر مجھ پر تو ڈالو۔'' جنتی جب سر اٹھا کر اس حور کو دیکھے گا تو اس کے حسن و جمال کی چکا چوند میں پہلی کو یوں بھول جائے گا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہیں ہے۔

صحن میں کسی نے سبحان اللہ کہا، پھر کئی طرف سے سبحان اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ رفیع نے بھی سوچا کہ وہ بھی دوسروں کی پیروی کرے، لیکن پھر اس نے خود کو اس ارادے سے باز رکھا۔ اس کا ذہن کہیں اور ہی بھٹکنے لگا تھا۔

میری جب آنکھ کھلی تو اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے بعد مجھے یاد آیا کہ میں تو جنت میں ہوں۔ لیکن یہ کیسی جنت ہے؟ میرے نیچے نہ وہ لچکیلا بستر تھا نہ سر کے نیچے امیرہ خاتون کا ملائم زانو۔ اس کی بجائے میں سخت اور کھردرے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ یا خدایا، یہ کیا ماجرا ہے؟ میں اٹھ بیٹھا، 'امیرہ خاتون، امیرہ خاتون، تم کہاں ہو؟' میں نے آواز لگائی، لیکن کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا، کنپٹی کے پاس ایک رگ یوں پھڑک رہی تھی جیسے ابھی پھٹ پڑے گی۔ میں نے ٹٹول ٹٹول کر معلوم کرنے کی کوشش کی کہ میں کہاں ہوں تو میرا ہاتھ ٹھنڈی، پتھریلی دیوار سے جا ٹکرایا۔ تھوڑی ہی دیر بعد قدموں کی آوازیں آئیں، شاید دو آدمیوں کے قدموں کی آواز۔ پھر دروازے کے کواڑ کھلے اور میری آنکھیں شمع کی تیز روشنی سے چندھیا گئیں۔ میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

'رکن الدین، اٹھ جاؤ، تمھیں میرے ساتھ جانا ہوگا۔' میں نے ہاتھوں کا چھجا بنا کر شمع کی روشنی کے پار دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ دو آدمی تھے۔ جس نے مجھے مخاطب کیا تھا اس نے کسی قسم کا سیاہ لبادہ پہن رکھا تھا، البتہ اس کے چہرے کا اوپری حصہ شمع کی تیز روشنی میں مجھے نظر نہیں آیا۔

'مجھے معلوم ہے تمھارے ذہن میں بہت سے سوال گردش کر رہے ہوں گے،' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ لیکن ان سوالوں کے جواب میرے پاس نہیں ہیں، البتہ میں بتا سکتا ہوں کہ تمھیں یہ جواب کہاں سے مل سکتے ہیں۔'

میرے سر کا درد شمع کی روشنی میں اور بڑھ گیا تھا، میں نے ماتھا اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ 'پانی، مجھے تھوڑا پانی مل سکتا ہے؟'

'کیوں نہیں، عظیم، اسے پانی دو،' اس نے اپنے ساتھی سے کہا جس نے شمع تھام رکھی

Scanned with CamScanner

تھی۔ وہ شخص شمع لیے ہوئے اطاق کے ایک کونے میں گیا اور وہاں سے گھڑے سے مٹی کا آب خورہ بھر لایا۔ اس کی کمر کے پٹکے کے ساتھ ایک لمبا خنجر لٹک رہا تھا۔ میں نے غٹا غٹ پانی پی لیا، جس کے دوران کچھ چھینٹے میرے دامن پر بھی گر گئے۔ اب میرے تن پر سفید خلعت کی بجائے وہی پرانا لباس تھا جو جگہ جگہ سے مسک چکا تھا۔

'کوئی مجھے بتائے گا کہ میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟' میں نے کہا۔ 'میں تو اس طرح سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ یہ کھیل کون کھیل رہا ہے؟'

'تمھارے سوالوں کے جواب سیدنا دیں گے، اٹھو تمھیں ان کے پاس جانا ہے۔'

'کون سیدنا؟' میں نے پوچھا۔

'ہمارے شیخ۔'

'کون شیخ اور وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'

'میں نے کہا نا کہ تمھارے سوالوں کے جواب وہی دیں گے۔ میں تو وہی کر رہا ہوں جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے، اور وہ حکم یہ ہے کہ میں تمھیں ان کی خدمت میں پیش کر دوں، اس لیے چلو، وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔'

اٹھنے کی کوشش میں میرے قدم لڑکھڑائے تو اس نے بازو تھام کر مجھے سہارا دیا۔

ہم مشعل کی روشنی میں چلتے ہوئے باہر نکلے اور ایک لمبی، گھومتی ہوئی غلام گردش سے ہو کر ایک نسبتاً بڑے حجرے میں آ گئے۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا لیکن دریچے سے باہر ملگجا اندھیرا پھیلا تھا، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یا تو یہ صبح سویرے کا وقت ہے یا پھر شام گہری ہو رہی ہے۔

'تمھیں یہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا ہوگا۔' میرے ساتھی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں پردے کے پیچھے اوپر کو جاتی ہوئی پتلی اور تنگ سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ 'یہاں سے آگے صرف تمھی جاؤ گے، ہم یہیں تمھارا انتظار کریں گے۔'

میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہ اس قدر تنگ تھیں کہ ان پر ایک وقت میں صرف ایک آدمی ہی چل سکتا تھا۔ سہارے کے لیے ایک طرف لکڑی کی ہتھی لگی ہوئی تھی۔ میرا سر ابھی تک چکرا رہا تھا اس لیے میں نے اسے تھام لیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید مجھے دوسری منزل تک جانا ہوگا، لیکن سیڑھیاں ایک عمودی، تاریک سرنگ کے اندر چڑھتی چلی گئیں۔ میں نے گنی تو نہیں لیکن کم از کم سو سیڑھیاں تو ضرور چڑھی ہوں گی اور میرے گھٹنے جواب دینے لگے تھے کہ آخر ایک دروازہ اور اس کی جھریوں میں سے جھانکتی ہوئی روشنی نظر آئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں دستک دے کر اندر داخل ہو گیا۔ چند لمحے سیڑھیاں چڑھنے کی مشقت سے پھولی ہوئی سانس بحال کرنے میں لگ گئے۔ یہ چھوٹا سا حجرہ تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کی چھت نہیں تھی۔ اوپر اول شب کا آسمان تمام تر آب و تاب کے ساتھ کسی جڑاؤ قبا کی طرح تنا ہوا تھا۔ ایک طرف خاصا بڑا آتش دان جل رہا تھا، جس کی تیز روشنی میں دیواروں پر جگہ جگہ لوہے، پیتل اور تانبے کی بنی ہوئی چیزیں ٹنگی نظر آ رہی تھیں جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے نقشے آویزاں تھے، جن پر عجیب و غریب شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ حجرے کے وسط میں ایک بہت بڑی میز تھی جس پر الم غلم آلے، شیشے کے انوکھی طرز کے برتن، کتابیں اور کاغذ کے ڈھیر بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے۔

میز سے ٹیک لگائے ایک معمر شخص کھڑا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ کے انگوٹھے میں ایک چھوٹی سی زنجیر تھام رکھی تھی جس سے خاصے موٹے تانبے کا تھال لٹک رہا تھا جس پر طرح طرح کی شکلیں، کلیں اور سوئیاں جڑی تھیں۔ وہ اس تھال کو اپنے چہرے کے آگے ایک ہاتھ سے لٹکائے، ایک آنکھ بند کر کے کھلی چھت میں سے تاروں بھرے آسمان کو تک رہا تھا۔ اس نے میری طرف پیٹھ کر رکھی تھی اس لیے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ فقط اتنا نظر آیا کہ اس کے ننگے سر سے سفید بالوں کی ایک آبشار نکل کر اس کے لمبی، سفید تر داڑھی میں تحلیل ہو گئی تھی۔ وہ اپنے کام میں اس قدر محو تھا کہ بظاہر اسے میری آمد کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ میں نے کھنکار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس

Scanned with CamScanner

دلایا۔ اس سے بھی اس کے ساکت بدن میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی تو میں تھوڑی اور زور سے کھانسا۔ 'بیٹھ جاؤ رکن الدین، تم سیڑھیاں چڑھ کر تھک گئے ہو گے،' اس نے آنکھ اپنے پیچیدہ آلے سے ہٹائے بغیر کہا۔

آتش دان کے قریب دو کرسیاں پڑی تھیں، میں ان میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اب میں نے اس بات پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا کہ ان لوگوں کو میرا نام کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔

وہ خاصی دیر کھڑا اپنے اوزار میں مگن رہا۔ یہ اوزار خاصا بھاری دکھائی دیتا تھا، اس لیے اسے اب تک تھک جانا چاہیے تھا، لیکن اس کے بازو میں تھکنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ کبھی کبھی اس آلے کی کوئی کل گھما کر اس کا رخ تھوڑا سا بدل دیتا تھا اور پھر ادھر شست لگا دیتا۔ میں نے بھی سر اٹھا کر اسی سمت میں آسمان کی طرف دیکھا لیکن مجھے تاروں بھرے آسمان کے عام سے منظر کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس علاقے میں تارے بہت منور اور چمکیلے تھے۔ شاید یہ کوئی پہاڑی علاقہ تھا جہاں کسی قسم کی گرد اور مٹی نہیں تھی، جو آسمان کو مکدر کر دیتی۔ لیکن یہ شخص کیا کر رہا ہے؟ کیا یہ کوئی جادوگر ہے جو آسمان پر ستاروں کی چالیں دیکھ کر اپنے جادو ٹونے ترتیب دے رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ ستارے تقدیر کی خبر دیتے ہیں، تو کیا یہ ان ستاروں میں مستقبل کے حالات و واقعات اسی طرح سے دیکھ رہا ہے جیسے ہم کسی اونچی پہاڑی پر چڑھ کر نیچے وادی میں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھتے ہیں؟

آخر اس نے اپنا آلہ احتیاط سے میز پر رکھا اور میری طرف مڑا۔ 'ہاں تو رکن الدین، کیسے ہو تم؟'

اس نے سر کے وسط میں سے مانگ نکالی تھی، جس کے دونوں طرف سے بال نکل کے اس کے کندھوں تک آ رہے تھے۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں دور تک دیکھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں، جیسے وہ اپنے قریب نہیں بلکہ دور کہیں کسی ستارے پر نظر جمائے ہوئے ہے۔ اس کے چہرے پر جھریاں تھیں لیکن رنگ سرخی مائل اور زندگی سے بھرپور تھا۔ اس کی تقریباً ہر انگلی پر ایک

ایک انگوٹھی تھی جن میں رنگ برنگے موٹے موٹے پتھر جڑے ہوئے تھے۔

'میں ٹھیک ہوں،' میں نے کہا۔ 'لیکن کچھ باتوں کی سمجھ۔۔۔ میرا مطلب ہے نیچے انھوں نے کہا تھا کہ آپ سوالوں کے جواب۔۔۔'

'ہاں، سوالوں کے جواب۔ ملیں گے تمھیں سوالوں کے جواب، کیوں نہیں ملیں گے۔' وہ بایاں ہاتھ ہلا کر بات کرتا تھا جیسے کسی مجمعے سے خطاب کر رہا ہو۔ اس کی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور وہ ہر لفظ ٹھہر ٹھہر کر اور نپے تلے انداز میں بولتا تھا جیسے وہ کوئی تجربہ کار، منجھا ہوا خطیب ہو۔ اس نے مجھے بخارا شہر کی قدیم چوبی مسجد کے امام ابو طاہر المروزی کی یاد دلا دی۔ میرا جب بھی بخارا میں قیام ہوتا تھا تو میں کوشش کر کے ان کا خطبۂ جمعہ سننے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن ان دونوں کی مشابہت صرف آواز ہی کی حد تک تھی، ابو طاہر خاصے فربہ اور پست قامت تھے، جب کہ یہ شخص ان کے بالکل برعکس پتلا اور لمبا تھا۔ اس نے سفید ہی رنگ کا ریشمی چغہ زیب تن کر رکھا تھا جو اس کے ٹخنوں تک آ رہا تھا۔ لیکن یہ وہ ریشم نہیں تھا جو ہم بخارا یا سمرقند سے خرید کر رے اور بغداد میں بیچتے تھے۔ یہ ان سے کہیں زیادہ نفیس، ملائم اور چمک دار دکھائی دے رہا تھا۔ میری نظروں کے آگے ایک سایہ سا تیر گیا۔ امیرہ خاتون، امیرہ خاتون، امیرہ خاتون! کل اس نے اور اس کی سہیلیوں نے بھی اس سے ملتے جلتے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کہیں اس شخص نے بھی تو اپنے کپڑے اسی بازار سے نہیں خریدے جہاں سے انھوں نے خریدے تھے؟ کل ہی کی بات ہے۔۔۔ لیکن کون جانتا ہے وہ کل تھا، کہ ایک ہفتہ، یا شاید ایک برس بیت گیا؟ لیکن نہیں، شاید ایک گھڑی ہی گزری ہے؟ لیکن نہیں۔۔۔ میرے اندر سے کوئی آواز کہہ رہی تھی کہ شاید جگ بیت گئے ہیں۔ وہ زمانہ، وہ دنیا، وہ کائنات ہی کوئی اور تھی۔ کیا میں دوبارہ وہاں جا سکوں گا؟ کیا یہ شخص اس سلسلے میں میری مدد کر سکتا ہے؟

'میں جانتا ہوں کہ تم اپنے سوالوں کے جوابات کے لیے کتنے بے تاب ہو،' وہ آ کر آتش دان کے سامنے رکھی ہوئی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک لمبی سلاخ سے انگاروں کو کریدنے

Scanned with CamScanner

لگا۔ 'اسی لیے میں بغیر کسی تمہید کے تمھیں بتا دوں کہ تمھیں چند گھڑیوں کے لیے جنت لے جایا گیا تھا، لیکن اب تم واپس ارضی دنیا میں آ چکے ہو۔'

میں نے اس شخص سے کوئی سوال نہیں کیا تھا، لیکن اسے پھر بھی پتہ چل گیا تھا کہ میں کیا پوچھنا چاہ رہا ہوں۔'

'گستاخی کی معافی چاہتا ہوں،' میں نے کہا۔ 'لیکن میں نے کبھی نہیں سنا کہ جنت جا کر کوئی وہاں سے واپس آیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، وہاں جاتے بھی صرف مرنے کے بعد ہیں۔ لیکن اگر وہ واقعی جنت تھی تو کیا آپ مجھے دوبارہ وہاں جانے کا طریقہ بتا سکتے ہیں؟'

'تم وہاں واپس جانا چاہتے ہو؟'

'جی، بالکل،' میں نے جلدی سے کہا۔

'لیکن جیسا کہ تم نے خود ہی کہا، زندہ لوگ جنت میں نہیں جایا کرتے، تمھارا ایک بار وہاں جانا ایک استثنائی مثال تھی، جسے بار بار نہیں دہرایا جا سکتا۔'

'آپ کون ہیں، آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا اور آپ کیسے جانتے ہیں کہ میں جنت سے ہو کر آ رہا ہوں؟'

'ہوں، ان سارے سوالوں کے جواب دینے میں تو بہت وقت لگ جائے گا، میرے بچے، جس کا ہم دونوں کے پاس وقت نہیں ہے، البتہ اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ تم دوبارہ اسی جنت میں جا سکتے ہو، اپنی امیرہ خاتون کے پاس۔'

اچھا، تو یہ شخص امیرہ خاتون کے بارے میں بھی جانتا ہے، میں نے سوچا۔ پتہ نہیں اسے میری زندگی کے بارے میں اور کتنی تفصیلات معلوم ہوں گی۔ کہیں اسے اس سب کچھ کا تو پتہ نہیں چل گیا جو اس قبلے میں ہوا تھا؟ میرے کانوں کی لویں تپ سی گئیں۔

'حضور، میں آپ کا بڑا ممنون ہوں گا، اگر آپ میرا یہ کام کر دیں تو میں عمر بھر دعا گو رہوں گا۔'

وہ شخص، جسے نیچے کھڑے لوگ سیدنا کہہ رہے تھے، ہنس پڑا۔ 'ممنون ہونے سے کام نہیں چلے گا میرے بچے۔ اس کے لیے قربانی دینا پڑے گی۔'

'میں ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ حکم دے کر دیکھیے، جو آپ کہیں گے، میں سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔'

'ہوں ں ں۔' انھوں نے اپنی لانبی دودھیا داڑھی سہلاتے ہوئے کہا۔ 'بتاؤں تمھیں اس کے لیے کیا کرنا پڑے گا؟'

'جی، میں مشتاق ہوں۔'

'تو پھر سنو۔۔۔ تمھیں مرنا پڑے گا۔'

ان کی آواز میرے کانوں پر یوں پڑی جیسے کوئی گردن سے پکڑ کر پانی میں غوطہ دے دے۔ 'جی؟' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

'جی میرے بچے۔ جنت میں جانے کے لیے مرنا تو پڑتا ہے۔ تم خاصے سمجھدار نوجوان ہو، یہ بات تو تمھیں معلوم ہونی چاہیے۔'

'لیکن۔۔۔؟'

'میں پہلے تمھیں بتا چکا ہوں میرے فرزند، کہ پہلی بار تم حادثاتی طور پر زندگی کے دوران ہی وہاں چلے گئے تھے، اب تمھارا دوبارہ جانا ممکن نہیں ہے۔ ویسے بھی جہاں تک میں جانتا ہوں، تم نے جنت حاصل کرنے کے لیے اس دنیا میں کچھ خاص کام بھی نہیں کر رکھے۔'

سیدنا کی یہ بات سن کر شرمندہ ہو گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے دل کا حال کھلی کتاب کی طرح پڑھ رہے تھے۔ ظاہر ہے، جو شخص ستاروں کی چالیں پڑھ لیتا ہے، اس کے لیے کسی کے دل کا حال جاننا کیا مشکل ہو گا؟ انھیں معلوم ہو گا کہ میری زندگی نوجوانی کی بے اعتدالیوں سے عبارت تھی۔ اور اصفہان کی وہ زن بازاری، جس کے پاس میرا دوست برہان مجھے لے گیا تھا؟

اف میرے خدا!

Scanned with CamScanner

سیدنا میرے چہرے کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ میں نے سوچا ہاتھوں سے چہرہ چھپا دوں، یا منہ دوسری طرف پھیر دوں، لیکن سیدنا کے رعب نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

'ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ تمھیں مرنا پڑے گا، اور کوئی عام موت نہیں، بلکہ ایک خاص کام کر کے مرنا ہوگا، جس کے اگلے ہی لمحے تم پہلے کی طرح اپنی امیرہ خاتون کی بانھوں میں آنکھیں کھولو گے، اور پھر ہمیشہ ہمیشہ اس کے ساتھ اسی سیاہ محل میں رہو گے جہاں تم نے سات مہینے گزارے تھے۔ بولو یہ سودا منظور ہے؟'

'سات مہینے؟ لیکن۔۔۔ میں تو بس۔۔۔'

سیدنا کے چہرے پر یوں تبسم پھیلا کہ ان کے سفید دانت نمایاں ہو گئے۔ 'ہاں، تم تو کہو کہ تم نے وہاں چند پہر گزارے ہیں، لیکن میرے بچے، جنت کا وقت اور دنیا کا وقت مختلف رفتاروں سے چلتا ہے۔ وہاں ہر لمحہ اس قدر پُرانبساط ونشاط ہوتا ہے کہ ہمارے کئی کئی گھنٹوں کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن خیر، یہ تو فروعی باتیں ہیں، تم بتاؤ کہ وہاں واپس جانا ہے یا نہیں؟'

'بالکل جانا ہے سیدنا۔ میں ہر کام کرنے کو تیار ہوں، بس آپ حکم دیجیے کہ مجھے کرنا کیا ہوگا۔'

'تو پھر کان کھول کر سنو۔' سیدنا کرسی گھسیٹ کر میرے قریب آ گئے۔

گل مینہ صحن میں بیٹھی برتن دھو رہی تھی کہ نیچے بازار کی طرف سے فائرنگ کی آواز آئی۔ اس نے صحن میں آ کر انگور اڈا کے بازار کی طرف دیکھا۔ حسبِ معمول وہاں دن کے اس وقت خاصی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ بازار کئی سو فٹ تک بالکل سیدھا چلا گیا تھا اور اس میں سے کوئی گلی بھی ادھر ادھر نہیں نکلتی تھی۔ بازار کا مغربی حصہ اس طرح سے افغانستان میں داخل ہو گیا تھا کہ سڑک کے دونوں طرف ایک چوتھائی بازار افغانستان میں تھا۔ زرجانان نے گل مینہ کو یہ دلچسپ بات بتائی تھی عین سرحد کی لکیر کے اوپر بنی ہوئی ایک کباب والے کی دکان یوں تقسیم ہوئی ہے کہ اس کا آدھا حصہ افغانستان میں اور آدھا پاکستان میں ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ پاکستانی ایف سی کی چوکی سرحد سے سو گز دور افغانستان کے علاقے کے اندر قائم ہے۔

گل مینہ نے پہلے تو سوچا کہ شاید بازار کے شروع میں واقع اسلحے کی دکانوں میں سے کسی گاہک نے بندوق سے آزمائشی فائر کیا ہے، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد تڑاتڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس بار آوازیں پاکستانی چوکی کی طرف سے آ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیا مسئلہ ہے، کل بھی سارا دن افغانستان کی طرف سے دھن دھنا دھن ہو رہی تھی جو آدھی رات تک جاری رہی۔

'فتح، فتح خان،' گل مینہ نے دروازہ کھول کر آواز دی۔ فتح خان گھر کے سامنے خالی جگہ پر دوسرے لڑکوں کے ساتھ کنچے کھیل رہا تھا۔ 'اندر آ جاؤ، جلدی سے۔' فتح خان نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا لیکن پھر اس نے اپنی توجہ کنچے کو نشانے پر پھینکنے پر مرکوز کر دی۔ 'فتح بیٹا، فائرنگ ہو رہی ہے، جلدی سے گھر کے اندر آ جاؤ، نہیں تو گلی میں چلے جاؤ۔'

'ف فائرنگ نیچے ہوئی ہے، اول گ گولی نئیں آئے گی،' فتح خان نے کہا اور دوبارہ کھیل میں مگن ہو گیا۔ فتح کے دوست نعیم نے کہا، 'خالہ ادھر افغانستان کی طرف جنگ ہو رہی ہے، فکر نہ کرو

Scanned with CamScanner

اس طرف کچھ نہیں ہے۔'

ارغنداب سے آنے کے بعد زرجانان نے بازار کے پیچھے ڈھلوان پر بنا پاؤجان کا ایک کمرے اور دالان پر مشتمل مٹی کا مکان ڈھونڈ نکالا تھا۔ پاؤجان کے بھائی کب کے فوت ہو گئے تھے اور ان کے بچے شہروں میں جا کر بس گئے تھے۔ زرجانان کے ماں باپ بھی مر چکے تھے اور بھائی کراچی چلا گیا تھا۔ اس کی ایک بہن کی ٹانک میں شادی ہوئی تھی، اور وہ وہیں اپنے بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا خاوند محنت مزدوری کرتا تھا۔ زرجانان ایک دن اس سے جا کر مل آیا تھا۔ اس کے کچھ ادھر ادھر کے رشتہ دار بھی تھے لیکن علاقے میں پچھلے کچھ برسوں میں وہ افراتفری مچی تھی کہ کسی کو کسی کا پتہ نہیں تھا۔ حالات نے سب کو اپنے اپنے خولوں میں بند کر دیا تھا کوئی کسی سے زیادہ ربط ضبط رکھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

ایک عرصے سے غیر آباد ہونے کی وجہ سے پاؤجان کا مکان کھنڈر بن گیا تھا۔ سامنے کی دیوار دروازے سمیت غائب تھی اور ایک کمرے کی چھت ڈھے چکی تھی، جب کہ دوسرا کمرا بھی اب گرا کہ تب گرا کی تصویر تھا۔ زرجانان کو موئی نیکہ زیارت کے قریب ایک پختہ مکان مل گیا تھا مگر گل مینہ نے ضد کی کہ پاؤجان کے مکان کو آباد کرتے ہیں۔ زرجانان نے اسے مکان دکھاتے ہوئے سمجھایا کہ یہ بہت چھوٹا ہے، چڑھائی پر بنا ہے، یہاں آتے جاتے ہوئے تکلیف ہوگی، لیکن گل مینہ ڈٹی رہی، اور بالآخر زرجانان کو قائل کر کے ہی چھوڑا۔ زرجانان کو کہیں سے ایک مستری میسر آ گیا، اس کے ساتھ خود مزدور بن کر اس نے مکان کی اس حد تک مرمت کروائی کہ وہ رہنے کے قابل بن گیا۔ گل مینہ کو اس مکان میں آ کر اتنا سکون ملا جتنا ارغنداب کے نو سالوں میں نہیں ملا تھا۔ اس دوران افغانستان میں گھر کے باہر کے حالات جو بھی رہے ہوں، کم از کم اس کے گھر کے اندر بڑا سکون تھا۔ لیکن پھر بھی اسے وہاں پاؤں تلے پھیلی زمین پرائی اور سر پر تنا آسمان مانگے کا لگتا تھا، جیسے کسی کے گھر مہمان گئے ہوں اور ہر دم انتظار ہو کب گھر واپسی ہوتی ہے۔

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ جیتے جی کبھی شوال واپس نہیں جا سکے گی اور اس کی

زندگی کی وہ ڈوری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کٹ گئی ہے۔ لیکن اب پاؤجان کے مکان میں اس کے دل میں جیسے ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ اسے نو برسوں بعد پہلی بار محسوس ہوا جیسے اس کا اپنے ماضی کے ساتھ رشتہ دوبارہ بحال ہو گیا ہے۔

اس گھر میں رہتے ہوئے دادا ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتے تھے۔ وہ یہاں اسی صحن میں چلتے ہوں گے، اسی دالان میں چارپائی پر بیٹھے نیچے بازار کا نظارہ کرتے ہوں گے، یہیں سے وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر خون کو گرما دینے والی مہموں اور معرکوں پر جاتے ہوں گے۔ شاید جنگ کے بعد انگریزوں نے یہ مکان بھی ڈھایا ہوگا۔ بعد میں پاؤجان دادا اور ان کے بھائیوں نے دوبارہ بنوا لیا ہوگا۔ شاید ذبح کرنے سے پہلے ان دو ولایتی بیلوں، یا ان میں سے کسی ایک کو اس صحن میں باندھا گیا ہو۔ کاش دادا ہوتے تو ان سارے واقعات کا مکمل وقوع خود بتاتے۔

پچھلے دس برسوں کے دوران ان کے ہاں دو اور بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکا تو پیدائش کے چند گھنٹوں بعد ہی چل بسا تھا، اس کے دو سال بعد لڑکی پیدا ہوئی اور ابھی اس نے ٹھیک سے چلنا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ بخار نے اسے ایسا جکڑا کہ قبر میں پہنچا کر دم لیا۔ فتح خان نے خرقہ شریف مس ہونے کے دو سال بعد پانچ سال کی عمر میں تتلا تتلا کر بولنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی زبان میں لکنت بھی تھی۔ شروع میں تو گل مینہ کے علاوہ کسی کو اس کی بات کی سمجھ نہیں آتی تھی، خود زرجانان پوچھا کرتا تھا کہ اس نے کیا کہا، لیکن اب عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی تتلاہٹ رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی البتہ لکنت اب بھی جوں کی توں تھی اور گل مینہ کے آزمائے ہوئے ٹوٹکے بڑی حد تک بیکار رہے تھے۔

ارغنداب میں رہائش کے نو سال بعد حالات اچانک بدل گئے۔ اب ہر وقت آسمان پر جنگی جہاز آتے تھے اور آس پاس کی پہاڑیوں پر بم برسا کر اور دھول کے مرغولے بلند کر کے ایک زمانے کے ساتھ افق کے دوسری طرف پہنچ جاتے تھے۔ خود ارغنداب میں ان جہازوں نے بم مار کر پرانے محلے کا بڑا حصہ ملیامیٹ کر دیا۔ ایک رات زرجانان ایک ڈائسن پک اپ لے کر آ

Scanned with CamScanner

گیا۔ 'گل مینہ، اب یہ جگہ رہنے کے قابل نہیں رہی۔ میرے سارے ساتھی مارے گئے ہیں، ملا داؤد بھی ہیلی کاپٹر کے حملے میں شہید ہو گئے ہیں۔ ہمیں پاکستان جانا ہوگا۔'

'پاکستان میں کہاں؟'

'فی الحال تو نکلنے کی کرو، باقی کی بعد میں سوچیں گے۔ فتح خان کی چیزیں اٹھاؤ، باقی سامان میں گاڑی میں لاد تا ہوں۔'

گل مینہ گاڑی میں بیٹھنے والی ہی تھی کہ تڑپ کر مڑی اور تالہ کھول کر گھر میں داخل ہو گئی۔ زرجانان بھی گاڑی سے اتر کر اس کے پیچھے چلا آیا۔ 'کیوں کیا ہوا؟ گاڑی سے کیوں اتر گئی ہو؟ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔'

'میری رائفل، وہ کڑیوں میں رہ گئی ہے۔'

'اوہو، میں بھی بالکل بھول گیا تھا اسے۔ ٹھیرو، ابھی اتارتا ہوں۔' زرجانان چارپائی گھسیٹ کر لایا اور اس پر چڑھ کر کڑیوں کے اندر چھپی تھری ناٹ تھری نکال کر گل مینہ کو تھما دی۔ رائفل کا لک سے کالی پڑ گئی تھی۔ گل مینہ نے اسے اپنے دوپٹے سے صاف کرنا چاہا تو دوپٹے پر بھی کالک لگ گئی۔

افغانستان سے آنے کے بعد زرجانان نے ڈائسن دے کر اس کے بدلے میں جیب لے لی تھی۔ لیکن علاقے میں سڑکوں کی حالت اس قدر خراب تھی کہ ان پر جیپ بھی مشکل سے چلتی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت گھر ہی پر گزارتا تھا، البتہ چار پانچ دن بعد اس کا بلاوا آجاتا اور وہ جیپ لے کر چلا جاتا اور دو تین دن تک غائب رہتا۔

انگور اڈا میں رہتے ہوئے شروع شروع میں گل مینہ کو بہت ڈر لگتا تھا۔ ملک عطا اور اس کے بھائیوں کو سن گن مل گئی تو کیا ہوگا؟ کئی برس کا عرصہ گزر گیا ہے، لیکن برسوں سے کیا ہوتا ہے، قبائلی دشمنیاں تو صدیوں چلتی ہیں۔ لیکن زرجانان نے اسے تسلی دی۔ 'اب میں جن لوگوں کے ساتھ کام کرتا ہوں، ان کی وجہ سے ملک عطا تو کیا اس کے باپ کی ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ ہماری

طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکیں۔ وہ وقت گزر گیا جب ہم منہ چھپاتے پھرتے تھے، اب سر اٹھا کر چلنے کا وقت ہے۔'

پھر دو ڈھائی سال بعد زرجانان نے اسے خبر دی کہ اس کے ساتھیوں نے قبائلی علاقوں سے ملکی نظام ہی اکھاڑ پھینکا ہے، اور جس ملک نے مزاحمت کی اسے ٹھکانے لگا دیا گیا ہے۔ شوال کے ملک عطا نے بھی مزاحمت کی کوشش کی تھی جس کی سزا اسے ماتھے پر گولی کی صورت میں دے گئی۔

فائرنگ کے ایک طویل برسٹ نے گل مینہ کو اس کی سوچوں سے باہر کھینچ نکالا۔ وہ ایک بار پھر فتح کو بلانے دروازے پر گئی تو اسے گلی میں سے دو مرد اپنے گھر کی طرف آتے دکھائی دیے۔ دونوں کے سروں کی سیاہ پگڑیوں اور سبز فوجی جیکٹوں سے ظاہر تھا کہ وہ کون ہیں۔ گل مینہ نے دروازہ بند کر لیا۔ ملا داؤد تو نہیں رہے لیکن اب زرجانان دوسرے طالبان کمانڈروں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ وہ دو دن پہلے یہ کہہ کر گیا تھا کہ کل تک واپس آجاؤں گا، لیکن اب دوسرے دن تک بھی اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا، لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ایسا اکثر ہو جاتا تھا۔ گل مینہ نے سوچا کہ باہر سے گزرتے ہوئے طالبان سے اس کے بارے میں پوچھے، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے پر عمل کر سکتی، دروازے پر دستک ہوئی۔

'ہم زرجانان کے ساتھی ہیں، اس کی گھر والی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'

گل مینہ کو یوں لگا جیسے اس کا دل کسی گہرے کنویں میں ڈوبنے لگا ہے۔

Scanned with CamScanner

میں عباسی خلیفہ المستر شد باللہ کے شاہی خیمے میں ان سے دس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ ان کے پیچھے محافظوں کا پرا ضرور موجود تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی بہت زیادہ چوکنا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ایک لمبی جست لگا کر تخت پر بیٹھے ہوئے موٹے تازے خلیفہ کے سامنے پہنچ سکتا تھا، اور محافظ جب تک حرکت میں آتے، میں سیدنا کا عطا کردہ زہر میں بجھا خم دار خنجر اس کے نرخرے میں اتار سکتا تھا۔ سیدنا نے کہا تھا کہ اس سے صرف خراش لگانا ہی کافی ہوگی۔ سیدنا نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے اگلے ہی لمحے، جب محافظوں کی تلواریں نیاموں سے نکل کر میرے بدن کی طرف لپکیں گی، میری آنکھ امیرہ خاتون کے زانوؤں پر کھلے گی۔

قلعۂ الموت سے روانگی کو سات ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ سیدنا کے منصوبے کے تحت میں نے قصیدہ گو شاعر کے روپ میں خلیفہ تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ انھوں نے زاوراہ کے علاوہ اپنے پانچ آدمی بھی میرے ساتھ کر دیے تھے جنھوں نے تمام انتظامات کرنا تھے۔ مجھے شاعری کا شوق تو شروع ہی سے تھا، اور میں نے اس سلسلے میں خلیفہ ہارون الرشید کے ملک الشعرا ابونواس کو اپنا مثالیہ بنا رکھا تھا اور کئی قصائد بھی قلم بند کر رکھے تھے۔ یہ الگ بات کہ میرے والد شعر و شاعری کو لہو و لعب گردانتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ شاعر اور سپاہی کی نہ زندگی کا کچھ پتہ چلتا ہے نہ موت کا۔ اگر قصیدہ بادشاہ کو پسند آ گیا تو شاعر سونے سے لاد دیا جاتا ہے، لیکن اگر کوئی شعر ناگوار گزرے تو جلاد کے حوالے۔

میں نے اپنے لبادے میں ہاتھ ڈال کر خم دار خنجر محسوس کیا۔ اس وقت بصرہ کا کوئی شاعر نہایت نکما سا قصیدہ سنا رہا تھا۔ مجھے سیدنا نے جو پانچ قصائد خاص طور پر اسی موقعے کے لیے دیے تھے ان میں سے ہر ایک اس سے دس گنا بہتر تھا۔ معلوم نہیں یہ قصائد سیدنا کہاں سے لائے تھے۔

کچھ بعید نہیں تھا کہ انھوں نے خود ہی کہے ہوں، حالانکہ انھوں نے مجھ سے عربی میں نہیں بلکہ فارسی میں گفتگو کی تھی۔

میں نے بڑی محنت سے المستر شد کے سامنے پڑھنے کے لیے ان میں سے ایک قصیدے کا انتخاب کیا تھا۔ میں اپنے آپ کو کوئی بڑا شاعر نہیں سمجھتا تھا، اور نہ ہی والد صاحب کی مہربانیوں کے طفیل مجھے شعرا کی زیادہ صحبت نصیب ہوئی تھی، لیکن پھر بھی میں نے اس قصیدے میں ایک آدھ جگہ لفظ بدل دیے تھے اور ابیات کی ترتیب بھی تھوڑی آگے پیچھے کر دی تھی اور اب میں مطمئن تھا کہ تمام عرب دنیا میں اس سے بہتر قصیدہ کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ بصری شاعر کا قصیدہ اب اختتام کے قریب تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں سیدنا کے سونپے ہوئے خنجر کی کٹیلی زہریلی دھار کو خلیفہ کی بھینچے جیسی موٹی گردن کا مزہ چکھا دوں۔ شاید اسے اسی کام کی غرض سے دمشق کی کسی بھٹی میں ڈھالا گیا تھا۔

میں نے اپنے ذہن میں اس موقعے کی ہزاروں بار مشق کر رکھی تھی۔ میں قصیدہ پڑھتے پڑھتے غیر محسوس طریقے سے خلیفہ کے قریب ہوتا جاؤں گا۔ جب آخری بند آئے گا تو میں شاہی تخت کے بالکل آگے پہنچ چکا ہوں گا۔ حسبِ امید اس وقت میرے قصیدے کا سحر اس قدر چھا چکا ہوگا کہ تمام دربار، بشمول شاہی محافظوں کے، اس کے سحر میں مبتلا ہو چکے ہوں گے۔ یہی موقع ہوگا کہ میں قصیدہ المستر شد کے قدموں میں رکھنے کے بہانے جھکوں اور اپنی خلعت کے کونے میں مہارت سے چھپایا گیا خنجر نکال کر اس کے حلق پر پھیر دوں۔ اس کے بعد امیرہ خاتون۔۔۔

میری باری آ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ تمام تر ذہنی تربیت کے باوجود میرے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے ہیں، اور حلق خشک ہونے کی وجہ سے الفاظ پھنس کر نکل رہے ہیں۔ کاش مجھے اس وقت کہیں سے پانی کا ایک گھونٹ مل جاتا۔

میں نے تھوڑی مہلت لینے کے لیے کاغذ سے نظر ہٹا کر خلیفہ کے چہرے پر ڈالی۔ اس

Scanned with CamScanner

کی موٹی موٹی گول آنکھوں میں مسرت چمک رہی تھی۔ وہ اس وقت مجھے کسی بچے کی طرح بھولا بھالا اور سادہ نظر آیا۔ اس زمانے میں عباسی خلیفہ ہونا بھی کس قدر دشوار ہے۔ ہر طرف سلجوقیوں کا دور دورہ ہے۔ خلیفہ کو ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتا ہے کہ اگر سلجوق سلطان کو کوئی چیز ناگوار گزر گئی تو وہ کہیں بغداد پر نہ چڑھ دوڑے۔ یہ تو مشرق سے لاحق خطرہ ہے۔ مغرب کا حال اس سے بھی ابتر ہے۔ ایک طرف تو صلیبی بار بار یلغار کرتے ہوئے مسلمان علاقے ہتھیاتے چلے جا رہے ہیں تو دوسری جانب سے فاطمی اور اسماعیلی بھی گدھوں کی طرح بغداد کے تخت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں کہ کب خلیفہ کی آنکھ جھپکے اور وہ جملہ بول دیں۔

خلیفہ المسترشد باللہ کا محل بغداد سے تین میل دور دجلہ کے کنارے آباد تھا۔ ساڑھے تین سو سال قبل جب بغداد بسا تھا تو عباسی خلفا شہر کے وسط میں واقع نیلے گنبد والے محل میں رہا کرتے تھے، لیکن اب وہ شہر کے ہنگاموں اور ہاؤ ہو سے تنگ آ کر یہاں منتقل ہو گئے تھے، اور صرف خاص الخاص موقعوں پر شہر کا رخ کرتے تھے۔ میرا لڑکپن اسی گنبد کے سامنے وسیع میدان میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے گزرا تھا۔ اسی میدان کے ایک کونے میں ہفتے کے دن منڈی لگتی تھی جس میں بغداد کے نواح سے سبزی اور پھل آ کر دکانیں سجاتے تھے۔

جنت میں وہ چند ہنگامہ خیز پہر، یا بقول سیدنا، سات ماہ گزارنے کے بعد سے عالمِ بیداری میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا تھا جب امیرہ خاتون کا چہرہ، اس کی بچوں کی طرح کی گول ٹھوڑی اور موٹی موٹی آنکھیں میرے دل و دماغ پر نہ چھائی ہوں۔ رات سونے سے قبل ذہن میں آخری خیال اسی کا رہتا تھا، صبح اٹھ کر سب سے پہلے اسی کا دھیان آتا تھا۔ میں سوچتا رہتا تھا کہ کیا وہ بھی مجھے یاد کرتی ہو گی؟ اس رات اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے صرف اور صرف میری خاطر تخلیق کیا گیا ہے، اور وہ ازل سے اب تک میری راہ تک رہی تھی۔ مجھے ہر وقت یہی خیال ستاتا تھا کہ وہ اس وقت کیا کر رہی ہو گی؟ کیا وہ میرے بارے میں سوچتی ہو گی؟ کیا اسے بھی میری یاد اسی طرح ستاتی ہو گی جس طرح اس کی یاد مجھے تڑپاتی ہے؟ اگر میں اپنے مقصد میں ناکام رہا تو اس کا کیا بنے گا؟

کہیں اسے کسی اور جنتی کی خدمت پر تو مامور نہیں کر دیا جائے گا؟ وہ سیاہ گل، جسے اس کے بقول صرف اور صرف میری خاطر تعمیر کیا گیا تھا، وہ کسی اور کے حوالے تو نہیں کر دیا جائے گا؟ صرف یہ سوچ ہی میری رگ و پے میں آگ سلگانے کے لیے کافی تھی۔

میں اب نصیب سے نکل کر رحیل میں داخل ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں سب کچھ بھلا کر بس پڑھتا چلا جاؤں تو تھوڑی دیر کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا، لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اب میرے ہاتھ زیادہ کانپنے لگے تھے۔ مجھے قصیدے کا ہر حرف زبانی یاد تھا اور کاغذ محض احتیاطاً ساتھ لے آیا تھا، لیکن اس وقت اگر میں پڑھتے پڑھتے کاغذ سے نظریں ہٹا لیتا تو مجھے یہ تک یاد نہیں رہا تھا کہ جو لفظ میں اس وقت پڑھ رہا ہوں اس کے بعد اگلا لفظ کون سا آئے گا۔ ذہن میں خیالات کا منتشر ریلا بے چلے جا رہا تھا۔ مرنے کے کتنی دیر بعد میں امیرہ خاتون کے پاس پہنچوں گا؟ خلیفہ کے قتل کے بعد جب محافظ مجھ پر تلواریں چلائیں گے تو کیسا محسوس ہو گا؟ کتنا درد ہو گا؟ اگر مرنے میں زیادہ دیر لگی تو کیا ہو گا؟ اور اس سے بڑھ کر یہ کھٹکا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ سیدنا کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو، اور اصل میں ہو بہو ایسا نہ ہو جیسا انھوں نے فرمایا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں یہ کام کر کے جنت سے دھتکار دیا جاؤں اور امیرہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھوں؟

میں قصیدہ پڑھے چلے جا رہا تھا۔ یکا یک ایک بیت پر میں کھٹک کر رک گیا، جیسے میری آواز بند ہو گئی ہو۔ سارا دربار میری طرف نگراں تھا، لیکن میرے منہ سے ایک لفظ نکل کر نہیں دے رہا تھا۔ یہ بیت میں نے تیاری کے دوران کئی بار پڑھا تھا، اور وہ تھا:

ترے ساتھ بیتی شبِ اولیں کی ہر ایک ساعتِ مختصر
مجھے خلد کی مستقل صبح سے ہے ہزار درجہ عزیز تر

میرے ذہن میں بخارا کی قدیم چوبی مسجد کے امام ابو طاہر المروزی کا خطبہ گھوم گیا جس میں انھوں نے تفصیل سے جنت کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہاں دن رات نہیں ہوں گے بلکہ ہمیشہ صبح کا عالم طاری رہے گا۔ اس کے علاوہ بھی میں نے بغداد کے مولویوں سے اسی قسم کی باتیں

Scanned with CamScanner

سن رکھی تھیں کہ جنت میں سورج چاند نہیں ہوں گے اس لیے وہاں زمین کی طرح کے دن رات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن میں نے تو امیرہ خاتون کی جنت میں عصر کو مغرب میں اور پھر مغرب کو رات میں ڈھلتے دیکھا تھا؟ وہاں میں نے اپنی آنکھوں سے سورج کو غروب ہوتے اور تاروں کو چمکتے دیکھا تھا۔ بلکہ اب مجھے المستر شد باللہ کے بھرے دربار میں قصیدے کا کاغذ ہاتھ میں لیے کھڑے یاد آیا کہ جب میں نے قصرِ اسود کے شیشے والے جھروکے سے باہر جھانکا تھا تو مجھے آسمان پر کہکشاں اور ستاروں کی وہی ترتیب دکھائی دی تھی جو دنیاوی آسمان کی ہوتی ہے۔ اور ہاں، ایک اور بات، امیرہ خاتون کی ہنسلی کے عین اوپر وہ ہلکا سا زخم کا نشان کیسا تھا، جس کے بارے میں میں نے پوچھا تو اس نے ہنس کر مجھے کسی اور طرف الجھا دیا؟ کیا حوروں کے بدنوں پر بھی زخموں کے نشان ہوا کرتے ہیں؟ مجھے اگر یہ بات پہلے یاد آئی ہوتی تو میں بغداد کے کسی عالم سے پوچھتا۔

قصیدے کا کاغذ میرے ہاتھ سے گر گیا۔

50

گل مینہ دروازے کے پٹ چھوڑ کر صحن کی طرف چلی گئی اور منہ دوسری طرف کر لیا۔

'میرا نام راج ولی ہے اور یہ میرا ساتھی علی داد ہے،' ان میں سے ایک نے کہا۔ وہ دروازے سے گزر کر صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ گل مینہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا اور ٹانگوں میں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ برآمدے میں ستون کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔

'بہن جی، جو میں کہنے جا رہا ہوں، کاش وہ مجھے نہ کہنا پڑتا۔ لیکن زرجانان کا قریبی دوست ہونے کے ناطے میرا فرض بنتا تھا۔ ویسے تو ہم غم کی خبر لائے ہیں، لیکن یہ ساتھ ساتھ خوشی کی بھی خبر ہے۔'

گل مینہ نے سر ستون سے ٹیک دیا تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی جیسے تیز آندھی چل رہی ہو، اور راج ولی آندھی کے دوسری طرف سے بول رہا ہو۔

'اللہ کا حکم ہے کہ شہید کو مردہ مت کہو، وہ زندہ ہے، اور قیامت کے روز اسی حالت میں اٹھایا جائے گا۔'

گرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور آج تو اچھی خاصی دھوپ تھی، لیکن گل مینہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے جیسے انھیں خاصی دیر برف کی سل تلے رکھا گیا ہو۔

راج ولی کہہ رہا تھا، 'وہ ہمارا جیالا ساتھی تھا۔ اس نے ایک عرصے تک ہمارے لیے، اپنی ملت کے لیے، اپنے مذہب کے لیے خدمات انجام دیں، لیکن ایک وقت آ جاتا ہے کہ اس فانی دنیا کو الوداع کہنا پڑتا ہے۔ حکم ہے کہ شہید کے مرنے کا ماتم نہیں کرنا چاہیے، شہید تو اللہ کا دوست ہے۔'

Scanned with CamScanner

گل مینہ کو اپنے قریب سے آواز آئی، 'ماں تم لو کیوں لٹی ہو؟ انھوں نے کش کہا ہے تم سے؟' شاید فتح خان اپنے گھر میں اجنبیوں کو دیکھ کر کھیل چھوڑ کر آ گیا تھا۔

گل مینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ فتح خان نے دوبارہ پوچھا، 'ماں کون لوگ ہیں یہ؟ کیا ہوا ہے؟'

گل مینہ نے بڑی مشکل سے سر اوپر اٹھا کر فتح خان کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے چیخ کر کہا، 'فتح، ہم لٹ گئے، برباد ہو گئے، آج سے ہماری دنیا اندھیری ہو گئی۔' یہ کہہ کر اس نے فتح کو اپنے ساتھ زور سے چمٹا لیا۔ فتح خان کو سمجھ آئی یا نہیں لیکن اس نے بھی زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

ادھر راج ولی یا علی داد میں سے کوئی ایک کہہ رہا تھا، 'حکم ہے کہ شہید کی موت کا ماتم نہ کیا جائے، وہ مرا نہیں ہے، اللہ کے پاس چلا گیا ہے۔ شہید کی موت پر رونے پیٹنے سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔'

گل مینہ کی آنکھوں کے آگے دھندلکا چھانے لگا تھا۔ اس کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ بہت سی عورتیں، کوئی اس کا ہاتھ دبا رہی تھی اور کسی نے تھام رکھا تھا۔ پھر دھندلکا بڑھتا چلا گیا اور سب کچھ تاریک ہو گیا۔

تیسرے دن راج ولی اور علی داد کے علاوہ کئی اور لوگ بھی گل مینہ کے گھر آئے۔ چند ایک کے ساتھ ان کے گھر کی عورتیں بھی تھیں۔ راج ولی نے اسے نوٹوں کی ایک گڈی دی، 'بہن، یہ رقم خاص طور پر امیر نے بھیجی ہے۔ انھوں نے تمھارے لیے پیغام دیا ہے کہ ہم ان حالات میں تمھیں تنہا نہیں چھوڑیں گے، اور یہ کہ زرجانان شہید نے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اس کی تمنا ہر

مسلمان کے دل میں ہونی چاہیے، اور یہ کہ اس نے پوری تحریک کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے۔ امیر نے خود شہید کی مغفرت کی دعا پڑھوائی ہے۔'

گل مینہ کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا، 'بھائی صاحب، آپ کی مہربانی ہے۔ لیکن میں دو دن سے لوگوں سے پوچھ رہی ہوں، میرے سوال کا جواب نہیں ملتا کہ میرے خاوند کی لاش کہاں ہے، میری آپ سے اور امیر سے اور سب سے التجا ہے کہ وہ جس حالت میں بھی ہے، اسے میرے حوالے کیا جائے تاکہ میں اس کا کفن دفن کر سکوں، اور میرے دل کو کچھ قرار آ جائے۔'

راج ولی اور علی داد نے ایک دوسرے کی طرف اور پھر اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ چند لمحے خاموشی رہی، پھر علی داد گلا صاف کر کے بولا، 'بہن جی، بات یہ ہے کہ زرجانان دشمن کے علاقے میں لڑتے ہوئے شہید ہوا ہے، یہ ہمارا ساتھی مقرب خان وہاں موجود تھا۔ مقرب خان، بہن جی کو بتاؤ۔'

'السلام علیکم بہن،' گھنے بالوں اور سانولی رنگت والا ایک نوجوان بولا۔ 'زرجانان میرے بڑے بھائی کی طرح تھا۔ اس نے کئی موقعوں پر میرے ساتھ اتنی شفقت اور محبت کا مظاہرہ کیا، اس کا احسان میں زندگی بھر نہیں اتار سکتا۔ پھر اس آخری مرحلے میں تو اس نے جس جانبازی کا ثبوت پیش کیا ہے اس پر اس کے سارے خاندان کو اور خاص طور پر آپ کو فخر ہونا چاہیے۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر ہمارے کئی ساتھیوں کی جانیں بچا گیا۔ خاص طور پر میں تو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ جرات کا مظاہرہ نہ کرتا تو کم از کم میں اس وقت یہاں موجود نہ ہوتا۔'

'بھائی صاحب آپ کی بات درست ہو گی، زرجانان ایسا ہی تھا، اور مجھے اس پر فخر ہے بھی، لیکن میں اس کی لاش کے بارے میں جاننا چاہ رہی ہوں، اگر آپ اس کا پتہ بتا سکیں تو آپ پر کیے گئے سارے احسان اتر جائیں گے۔' گل مینہ نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ 'اصل میں اس کی لاش نہیں ہے،' مقرب خان کی آواز بھرائی

ہوئی تھی۔'

'لاش نہیں ہے کیا مطلب؟ کہیں تو ہوگی اس کی لاش، کہیں دفنا دیا ہے تو مجھے قبر دکھا دو، اگر ویسے ہی زمین میں گاڑ دیا ہے تو جگہ کا پتہ دے دو، تاکہ میں وہاں جا کر دعا تو کر سکوں، میرے دل کو کچھ تو صبر مل سکے۔' گل بینہ نے کہا۔

'اصل میں بہن جی، ہوا یوں کہ جب ہم دشمن سے لڑ رہے تھے تو۔۔۔ تو اسے دراصل۔۔۔ توپ کا گولہ آ کر لگا تھا۔۔۔' مقرب خان سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ علی داد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

'اگر آپ کہتے ہیں توپ کا گولہ آ کر لگا تھا، تو ٹھیک ہے لگا ہوگا، میں وہاں نہیں تھی، آپ تھے۔ لیکن اس کا کچھ تو بچا ہوگا، کوئی ہاتھ، پاؤں، کوئی تو نشانی مجھے لا دو، اور کچھ نہیں تو اس کے کپڑے ہی لے آؤ جو اس نے مرتے وقت پہن رکھے تھے۔ میرے پاس کچھ تو ہو دفنانے کے لیے۔'

اب کی بار علی داد بولا، 'بہن جی، یہ دشمن دوسرا ہے۔ اس کی توپ کا گولہ سیدھا آ کر لگے تو کچھ نہیں بچتا۔ میں خود اس وقت وہاں موجود نہیں تھا لیکن مقرب خان اور دوسرے ساتھیوں نے بتایا ہے کہ اس کے بعد دشمن کے جہازوں نے بھی اسی جگہ کئی بم گرائے تھے۔ یہ بم اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ زمین میں دس گز گہرا کنواں کھود دیتے ہیں، اس مکان جتنی چٹان بھی ہو تو اسے ایک سیکنڈ میں پیس کر سرمہ بنا دیتے ہیں، آدمی تو نازک چیز ہے۔'

'دیکھو بھائیو، میرے لیے اپنوں کی موت کوئی نئی چیز نہیں ہے، میں پہلے بھی کئی لاشے دفنا چکی ہوں۔ پہلے پہل تو انسان کو یقین ہی نہیں آتا کہ کوئی ایسا شخص جو آپ کی زندگی کا حصہ تھا، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا ہے۔ پھر جب وقت گزرنے کے ساتھ سمجھ آ جاتی ہے کہ وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا تو ایسا لگتا ہے کہ ساری دنیا ہی ختم ہو گئی ہے، کچھ بھی باقی نہیں بچا، ایسا لگتا ہے جیسے مرنے والا زندگی کا مقصد ہی ساتھ لے گیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد آہستہ آہستہ دھند چھٹتی چلی جاتی

ہے۔ بندہ قبر پر جاتا ہے، مرنے والے سے بات چیت کرتا ہے، اسے اپنا دکھڑا سناتا ہے، اپنی پریشانی اپنی مصیبت کا سارا ماجرا اس کے سامنے رکھتا ہے۔ اس سے دل کا بوجھ آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ مرنے والے کا دکھ تو کبھی نہیں جاتا، لیکن انسان کم از کم وہ دکھ برداشت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اب جب اس کی قبر ہی نہیں ہے تو مجھے سمجھائیں کہ میں کہاں جا کر روؤں، کہاں بین کروں، اپنا حال کس سے بیان کروں۔ میرے دل میں جو خلا ہے، وہ کیسے بھروں؟ اس کو تو زمین آسمان مل کر بھی نہیں بھر سکتے۔'

'بہن جی آپ آواز اونچی نہ کریں، زرجانان شہید ہوا ہے، اس کا مقام اللہ کے ہاں ہے'، راج ولی نے کہا۔ فہیم کی ماں دور بیٹھی ہوئی تھی، وہ اٹھ کر گل بینہ کے پاس آ گئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ گل بینہ نے کہا، 'دیکھو خالہ، یہ لوگ میرے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ میرے زرجانان کو لے جا کر کہیں مار دیا، اب مجھے وہ جگہ بھی نہیں دکھا رہے۔ ان ظالموں سے کہو کہ مجھے ایک پوٹلی وہ مٹی ہی لا دو جس پر اس کا خون بکھرا ہوگا۔ میں اس مٹی کو ادھر صحن ہی میں دفنا کر زرجانان کی قبر بنا دوں گی۔' گل بینہ نے اب فہیم کی ماں کے کندھے پر سر رکھ کر بلند آواز میں بین کرنا شروع کر دیے تھے۔ وہ بار بار اس کے کندھے اور سر سہلا رہی تھی۔ راج ولی اور اس کے ساتھی کب اٹھ کر گئے، گل بینہ کو پتہ نہیں چلا۔

Scanned with CamScanner

51

شفیق نے محسوس کیا کہ اس کا کام روز بروز نکھرتا چلا جا رہا ہے۔ اب اسے خود بھی مزا آنے لگا تھا۔ نہ یہاں جاہل ٹرک ڈرائیوروں کی بک بک سننا پڑتی تھی نہ بابو پینٹر کی جھک جھک جو صرف اور صرف اس کو نالائق ظاہر کرنے کے لیے شاگردوں کی موجودگی میں آ کر اس کے کام میں کیڑے نکالتا رہتا تھا۔ 'یہاں لال رنگ کچھ زیادہ ہی شوخ ہو گیا ہے،' یا 'وہاں ہنس کی گردن ٹیڑھی ہو گئی ہے۔' بلکہ اس نے ایک دن یہ تک کہہ دیا تھا کہ 'تم نے آبشاریوں بنائی ہے جیسے کسی عورت نے بستر کی چادر دھو کر تار پر ڈالی ہو۔' دوسری طرف کچھ ایسے بدعہد ڈرائیور تھے جو خود تفصیلی فرمائش کروا کر تصویر بنواتے تھے لیکن اس کے مکمل ہونے کے بعد صاف مکر جاتے تھے کہ ہم نے تو ایسے نہیں ویسے کہا تھا۔

ایسے موقعوں پر بابو پینٹر بھی ڈرائیوروں کا ساتھ دے دیتا تھا اور سارا ملبا شفیق کے سر پر گر جاتا کہ وہ دھیان سے ہدایات نہیں سنتا اور اگر سنتا بھی ہے تو اپنے آپ کو اتنا بڑا فنکار سمجھتا ہے کہ ان پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتا، اس لیے ہر جگہ مرضی ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر دوسرے کچھ ڈرائیور ایسے تھے جنھیں اچھی طرح پتہ ہوتا تھا کہ پورا ٹرک پینٹ ہونے میں کتنے دن لگتے ہیں، لیکن وہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی روزانہ آ کر اس کے سر پر سوار ہو جاتے تھے اور جلد از جلد کام مکمل کرنے کا تقاضا کرتے تھے کہ ٹرک کھڑا رہنے سے ہمیں ایک دن اتنے ہزار کا نقصان ہو رہا ہے۔

اس کے مقابلے پر مدرسے کے اساتذہ کے تعریفیں اور کندھے پر خطیب صیب کی ایک ہی تھپکی اسے سرشار کر دیتی تھیں۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ خطیب صیب سے درخواست کرے گا کہ جب دیوار مکمل ہو جائے تو اس کی تصویر لینے کا بندوبست کیا جائے تاکہ وہ بابو پینٹر کو دکھا کر

اسے جلا سکے۔ اسے کئی بار خیال آیا تھا کہ کاش کسی طرح بابو یہاں آ کر اس کا کام دیکھ پاتا۔ لیکن وہ یہاں کیسے آ سکتا ہے؟ اس نے تو اب تک اس کی جگہ کسی کو رکھ بھی لیا ہوگا۔ بلکہ کسی کو کیا، اس نے اسی نکمے مجیدے پینٹر کو اس کی جگہ لگا دیا ہوگا جو سڑک کی دوسری طرف ایک اور ورکشاپ میں کام کرتا تھا اور خاصے عرصے سے اس کی جگہ لینے کے درپے تھا۔ وہ مجیدا جسے قلم پکڑنا بھی شفیق نے سکھایا تھا، اب وہی چند برس کے اندر اندر اس کے منہ کو آنے لگا تھا اور جگہ جگہ اس کی پیٹھ پیچھے برائیاں کرتا پھرتا تھا۔ شفیق نے سوچا کہ اب وہ بھی اگر شفیق کا تازہ کام دیکھے تو خود اپنی آگ میں جھلس کر راکھ ہو جائے۔

شفیق اغوا ہونے سے قبل، چکوال کے ایک ڈرائیور کے لیے ڈالے پر سفید براق گھوڑا بنا رہا تھا۔ اس تصویر میں گھوڑے کو الہڑ انداز میں دائیں ٹانگ موڑے اور بائیں ٹانگ پھیلائے ہوئے دکھایا جانا تھا جس میں اس کی گیہے دار دم سوالیہ نشان کی طرح بکھری ہوئی ہے۔ لیکن ابھی تصویر ایک چوتھائی بھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اسے اغوا کر لیا گیا۔ مجیدے نے اس شاندار گھوڑے کا حشر نشر کر دیا ہوگا۔ وہ کبھی بھی سفید رنگ کی پاکیزگی کو سمجھنے کا اہل نہیں ہو سکتا، اس نے یقیناً گھوڑے پر رنگین کائھی ڈال کر اس میں دنیا جہان کے رنگ بھر دیے ہوں گے جو ہو سکتا ہے بابو کو بھی اچھے لگے ہوں۔ خود بابو کسی زمانے میں پینٹر تھا، شفیق نے اس کی بنائی ہوئی چند چیزیں دیکھی تھیں، جو عامیانہ ہی تھیں، لیکن اس زمانے میں پینٹنگ کا زیادہ رواج نہیں تھا اس لیے اس کا نام ہو گیا۔ اب خود برش پکڑتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپتا تھا لیکن اپنے طرزِ عمل سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا جیسے مونا لیزا اسی نے بنائی ہے۔

لیکن پھر بھی شفیق کا دل کہتا تھا کہ مجیدا کبھی بھی اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ چند جاہل ڈرائیور ایک طرف، مگر ایسوں کی کوئی کمی نہیں تھی جو دور دور سے خاص طور پر اس کے کام کی نفاست اور ہنرمندی کی خاطر آتے تھے، اور کام کے دوران اڈے کے آس پاس بکھرے چارپائی ہوٹلوں میں کئی کئی دن تک پڑے رہتے تھے، وہ اب وہاں آنا چھوڑ دیں گے۔ مجیدا تو کیا اس کے

Scanned with CamScanner

فرشتے بھی اس نفاست سے کام نہیں کر سکتے جیسا شفیق کرتا ہے۔ اسے تو نہ رنگوں کی آپس میں مناسبت یا مخالفت کا خیال ہے، نہ ہی شکلوں کی ہم آہنگی کا کوئی احساس۔ وہ تو بس کسی دیہاتی دلھن کے بے ڈھنگے میک اپ کی طرح چینختے چلاتے ہوئے شوخ رنگ استعمال کر دیتا تھا جو ہزارہ کی سائیڈ کے بعض نوسیکھیے ڈرائیوروں کو پسند آتے تھے مگر سمجھدار ڈرائیور اور مالکان اس سے دور رہتے تھے۔ شفیق کو اپنا ایک فقرہ یاد آ گیا جو اس نے مجیدے کا رنگا ہوا ایک ٹرک دیکھ کر کسا تھا: 'ٹرک کیا رنگا ہے، لگتا ہے کسی گنوار عورت نے دیوار پر اپلے تھوپے ہیں!' شفیق کو یہ بات سوچتے ہوئے اس قدر ہنسی آ گئی کہ اس کا سارا بدن لرزنے لگا اور اسے نیلی جھیل میں شاہانہ انداز سے تیرتے ہوئے راج ہنس کی تصویر بناتے بناتے قلم پیچھے ہٹانا پڑا کہ واقعی ہنس کی گردن ٹیڑھی نہ ہو جائے۔

پیچھے ہٹتے ہوئے شفیق کی نظر تصویر کے بائیں انتہائی کونے پر پڑی اور چونک گیا۔ وہاں جھیل کے کنارے ایک گول جھاڑی سرخ رنگ سے رنگی ہوئی تھی بلکہ اس جھاڑی کا عکس پانی میں بھی سرخ پینٹ کیا گیا تھا۔ یہ فتح کا کام تھا۔ شفیق نے خود اسے دونوں سبز رنگ گھول کر دیے تھے، جہاں دھوپ پڑ رہی وہاں شوخ سبز اور سائے کی جگہ پر گہرا رنگ۔ لیکن اس نے ساری جھاڑی لالو لال کر دی تھی جیسے خون میں لتھڑی ہوئی ہو۔ اس سے پینٹنگ کے بائیں حصے کا سارا توازن بگڑ گیا تھا۔ شفیق کو حیرت تھی کہ فتح نے ایسا کیوں کیا؟ وہ عام طور جو کہا جائے وہی کیا کرتا تھا اور اگر بات سمجھ میں نہ آئے تو سر جھکا کر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ ویسے وہ ہے کہاں؟ صبح سے نظر نہیں آیا اور کل بھی جلدی ہی کہیں چلا گیا تھا۔

شفیق ایک ہاتھ میں برش اور دوسرے میں رنگ کا ڈبہ تھامے اس سوال پر غور کر ہی رہا تھا کہ آسمان پر زور سے بجلی کڑکی، کھڑکی کے شیشے چکنا چور ہو کر فرش پر آ گرے، ساتھ ہی کمرا یوں ڈول گیا جیسے ابھی ایک طرف کو الٹ جائے گا۔ شفیق کے پیروں کے نیچے سے میز یوں نکل گئی جیسے کسی نے چاروں پائے پکڑ کر زور سے کھینچ دیے ہوں۔ وہ اوندھے منہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس

دوران اس کے پاؤں تلے سے میز کھسک چکی تھی۔ وہ تازہ رنگی ہوئی دیوار پر گھستا ہوا دھبہ چھوڑتا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

شفیق کو ہوش آیا تو آڑے ترچھے انداز میں فرش پر پڑا تھا۔ اس نے سب سے پہلے ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ ہڈیاں سلامت تھیں البتہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں کے سامنے لایا تو انگلیاں لال ہو گئیں۔ اس نے ہتھیلی سے دبا کر خون بند کرنے کی کوشش کی اور دوسرے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھا۔ میز ایک طرف ایک پہلو پر پڑی تھی اور فرش پر گرے ہوئے ڈبوں سے نیلا اور پیلا رنگ اس کے خون کی سرخی کے ساتھ مل کر تجریدی آرٹ کا ایک عجیب و غریب نمونہ پیش کر رہا تھا۔ وہ دیوار سے رگڑ کھا کر گرا تھا اس لیے دیوار کے کچے رنگ اس کے کپڑوں سے لگ گئے تھے اور تصویر کا ایک حصہ خراب ہو گیا تھا۔

شفیق نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ دو تین ناکام کوششوں کے بعد وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا۔ اٹھتے وقت اس نے غیر ارادی طور پر آدھ انچی برش بھی ہاتھ میں تھام لیا۔ اس نے دروازے سے باہر جھانکا۔ سامنے والی دوسری منزل اپنی درجنوں محرابوں سمیت صحن میں اوندھی پڑی تھی اور اس میں سے اٹھتے ہوئے گاڑھے دھویں اور دھول نے یکجان ہو کر صحن کو ملگجا بنا دیا تھا۔ برآمدے کے کونے میں تیز آگ بھڑک رہی تھی جس کے شعلے بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔ فضا میں تیز بو تھی جو مرچوں کی دھونی کی طرح ناک میں گھسی جا رہی تھی اور سانس لینا مشکل بنا رہی تھی۔ اسے خاصی دیر کے بعد احساس ہوا کہ ہر طرف زبردست شور شرابا ہے۔ کیا طالب کیا استاد، کیا بچہ کیا بڑا، سب سر کٹے مرغے کی طرح ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ ہر کوئی چیخ رہا ہے۔ شفیق کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے اور اسے اس موقعے پر کیا کرنا چاہیے۔ وہ ہال کے دروازے میں کھڑا خالی خالی نظروں سے یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ منظر اس نے کسی فلم میں بھی دیکھ رکھا ہے، لیکن ذہن اس قدر خالی خالی تھا کہ فلم کا نام یا دیگر تفصیلات یاد نہیں آ سکیں۔

اچانک کسی نے اس کا نام زور سے پکارا۔ شفیق نے آواز کی سمت مڑ کر دیکھا۔ اسے

Scanned with CamScanner

صرف اتنی بات سمجھ میں آئی، 'بھاگو، نکلو یہاں سے، دلون دُبالہ آئے گا'۔ شفیق کے ایک پاؤں میں چپل تھی، دوسری چپل ڈھونڈنے کا موقع نہیں تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن قدموں نے ساتھ نہیں دیا اور وہ ڈگمگا کر رہ گیا۔ جس کے بعد اس نے لنگڑاتے ہوئے تیز تیز چلنے پر اکتفا کیا۔ فرش خون سے رنگین تھا جس میں اس کے پاؤں پھسلے جا رہے تھے۔ وضو گاہ کے حوض کے قریب وہ کسی بھاگتے ہوئے طالب کا دھکا کھا کر خود کو سنبھال نہیں سکا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ کوئی اس کے پیٹ کے اوپر قدم رکھتا ہوا گزر گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو ہاتھ میں کسی کا بازو آ گیا۔ اس نے سہارا لینے کے لیے اس بازو پر زور ڈالا تو وہ جیسے جڑ سے اکھڑ کر اس پر آ گرا۔ اس نے چیخنا چاہا تو منہ سے کوئی آواز برآمد نہیں ہوئی۔ ماتھے سے خون بہہ کر دائیں آنکھ میں ٹپک رہا تھا اور خون کی نمکینی اسے اپنے حلق میں محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ایک چہرہ اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا۔ یہ فتح خان تھا جو چلاتے ہوئے بڑی روانی سے بول رہا تھا: 'اٹھو اٹھو استاد، دلون حملہ ہو گیا ہے۔ ابھی دو بالہ بم گلائے گا۔ جلدی اٹھو استاد، دو سلا دلون آ لہا ہے'۔ فتح خان نے شفیق کو سہارا دے کر اٹھایا۔

شفیق سر کے بغیر دھڑوں، دھڑوں کے بغیر سروں، ادھر ادھر مڑے تڑے انسانی اعضا کے درمیان سے ڈگمگاتا لڑکھڑاتا ہوا ایک مہینے کے بعد پہلی مرتبہ کسی نگرانی کے بغیر مدرسے کی حدود سے باہر نکل گیا۔ اس کے ایک ہی پاؤں میں پلاسٹک کا پھٹا ہوا جوتا تھا۔ خوش قسمتی سے مدرسے کے دروازے پر اسے ایک پشاوری چپل نظر آئی جو اس نے جلدی سے بائیں پاؤں میں گھسیٹ لی۔

دہشت کے عالم میں اسے یہی سوجھا کہ وہ گاؤں کو آنے والی اس کچی سڑک پر نہ چلے جہاں سے وہ پہلی بار آیا تھا۔ وہ سڑک سے اتر کر بائیں طرف جھاڑیوں میں ہو لیا۔ اب اس نے نیچے بیٹھ کر چپل کا پٹہ باندھنے کی کوشش تو معلوم ہوا کہ یہ چپل بائیں نہیں بلکہ دائیں پاؤں کی ہے جو فٹ نہیں ہو رہی۔ اس نے چپل اتار کر دائیں پاؤں میں پہنی اور ڈھیلا جوتا دوسرے پاؤں میں اڑس لیا۔ جھاڑیوں کے اندر سے ایک پتلی سی پگڈنڈی شمال مشرقی پہاڑیوں کی جانب چلی جا رہی

تھی، وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اسی پر ہو لیا۔ اسے ہر لحظہ یہی دھڑکا لگا تھا کہ ابھی پیچھے سے فائر کی آواز آئے گی، اس کی گردن میں ایک تیز چبھن محسوس ہو گی اور وہ اوندھے منہ گر کر اپنے ہی قدموں میں ڈھیر ہو جائے گا۔ اس نے ایک متوقع نوکیلی ٹیس کی پیش بندی کے طور پر اپنی گردن کے پٹھے اکڑا لیے اور چلتا گیا۔

Scanned with CamScanner

'پھر کیا ہوا بابا جان؟' جب خاصی دیر تک بابا یوں خاموش رہے کہ ان کی ٹھوڑی سینے پر ٹکی تھی اور وہ تیز تیز سانسیں لے رہے تھے تو مجھے ان سے پوچھنا پڑا۔

خاصی دیر خاموش رہنے کے بعد انھوں نے بات دوبارہ شروع کی۔ 'رکن الدین قصیدہ ختم نہیں کر سکے، لیکن خلیفہ ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے انھیں اپنے دربار میں رہنے کی پیش کش کر دی۔ رکن الدین المستر شد کے درباری شاعر بن گئے۔ تاہم جنت والا معاملہ ان کے اعصاب پر آسیب کی طرح چھایا ہوا تھا۔ وہ اب جان گئے تھے کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے، اور انھیں جنت نہیں، بلکہ الموت کے آس پاس کسی پہاڑ پر واقع کسی باغ میں لے جایا گیا تھا جہاں وہ محلات اور باغات تعمیر کیے گئے تھے۔ انھوں نے یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ ان کا انتخاب کیوں کیا گیا تھا۔ وہ بغداد کے رہنے والے تھے اور شاعری کا شوق رکھتے تھے، اور یہ بات کسی طرح سے سیدنا کے لوگوں کو معلوم ہو گئی ہو گی۔

'رکن الدین نے تمام باتیں خلیفہ کو بتا دیں۔ وہ رکن الدین کی ذہانت، شخصیت اور سب سے بڑھ کر ان کی راست بازی سے اس قدر متاثر ہوا کہ انھیں اپنے بیٹے کی طرح سمجھنے لگا۔

خلیفہ نے رکن الدین کی شادی ایک درباری کی دختر سے کروا دی اور امیرہ کو بھول کر بغداد میں رہنے لگے، تاہم خلیفہ کو دھڑکا تھا کہ سیدنا کے آدمی مقصد کے حصول میں ناکامی پر انھیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ اس لیے ان کے گرد ہر وقت محافظوں کا ایک دستہ تعینات رہتا تھا۔ لیکن ابھی چند ہی برس گزرے تھے کہ سلجوقیوں نے ایک بار پھر بغداد پر حملہ کر دیا اور خلیفہ اپنے محل میں محصور ہو کر رہ گیا۔ سلجوقی چند دن تو محل کی دیواروں کے باہر گھیرا ڈالے رہے پھر ایک رات انھوں نے محل پر ہلہ بول دیا۔ اس وقت رکن الدین خلیفہ کے پاس موجود تھے۔ خلیفہ کے

پاس اس کا سب سے قیمتی خزانہ ایک ہی شے تھی، نبی پاک کا مقدس خرقہ۔ اسے خطرہ لاحق ہوا کہ سلجوقی اسے چھین نہ لیں، اس لیے اس نے یہ خرقہ رکن الدین کے حوالے کر دیا۔ جس وقت سلجوقی شاہی محافظوں کو تہہ تیغ کر کے خلیفہ کو گرفتار کرنے ننگی تلواریں لیے محل کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے تو رکن الدین نے یہ پاک خرقہ ظالم حملہ آوروں کے ہاتھ چڑھنے سے بچانے کے لیے اپنے بدن پر پہن لیا تھا۔ انھیں مار پیٹ کے بعد سلجوقیوں نے بڑی مشکل سے یہ تصدیق ہونے کے بعد جانے دیا کہ ان کا تعلق فوج سے نہیں بلکہ وہ شاعر ہیں۔ بدن پر موجود معمولی اور بوسیدہ خرقے کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔

بغداد میں رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ رکن الدین اپنی بیوی اور سات ماہ کے بچے کے ساتھ وہاں سے نکلے، لیکن راستے میں ان کی بیوی طاعون کی وبا کا شکار ہو کر چل بسی۔ رکن الدین اپنے ننھے بیٹے کو ساتھ لیے پرانے راستوں سے ہوتے ہوئے بخارا آ پہنچے اور وہیں آباد ہو گئے۔

اب ان کا دل شعر و شاعری میں نہیں لگتا تھا، انھوں نے مذہب سے لو لگا لی۔ جلد ہی اپنے علم و فضل اور تقویٰ کی وجہ سے وہ دور و نزدیک مشہور ہو گئے اور لوگ ان کا ہاتھ چھونا سعادت گردانے لگے۔ انھوں نے وقتِ وصال اپنا ورثہ اور خرقہ اگلی نسل میں منتقل کر دیا۔ ان کے پردہ فرمانے کے ایک صدی بعد ان کے پوتے مستقیم شاہ نے یہ درگاہ قائم کی اور اس وقت سے یہ خرقہ مرجع خاص و عام چلا آ رہا ہے اور لوگ دور دراز کے بلاد سے ہفتوں بلکہ مہینوں کا سفر طے کر کے اس کی زیارت کو آتے ہیں۔

'بلکہ مجھے کہنا چاہیے، آتے تھے۔' یہ کہتے کہتے بابا نے اپنا سر جھکا لیا۔

اس بدعہد لٹیرے ابدالی نے یہ خرقہ چرا کر بے ایمانی اور خیانت کی حدیں پار کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری نسل در نسل وراثت کو بھی نیست و نابود کر دیا ہے۔ ہماری اس وراثت کے بغیر ہم ایسے ہی ہیں جیسے بے تیغ سپاہی۔ ہماری تمام تر طاقت، عزت اور سطوت کا دارو مدار اسی خرقے پر تھا۔ خرقہ نہ رہا تو یہ سب کچھ بھی چھن گیا۔ ہمیں ہر صورت یہ سب کچھ واپس لانا ہے۔

Scanned with CamScanner

'مگر کیسے بابا؟ ابدالی تو بہت طاقتور ہے۔ ہم اس کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟'

'ویسے ہی جیسے حسن الصباح نے سلجوقوں، عباسیوں اور صلیبیوں کے دانت کھٹے کیے تھے۔'

'وہ کیسے بابا؟'

'حسن الصباح کے عقائد چاہے جو بھی رہے ہوں، لیکن انھوں نے رہتی دنیا تک کے لیے مثال قائم کر دی ہے کہ کہ جرار لشکروں اور کیل کانٹے سے لیس قلعوں کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ صرف ایک سرفروش ایک پر ہیبت لشکر کا سرکاٹ کر اسے ایسے ہی غیر موثر کر سکتا ہے جیسے اژدہے کا سر کچل دیا جائے تو وہ چیونٹیوں کا رزق بن کر رہ جاتا ہے۔'

'آپ کا مطلب ہے فدائی؟ فدائی حملہ؟ مگر وہ کیسے ہوگا؟ ہم فدائین کہاں سے لائیں گے؟'

بابا نے اپنے سامنے پڑا نقش خنجر اٹھا لیا۔ 'میں خود یہ کام کر گزرتا، لیکن افسوس کہ میری عمر اور صحت دونوں اس امر کی اجازت نہیں دیتے، اس لیے خاندان کی صدیوں پرانی ناموس بچانے کا بوجھ تمھاری گردن پر آن پڑا ہے۔ تمھیں ابدالی کو اسی طریقے سے جہنم واصل کرنا ہوگا جیسے حسن الصباح کے فدائی اپنے مقصد کی سربلندی کے لیے ہنستے کھیلتے آگ میں کود جایا کرتے تھے، لیکن انھیں معلوم ہوتا تھا کہ ہر صورت میں کامیابی صرف اور صرف انھی کا مقدر ہے۔ وہ موت کو اسی بے نیازی سے گلے لگا لیتے تھے جیسے ایک عام آدمی ہاتھ بڑھا کر پانی کا کٹورا پی لیتا ہے۔'

'بابا، مجھے سوچنے کا موقع مل سکتا ہے؟ بس ایک دو دن؟'

'اس میں سوچنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر تم اب بھی سوچ میں پڑ گئے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ تمھاری تربیت میں کسر رہ گئی ہے، اور یقیناً یہ میری ہی کوتاہی ہے۔'

شمس الدین نے گہری سانس لے کر ہوا سینے میں بھر لی۔ پھر وہ آگے جھکا اور بابا کے آگے پڑا خنجر اٹھا لیا۔ 'ٹھیک ہے بابا، مجھے منظور ہے۔ میں اپنی خاندانی روایت کا احیا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتوں گا۔'

گل مینہ کئی ہفتے بعد تک شدید انتشار کے عالم میں رہی۔ فہیم کی ماں دو وقت کھانا لے آتی تھی اور اسے زبردستی کھلا جاتی تھی۔ فتح خان خود ہی سکول کی تیاری کرتا تھا، اور تیاری بھی کیا، ملیشیا کا ایک ہی جوڑا تھا جو وہ روزانہ صبح پہن کر جاتا تھا، سکول سے واپسی پر اتار کر برآمدے کے ستون سے لگی کیل سے لٹکا دیتا اور وہاں ٹنگا ہوا جوڑا پہن لیتا۔ آخر ایک ماہ بعد کہیں جا کر گل مینہ حقیقت کی دنیا میں واپس آئی۔

اس کے بعد وہ اکثر زرجانان کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھتی رہتی تھی۔ اسے اکثر محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے اور وہ خیالوں خیالوں میں اس سے باتیں شروع کر دیتی تھی۔ اس نے ایک بار ایک دلچسپ بات بتائی تھی کہ انگوراڈا بازار میں ایک کبابیے کی ایک دکان ایسی ہے جس کا کڑاہا تو پاکستان میں ہے، لیکن لوگ جہاں چارپائیوں پر بیٹھ کر کباب کھاتے ہیں، وہ حصہ افغانستان میں ہے۔ زرجانان کی زبانی یہ بات سن کر گل مینہ بہت ہنسی تھی کہ یہ کیسی دکان ہے جو دو ملکوں میں بٹی ہوئی ہے۔ لیکن اب اسے لگتا تھا جیسے اس کی اپنی زندگی بھی اسی طرح بٹتی جا رہی ہے کہ خیال ایک طرف ہے تو حقیقی زندگی دوسری جانب۔ ماضی ایک طرف کٹا پڑا ہے، حال دوسرے حصے میں پڑا ہانپ رہا ہے۔

فہیم کی ماں نے کئی بار کہا بھی کہ زرجانان کے کپڑے، جوتے اور دوسری چیزیں کسی کو دے دو، لیکن گل مینہ نے ہر بار سختی سے منع کر دیا۔ 'خالہ، میرے پاس کچھ تو رہنے دو، اگر یہ چیزیں میں کسی کو دے دوں تو میرے پاس کیا رہ جائے گا، صرف یادیں؟ اور یادیں ابھی سے دھندلی پڑنا شروع ہو گئی ہیں۔ جیسے انسان کو صبح اٹھنے کے بعد تھوڑی دیر تک خواب پوری تفصیلات کے ساتھ یاد رہتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ حالت ہو جاتی ہے کہ صرف اتنا یاد رہتا ہے کہ کوئی خواب دیکھا

Scanned with CamScanner

تھا، لیکن ہزار یاد کرنے پر بھی اس کی کوئی بات ذہن میں نہیں آتی۔'

'گل مینہ تم اکیلی نہیں ہو، نیچے گاؤں میں جا کر دیکھ لو، ہر دوسرے تیسرے گھر میں تمھاری طرح کی بیوائیں مل جائیں گی، لیکن انھوں نے زندگی سے ہار نہیں مانی۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ تمھارے پاس زرجانان کی سب سے بڑی نشانی فتح خان ہے۔ تمھیں اس کی خاطر خود کو سنبھالنا ہوگا۔ تمھارے مستقل ماتم کی وجہ سے اس پر غلط اثر پڑ رہا ہے، اس کے کپڑے میل سے کالے پڑ گئے ہیں۔'

'فتح ہی کی خاطر تو زندہ ہوں خالہ، ورنہ اب میرے لیے جینے میں کیا رہا ہے۔ وہ نہ ہوتا تو میں کب کا کھانا پینا چھوڑ چکی ہوتی۔'

فتح خان نے اس دوران زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارنا شروع کر دیا تھا۔ ہکلا ہونے کی وجہ سے لڑکے اس کا مذاق اڑاتے تھے، اور اسی وجہ سے آئے دن اس کی کسی نہ کسی سے لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ کچھ عرصے سے اس کے اندر ایک عجیب خصلت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ بعض اوقات خود سے بڑی عمر کے لڑکوں سے بھڑ جاتا تھا۔ اسے مار تو پڑتی لیکن وہ زمین پر بار بار گرنے کے بعد سے اٹھ کر دوبارہ خود سے کہیں زیادہ طاقتور لڑکے سے لپٹ جاتا۔ آخر وہ تنگ آ کر دوسرے لڑکوں سے کہتا تھا کہ 'بھئی اس بلا سے میرا پیچھا چھڑاؤ، یہ تو ایسا ڈھیٹ ہے کہ مار کھا کھا کر بھی باز نہیں آتا۔'

زرجانان کے مرنے کے ایک مہینے بعد علی داد آ کر گل مینہ کو پانچ ہزار روپے دے گیا۔ گل مینہ نے منع کرنے کی کوشش کی لیکن وہ پیسے چارپائی پر رکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ 'ہمارا مجاہد بھائی تو نہیں رہا لیکن ہم ابھی زندہ ہیں، ہمارا اتنا تو حق بنتا ہے کہ ہم آپ کی اور اپنے بھتیجے کی کچھ مدد کر سکیں۔ میں ہر مہینے آ کر پیسے دے جایا کروں گا، بس اسے زرجانان کی پنشن یا وظیفہ سمجھ لیں۔'

پانچ ہزار کچھ زیادہ رقم نہیں تھی لیکن گل مینہ کا خرچ ہی کیا تھا۔ بس اس کا اور فتح کا دو وقت کا کھانا، اس لیے گزارا ہو جاتا تھا۔ یہ سلسلہ چھ ماہ تک چلتے چلتے یکا یک بند ہو گیا۔ گل مینہ نے پتہ کروانے کی کوشش کی لیکن لوگ علی داد یا اس کے ساتھیوں کا ٹھکانہ یا تو جانتے نہیں تھے یا پھر

بتانے سے ڈرتے تھے۔ اس نے ادھر ادھر سن گن لینے کی کوشش کی کہ کوئی دو وقت کے کھانے کے بدلے میں اس گھر کا کام لے لے لیکن سارے گاؤں میں لوگ خود اتنے غریب تھے کہ کسی اور کو نوکر رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ نیچے بازار میں دو چار گھر ایسے تھے جہاں نسبتاً کھاتے پیتے لوگ رہتے تھے لیکن ان کے ہاں پہلے ہی سے تین تین چار چار عورتیں کام کر رہی تھیں۔

آخر ایک دن جب گل مینہ کے بکسے میں صرف بیس روپے رہ گئے اور اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے کہ علی داد اور راج ولی نے ایک بار پھر اس کے دروازے پر دستک دی۔

'بہن جی معاف کرنا ہم دو تین ماہ سے نہیں آ سکے،' راج ولی نے کہا۔ 'زرجانان ہمارا مجاہد بھائی تھا، اس رشتے سے آپ ہماری بہن اور فتح ہمارا بھتیجا لگتا ہے۔ آپ کی حالت دیکھ کر دل کٹتا ہے، لیکن یقین جانیں کہ اب حالات بہت بدل گئے ہیں، ایک طرف ساری دنیا کھڑی ہے، دوسری طرف ہم اکیلے ہیں۔ ادھر افغانستان میں امریکہ چن چن کر ہمارے ساتھیوں کو نشانہ بنا رہا ہے، ادھر پاکستانی فوج مشرف پر حملے کے بعد جگہ جگہ ہمارے خلاف کارروائیاں کرتی پھر رہی ہے۔ اس پکڑ دھکڑ اور مار دھاڑ کی وجہ سے خود ہمارا باہر نکلنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس صورت میں ہم آپ کی مزید مالی مدد کرنے کے قابل نہیں رہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آپ اکیلی نہیں ہیں بلکہ سرحد کے دونوں طرف مجاہدین کی ایسی ہزاروں بیوائیں ہیں، ہم سے جہاں تک ہو سکا، مدد کی، لیکن اس سے آگے ہم مزید کوئی مالی مدد نہیں کر سکیں گے۔'

ان دونوں کے آنے سے گل مینہ سمجھی تھی کہ وہ پیسے لے کر آئے ہوں گے، لیکن وہ تو کچھ اور کہانی سنا رہے تھی۔ زندگی کیسے کٹے گی؟ فتح خان کا کیا بنے گا؟ یہ سوال اس کے ذہن میں سائیں سائیں کرنے لگے۔

ادھر راج ولی کی بات جاری تھی۔ 'لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے آپ کو بالکل بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔ ہم آپ کے پاس ایک پیش کش لے کر آئے ہیں، ہماری درخواست ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کریں۔ چاہیں تو کسی سے مشورہ بھی کر لیں۔'

Scanned with CamScanner

گل بینہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

'ہمارا ایک مجاہد ساتھی ہے، کلوشہ کے علاقے کا رہنے والا ہے لیکن وہاں فوجی آپریشن کی وجہ سے اپنے علاقے میں نہیں جا سکتا۔ بس یہ سمجھیں کہ آپ کی طرح اس کے بھی آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اگر آپ اس سے شادی کر لیں تو ایک مجاہد کا گھر بس جائے گا اور دوسری طرف آپ کو بھی سہارا مل جائے گا۔'

تھوڑی دیر تک گل بینہ کی سمجھ میں راج ولی کی بات نہیں آئی۔ اس نے گردن اٹھائی۔

'بھائی، آپ کیا کہہ رہے ہیں، کس کی بات کر رہے ہیں؟'

'میں جانتا ہوں، ہمارے لیے بھی اسے کہنا مشکل ہے،' اب کے علی داد بولا۔ 'لیکن دینی اعتبار سے بھی اور دنیاوی اعتبار سے بھی کسی عورت کا زیادہ عرصے تک اس طرح اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ فتح اگر بڑا ہوتا تو پھر کوئی مسئلہ نہیں تھا، لیکن اب۔۔۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہ رشتہ قبول کر لیں، اسی میں سب کی بھلائی ہے۔ وہ بھی زرجانان کی طرح ہمارا مجاہد ساتھی ہے۔'

'بھائی، میں آپ کی ہمدردی اور مہربانی کی قدر کرتی ہوں۔ اللہ ایک بے بس بیوہ کے بارے میں اچھا سوچنے پر آپ کو یقیناً اجر دے گا، لیکن میں ایک اور مجاہد کی موت برداشت نہیں کر سکوں گی۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ مجاہدوں کو گھر گرہستی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اس لیے میرا جواب ہی سمجھیں۔'

راج ولی بولا، 'بہن جی آپ اس طرح سے کیوں نہیں سوچتیں کہ آپ کو ایک اور مجاہد کی خدمت کرنے کا موقع مل جائے گا؟ جیسا کہ علی داد بھائی نے کہا ہے، اور آپ بھی اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ اس معاشرے میں کسی عورت کا سہارے کے بغیر رہنا ناممکن ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ دوبارہ گھر بسا لیں۔ اس میں سب کا بھلا ہے۔ ہمارا بہت دلیر مجاہد ساتھی ہے اور بالکل اکیلا ہے۔ آپ کو سہارا مل جائے گا اور اس کو گھر۔ اس لیے یہ دونوں فریقوں کے لیے بہت

مناسب رہے گا۔'

گل بینہ کے لیے دوسرے رشتے کی بات نئی نہیں تھی۔ محلے کی عورتیں اور خاص طور پر ہمسائی نجیم کی ماں کئی بار یہی موضوع چھیڑ چکی تھی، لیکن اس کے لیے زرجانان کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی عذاب سے کم نہیں تھا۔ کیا اس نے اوپر بیٹھے یہ بات سن لی ہوگی؟ اس کا کیا ردعمل ہوگا؟ اگر اس کی جگہ کوئی اور لے لے تو وہ کیا سوچے گا؟

'بہن جی، اگر آپ کو سوچنے کے لیے وقت چاہیے، تو بتا دیں،' راج ولی نے کہا۔ 'ہم انشاءاللہ اگلے ہفتے پھر آئیں گے۔'

دوسری شادی؟ اس رات گل بینہ اذان تک کروٹیں بدل بدل کر یہی سوچتی رہی۔ زرجانان کی تصویر اس کی آنکھوں کے آگے جھلملاتی رہی۔ آہ زرجانان، شادی کی رات وہ پہلی بار میرے پاس آیا تو اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ بار بار بستر پر لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ میں سمجھتی کہ شاید میرے منہ پر سرخی کا دھبہ لگ گیا ہے یا کوئی اور مسئلہ ہے، جس سے اسے ہنسی آ رہی ہے، لیکن اس نے بتایا کہ وہ خوش ہے، بہت خوش۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں وہ بار بار کہتا تھا، 'مینو، تم نے جتنی مصیبتیں جھیلنا تھیں وہ جھیل لیں، جتنے غم برداشت کرنا تھے وہ سب پچھلی زندگی کا حصہ بن گئے۔ اب میں تم پر کوئی مصیبت نہیں آنے دوں گا، کوئی غم نہیں جھیلنے دوں گا، ہر غم ہر مصیبت کو تم تک پہنچنے کے لیے مجھ پر سے گزرنا پڑے گا۔'

لیکن زرجانان، پھر تم خود ہی گزر گئے۔ سر سے چھت اڑ گئی، سر پر سے چادر اتر گئی۔ کاش تم نے جنگجو بننے سے اور ٹینکوں توپوں سے ٹکرانے سے پہلے سوچا ہوتا کہ تمھارے بعد تمھاری بیوہ پر کیا گزرے گی؟ تمھارے نابالغ بیٹے کا کیا بنے گا؟ میں نے تمھیں سو بار منع کیا تھا کہ اپنی ڈرائیوری کرتے رہو۔ کام کم ہے تو بے شک ہو، میں ایک جوڑے میں گزارا کر لوں گی، ایک وقت کا کھانا تین وقت چلا لوں گی، لیکن تم کہاں میری مانتے تھے، ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے تھے۔ بس یہی کہتے، تھوڑے حالات ٹھیک ہو جائیں تو چھوڑ دوں گا۔ اب ٹھیک کر لو

Scanned with CamScanner

حالات۔

اگلی صبح اس نے فہیم کی ماں سے مشورہ کیا۔ پھر نکڑ میں رہنے والی دادی اماں سے بات کی جو پاؤ جان کو جانتی تھیں۔ سب کی ایک ہی رائے تھی، یہ پہاڑ جیسی زندگی بغیر مرد کے سہارے کے نہیں گزرے گی۔

اگلے جمعے کی شام علی داد اور راج ولی نے آ کر دوبارہ وہی بات چھیڑی تو اب کے گل بینہ نے سر جھکا دیا۔

54

شفیق کو مدرسے سے نکلے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ دائیں پاؤں کی چپل تھوڑی تنگ ضرور تھی لیکن پنڈ آخری سوراخ میں ڈالنے کے بعد گوارا ہو گئی تھی، البتہ بایاں جوتے کا تلہ پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا، جسے اس نے بار بار گھاس پھونس سے باندھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ سو پچاس قدم کے بعد پھر جواب دے جاتا تھا۔ آخر تنگ آ کر اس نے پاؤں سے نکال کر پھینک دیا اور ننگے پاؤں چلتا رہا۔ اس کے پاؤں میں اتنے کانٹے اور نوکیلے کنکر چبھے تھے کہ اب وہ جہاں دایاں پیر رکھتا وہاں خون کا نقش بن جاتا تھا۔

اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے، یا وہ مدرسے سے کتنا دور آ چکا ہے۔ جو پگڈنڈی لے کر وہ بانڈہ میرا سے نکلا تھا وہ چند گھنٹوں کے اندر اندر ہی دھندلی پڑتے پڑتے بالکل ہی معدوم ہو گئی تھی، اور اب وہ ایسے ویرانے میں چلا جا رہا تھا جہاں لگتا تھا کہ پہلے کبھی انسانی قدم نہیں پڑے۔

رات کے وقت اس نے ایک جگہ رک کر سونے کی کوشش کی تھی لیکن ہوا اتنی ٹھنڈی تھی کہ ہڈیوں کے آر پار ہوئی جاتی تھی۔ ایک جگہ اسے خاصا بڑا غار بھی ملا تھا لیکن سانپ بچھو کے ڈر سے اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ آخر دو بڑے پتھروں کے بیچ لیٹ کر اسے ہوا سے کسی قدر نجات مل گئی لیکن ناہموار پتھریلی زمین پر ہر دس پندرہ منٹ بعد آنکھ کھل جاتی تھی۔ رات کسی وقت اسے دور سے کسی جانور کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نہ معلوم نہ گیدڑ تھا، لومڑی یا پھر بھیڑیا! وہ پتھر کے اوپر چڑھ گیا اور اندھیرے میں چاروں طرف دیکھتا رہا کہ کہیں سے جلتی ہوئی آنکھیں دکھائی دے جائیں، لیکن نہ تو کسی جانور کی آنکھیں نظر آئیں اور نہ ہی غرانے کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ لیکن اس کے بعد نیند ایسی غائب ہوئی کہ رات کا بقیہ حصہ اس نے جاگ کر گزار

Scanned with CamScanner

دیا۔

صبح اٹھنے کے بعد بھوک اور پیاس کے مارے حالت بری تھی۔ چھوٹی بڑی بے ڈھنگی پہاڑیاں بے ترتیبی سے چاروں جانب پھیلی تھیں جیسے فطرت نے سٹے بازوں کی طرح آنکھیں بند کر کے زمین پر لڑھکا دی ہوں۔ یہ پہاڑیاں سیاہ اور بھورے پتھروں سے یوں ڈھکی تھیں کہ مٹی خال خال ہی نظر آتی تھی۔ کہیں کہیں پتھروں کے بیچ میں خاردار جھاڑیاں نکلی تھیں جو اس ماحول کی ہیبت ناکی کو مزید بڑھاتی تھیں۔

شفیق اس امید پر ہاتھ پاؤں لگا کر ایک پہاڑی پر چڑھتا تھا کہ چوٹی سے کوئی شہر نہیں تو بڑی سڑک ہی نظر آجائے گی، لیکن اوپر پہنچ کر جہاں تک نظر جاتی، وہی اوبڑ کھابڑ پہاڑیاں، وہی بے ڈھنگے پتھر اور وہی خاردار جھاڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ شفیق نے کسی ڈائجسٹ میں کہانی پڑھی تھی جس میں ہیرو ایک طلسماتی پہاڑی سلسلے میں بھٹک جاتا ہے، اور سالہا سال دیوانہ وار وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ جس سمت بھی جاتا ہے، پہاڑیاں اور جنگل اسی سمت میں جادوئی طریقے سے اس کے آگے آگے پھیل جاتے ہیں۔ کبھی کبھی اسے گمان گزرتا تھا کہیں وہ بھی کسی ایسے شیطانی چکر میں تو نہیں پھنس گیا۔ کہانی کے ہیرو کو تو اس پر عاشق دیوی وہاں سے نکال لے گئی تھی، لیکن میرا کیا ہوگا؟ مدرسے والوں کو پتہ چل گیا تو فرار کی کوشش کی واحد سزا موت ہے۔ یہی خیال اس کے تھکے ہوئے بدن پر چابک کا سا کام کرتا تھا اور اس کی چال میں تیزی آ جاتی تھی۔

اچانک اسے دو درختوں کے درمیان حرکت نظر آئی۔ وہ غیر ارادی طور پر ایک جھاڑی کے پیچھے ہو گیا۔ اس سے کوئی ڈیڑھ دو سو گز دور چھوٹی جسامت کے چند ہرن چلے جا رہے تھے۔ ان کے بدن فربہ تھے اور کھال دھوپ میں چمک رہی تھی۔ شفیق نے سوچا کہ اگر وہ نشیب میں سے ہوتے ہوئے جائے تو آگے جا کر پہاڑی کے دامن میں ان میں سے کسی کو پکڑ سکتا ہے، جسے بھون کر کھایا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر اس نے خود ہی یہ خیال جھٹک دیا۔ اول تو ہرن اتنے چست اور

چوکنے نظر آ رہے تھے کہ انھیں پکڑنا آسان نہیں ہوگا، اور اگر پکڑ بھی لیا تو ذبح کیسے کیا جائے گا اور بھوننے کے لیے آگ کہاں سے آئے گی؟

وہ پھر آگے کی طرف چل پڑا۔ خاصی دور جا کر ایک جھاڑی پر گہرے جامنی رنگ کے مٹر کے دانوں کے برابر پھل نظر آئے۔ اس نے ایک دانہ لے کر چکھا۔ ذائقہ خمکین اور ترشی کا امتزاج لیے ہوئے تھا۔ اس نے مٹھی بھر پھل کھائے اور جھاڑی کے بقیہ پھل توڑ کر اپنی دونوں جیبوں میں بھر لیے۔ لیکن کچھ دیر کے اندر اندر اس کی خوراک کی نالی میں جلن شروع ہو گئی۔ جیسے اس نے ابلتی ہوئی چائے کی پیالی حلق میں انڈیل لی ہو۔ ساتھ ہی ساتھ زبان اور ہونٹوں میں ایسی چبھن شروع ہو گئی جیسے چھوٹی چھوٹی سوئیاں چبھو رہی ہوں۔

شفیق تیورا کر ایک پتھر پر ڈھے گیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے رواں ہو گئے۔ زہر؟ میں نے زہر کھا لیا ہے؟ اور وہ بھی اس بیابان میں؟ یہاں علاج تو درکنار دور دور تک آدم نظر آتا ہے نہ آدم زاد۔ لیکن اگر میں تیز تیز چلنا شروع کر دوں تو شاید کسی گاؤں تک پہنچ جاؤں۔ انھیں میں یہ پھل دکھاؤں گا، شاید ان کے پاس اس کا کوئی تریاق ہو۔

نہ معلوم وہ کتنی دیر اسی حالت میں بیٹھا رہا، پھر پتھر کا سہارا لے کر ڈگمگاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ سمتوں کا تعین تو ایک طرف رہا، اب اسے یہ تک اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کس طرف سے آیا تھا اور کدھر جانا چاہتا تھا۔

وہ کسی شرابی کی طرح لہراتا ہوا جدھر کو منھ اٹھا ادھر روانہ ہو گیا۔ راستے میں اسے ایک سوکھی ہوئی شاخ پڑی نظر آئی تو اس نے اٹھا لی اور اسے ٹیک ٹیک کر چلنے لگا۔ اب چڑھائی شروع ہو گئی تھی، اوپر سے دھوپ تیزی دکھا رہی تھی۔ اب اسے بار بار آنکھوں سے پسینہ پونچھنا پڑ رہا تھا۔ ادھر قمیص گیلی ہو کر کمر کے ساتھ چپک گئی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ آگے کسی چٹان یا کھڈ نے آ کر راستہ مسدود کر دیا اور اسے گھوم کر اس کے گرد سے ہو کر جانا پڑا۔ زمین پتھریلی تھی لیکن اسے لگ رہا تھا کہ اس کا ہر قدم ایک ایک فٹ تک زمین میں دھنس رہا ہے اور اسے جھٹکا دے کر پاؤں زمین

Scanned with CamScanner

میں سے نکالنا پڑ رہا ہے۔

اس کے حلق میں پیاس سے کانٹے پڑ گئے تھے۔ لیکن اسے اندازہ تھا کہ پہاڑی کے اوپر پانی نہیں ملے گا۔ دوسری طرف اتر کے دیکھوں، شاید دامن میں کوئی چشمہ ہو۔ جس حساب سے پسینہ نکل رہا ہے اس سے بہت جلد بدن میں پانی کی کمی واقع ہو جائے گی۔ اس نے اپنی رفتار مزید سست کر دی۔ پہاڑی کی چوٹی کی قریب چیڑ کے چھدرے درخت شروع ہو گئے، لیکن دوسری طرف اترنے کے بعد پھر وہی منظر جو پہاڑی کے اس طرف تھا۔

سورج پہاڑی کے پیچھے اوجھل ہو گیا اور ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو گئی۔ جلد ہی اس کے بدن سے پسینہ خشک ہو گیا لیکن اب ایک اور فکر نے اسے گھیر لیا تھا۔ اس ویرانے میں رات کیسے گزرے گی؟ یہاں کیا پتہ رات کو بھیڑیے گیدڑ نکل آئیں، وہ تو مجھے منٹوں میں چیر پھاڑ دیں گے۔ اس نے لاٹھی پر گرفت مضبوط کر لی۔

کچھ آگے چل کر اسے ہریالی نظر آئی۔ چوڑے پتوں والا کسی قسم کا بے حد ہرا پودا۔ پھر جلد ہی پانی بھی نظر آ گیا۔ ایک چھوٹی سی صاف شفاف ندی اوپر درختوں کے اندر سے ہو کر جھر جھر بہتی چلی آ رہی تھی۔ اس نے اوکیں بھر بھر کر پانی پیا۔ آہستہ آہستہ معدے اور گلے کی جلن دور ہو گئی۔

وہ کچھ دیر گھاس پر لیٹا رہا۔ بدن میں کچھ طاقت آئی تو اٹھا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا ندی عبور کر آگے چل کی طرف چل پڑا۔ یہاں خاصی اونچی ڈھلوان تھی جس پر گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے چڑھنا خاصا دشوار تھا۔ پھر اسے دور جھاڑیوں کے اندر ایک لکیر دکھائی دی ندی سے ہو کر بل کھاتی ہوئی چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر جھوم کر رہ گیا اور جھاڑیاں پھلانگتا ہوا اس تک پہنچ گیا۔ یہ ایک خوب پامال پگڈنڈی تھی۔ بانڈہ میرا سے نکلنے کے بعد اسے پورے علاقے میں پہلی بار انسانی آثار نظر آئے تھے۔ تیزی سے چڑھنے سے اس کا سانس پھول گیا لیکن جب وہ اوپر پہنچا تو سامنے کے منظر نے اس کا ساری تھکاوٹ دور کر دی۔

دو تین فرلانگ کے فاصلے پر پہاڑ کے دامن میں درختوں میں گھرا ایک گاؤں موجود تھا۔ اس گاؤں کا نظارہ شفیق کو اپنی بنائی ہوئی جنت کی کسی بھی پینٹنگ سے ہزار گنا زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

نکاح بہت سادگی سے ہوا۔ دولھا سعد اللہ کی طرف سے علی داد، راج ولی اور ایک اور شخص نے شرکت کی جسے گل مینہ نے اس سے پہلے نے نہیں دیکھا تھا۔ نکاح بھی اسی نے پڑھایا۔ گل مینہ کی طرف سے نہیم کے ماں باپ تھے، محلے کے دو تین اور مرد، اور بس۔

فتح خان اس وقت گھر پہ نہیں تھا۔ جب گل مینہ نے اسے سامنے بٹھا کر اس سے اس نئی شادی کی بات کی تو پہلے تو سمجھا ہی نہیں کہ اس کی ماں کہنا کیا چاہ رہی ہے۔ لیکن جب گل مینہ نے دوسرے الفاظ میں دوبارہ سمجھایا تو وہ کچھ دیر تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر دفعتاً اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پاؤں زور سے زمین پر مار کر کہنے لگا، 'نہیں ہونے دوں گا میں، کبھی نہیں ہونے دوں گا۔' حیرت انگیز طور پر اس موقعے پر اس کی لکنت غائب ہو گئی تھی۔ البتہ یہ کہتے کہتے اس کے رخسار آنسوؤں سے گیلے ہو گئے۔ گل مینہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور اس نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگانے کی کوشش کی لیکن وہ پیچھے ہٹ گیا۔

نکاح والے دن بھی گل مینہ رو رو کر فتح کو سمجھانے اور منانے کی کوشش کرتی رہی، لیکن اس نے کوئی بات سن کے نہیں دی۔ آخر وہ چیخ مار کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے پیچھے دروازہ اتنے زور سے بند کر گیا کہ پٹ آپس میں ٹکرا کر لوٹ آئے اور دیر تک جھولتے رہے۔ گل مینہ اس کے پیچھے بھاگی لیکن وہ سرپٹ دوڑتا ہوا پہاڑی سے اتر کر بازار کی طرف چلا گیا۔ نہیم کا باپ جب گھر آیا تو اس نے کافی دیر تلاش کرنے کے بعد فتح کو پاکستانی چوکی کے قریب سے ڈھونڈ نکالا۔ اس نے فتح خان کو بازار سے آدھی افغانستان اور آدھی پاکستان میں واقع کباب کی دکان سے تازہ کباب بنوا کر کھلایا، پیپسی کی بوتل پلوائی اور بجھا بجھا کر اپنے گھر لے آیا۔ نکاح کے وقت فتح خان اپنے گھر میں نہیں بلکہ نہیم کے گھر میں تھا۔

سعد اللہ محسود لمبا تڑنگا اور مضبوط بدن کا مالک تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی صرف چھنگلی اور انگوٹھا بچا تھا، باقی انگلیاں کسی حادثے میں اڑ گئی تھیں۔ وہ شبی خیل محسود قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی عمر چونتیس سال تھی اور یوں وہ گل مینہ سے پورے آٹھ سال چھوٹا تھا۔ اس کا کوئی معمول مقرر نہیں تھا، کبھی دو دن کا کہہ کر جاتا تو دس دن بعد پلٹتا۔ کبھی دو دو ہفتے گھر ہی میں پڑا رہتا۔ البتہ گھر کے سودے کے معاملے میں اس نے کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی اور پہلی تاریخوں ہی میں پورے مہینے کا سودا لے آتا تھا۔

وہ طبیعتاً خاصا کم گو تھا اور صرف مطلب ہی کی بات کرتا۔ 'چائے بنا دو، پانی لے آؤ، کھانا لے آؤ' وغیرہ۔ اپنے ماضی یا موجودہ زندگی کے معمولات کے بارے میں اس کی باتیں اشاروں کنایوں سے آگے نہیں بڑھتی تھیں۔ گل مینہ کو چار مہینوں میں اس کے بارے میں صرف اتنا پتہ چلا کہ کندھے پر راکٹ لانچر رکھ کر فائر کرنے کے ہنر میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے، اور یہ کہ اس کے دائیں گال پر زخم کا جو جھنڈا نما نشان ہے وہ افغانستان میں تورہ بورہ میں امریکیوں کی بمباری کے دوران لگا تھا۔ تاہم اس نے انگلیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ گل مینہ نے ایک آدھ بار پوچھنے کی کوشش کی تو اس نے ٹال دیا۔

سعد اللہ فتح خان سے بھی زیادہ سروکار نہیں رکھتا تھا۔ اس نے صرف ایک بار اس کے بارے میں گل مینہ سے پوچھا تھا کہ اس کی عمر کتنی ہے، اور بس۔ ایک دن وہ نماز پڑھ کر گھر آیا تو فتح خان گھر ہی پر تھا۔ اس نے پوچھا، 'نماز کیوں نہیں پڑھی؟' فتح نے آگے سے ہوں ہاں کر دی۔ 'جاؤ، نماز پڑھ کر آؤ، اب تم بچے نہیں رہے، نماز تم پر فرض ہو گئی ہے، اس کا حساب ہو گا۔'

فتح خان بغیر کچھ کہے باہر نکلا اور خاصی دیر کے بعد گھر لوٹا۔ گل مینہ نہیں جان سکی کہ وہ واقعی مسجد گیا تھا یا پھر بازار کا چکر لگا کر آ گیا تھا۔ وہ دن کے وقت سعد اللہ کے ہوتے ہوئے ادھر ادھر ٹل جایا کرتا تھا، اور رات کے وقت اگر سعد اللہ گھر میں موجود ہوتا تو وہ سکول کی کتابیں پھیلا کر ان میں گم ہو جاتا۔

Scanned with CamScanner

اس بار گل مینہ کو راج ولی اور علی داد کے آنے سے پہلے ہی خبر مل گئی۔ سعد اللہ فوج کے کنوائے پر خودکش حملے میں شہید ہو گیا تھا۔ گل مینہ کو یہ بھی پتہ چلا کہ سعد اللہ نے حملے سے پہلے ایک ویڈیو ریکارڈ کروائی تھی جس میں اس نے اپنی جان قربان کرنے کا عہد کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اسلام کی سربلندی اور اپنے دو بھائیوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے یہ قدم اٹھا رہا ہے۔

گل مینہ کو سب سے زیادہ جس بات کا دکھ ہوا وہ یہ تھی کہ حملے سے پہلے والی رات اس نے گھر ہی پر گزاری تھی لیکن اپنے کسی عمل سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اگلی صبح کیا کرنے جا رہا ہے، حتیٰ کہ صبح جاتے وقت اس نے خدا حافظ کہنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ صرف اتنا تھا کہ وہ اس رات معمول سے کچھ زیادہ خاموش تھا۔ چار پانچ دن غائب رہنے کے بعد وہ گھر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سودا سلف کا بھاری تھیلا تھا۔ وہ ساتھ مرغی بھی لے کر آیا تھا لیکن گل مینہ سے شوربے میں نمک زیادہ پڑ گیا۔ سعد اللہ سر جھکائے کھانا کھاتا رہا۔ بس بیچ میں رک کر تین چار بار پانی پیا اور پھر جا کر خاموشی سے لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ گل مینہ نے بعد میں جب اپنے اور فتح خان کے لیے شوربہ نکالا تب اسے پتہ چلا کہ نمک زیادہ تھا۔ گل مینہ کو حیرت ہوئی کہ وہ کیسے خاموشی سے اتنا نمکین سالن کھا گیا۔ حالانکہ عام طور پر کھانے میں کوئی مسئلہ ہو تو وہ شکایت کرتا تھا۔

رات کو جب اس نے گل مینہ کو اپنے پاس بلایا تو گل مینہ نے سرگوشی میں کھانے میں نمک زیادہ پڑنے کی معذرت کرنا چاہی لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی۔ اس رات اس نے وہ والہانہ پن اور جوش دکھایا جو اس سے پہلے گل مینہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ صبح اذان کی آواز کے ساتھ اٹھی تو صحن پالے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے سعد اللہ کے نہانے کے لیے چولھے پر پانی چڑھایا اور پھونکیں مار مار کر آگ جلانے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس نے 'جلدی جانا ہے، وقت نہیں ہے' کہہ کر منع کر دیا اور ٹھنڈے پانی کے دو لوٹے بدن پر بہا کر شاڈی اوڑھ کر نماز پڑھنے مسجد چلا گیا۔ گل مینہ خود نہائی، اور چائے بنا کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی، محلے میں لوگ جاگ اٹھے، اندھیرا مست رفتاری سے اجالے میں ڈھلتا چلا گیا، حتیٰ کہ سورج کی کرنیں پہاڑ کی

چوٹیوں سے اتر کر صحن میں داخل ہو گئیں، اور صحن میں پالے کے فرش پر سعد اللہ کے قدموں کے نشان گھلتے گھلتے مٹ گئے۔

چھ ماہ گزرے اور ایک دن علی داد دوبارہ آ گیا۔ اب کی بار وہ ایک ازبک مجاہد کا رشتہ لے کر آیا تھا۔

Scanned with CamScanner

جب میرا قافلہ اکیس دن کے جاں گسل سفر کے بعد احمد شاہی قندہار کے صدر دروازے پر پہنچا تو وہاں عجب سماں تھا۔ سارا شہر توپوں کی گھن گرج سے رعشے کے مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔ گولے آتش بازی کے اناروں کی طرح بلند ہوتے تھے اور افق کے اوپر جا کر طلائی فضا میں تحلیل ہو جاتے تھے۔ ان سے تڑپتے ہوئے رنگا رنگ شرارے نکل نکل کر گہری شام کے نیالے آسمان پر نقش و نگار بنا رہے تھے۔ دوسری طرف شہر کے وسط سے نقاروں، شہنائیوں اور ڈھولکوں کی آوازیں اٹھ کر تمام قریے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔

شہر پناہ کے اوپر ہر گز دو گز کے فاصلے پر قندیلیں، دیے اور فانوس روشن تھے جنھیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے کوئی عظیم الشان لشکر کے گھڑسوار ہاتھوں میں مشعلیں لیے یلغار کے حکم کے منتظر ہیں۔ شہر میں داخلے کا پروانہ حاصل کرتے وقت قافلہ باشی نے دربانوں سے استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ شاہی محل میں احمد شاہ ابدالی کے بیٹے مرزا تیمور شاہ کو ولی عہد مقرر کیے جانے کی خوشی میں جشن منایا جا رہا ہے، جس میں شرکت کے لیے قریب و دور سے بادشاہ، شہزادے، سردار، خان، عمائد و خواص آئے ہوئے ہیں۔ اسی تقریب کی خوشی میں دربانوں نے ہمارے سامان کی تلاشی بھی نہیں لی اور بغیر محصول لیے شہر میں داخلے کا پروانہ جاری کر دیا۔

ہم بخارا کے باسی اپنے شہر کو سب سے بڑا اور ترقی یافتہ شہر سمجھتے تھے اور ہمارا خیال تھا کہ مسلم دنیا میں بغداد کے علاوہ اس کے پائے کا کوئی بلد نہیں پایا جاتا، لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ قندہار بخارا سے بڑا تھا۔ دوسرا فرق یہ کہ جہاں بخارا کے اکثر حصے انتہائی پرانے تھے، وہاں قندہار کی گلیوں میں سرائے کی تلاش میں چلتے ہوئے ایسا گمان گزرا جیسے یہ شہر ابھی تازہ تازہ ہی بسایا گیا ہو۔ ہر طرف نئی دو منزلہ، سہ منزلہ عمارتیں، پکی، صاف ستھری گلیاں، اور ادھر ادھر

چلتے ہوئے خوش باش اور وضع قطع سے خوش حال نظر آنے والے لوگ۔ قافلہ باشی نے بتایا کہ یہ شہر احمد شاہ ابدالی نے ابھی حال ہی میں ہندی مہندسوں کی مدد سے بسایا ہے اور اسے اشرف البلاد کہا جاتا ہے۔ یہ سن کر میرے اندر اس شہر کے لیے نفرت بھر گئی۔ ہونہہ، کیا ابدالی اور کیا ابدالی کا اشرف البلاد! یہ کون جانتا ہے کہ اس شہر کی ایک ایک اینٹ بے گناہوں کے خون میں لتھڑی ہوئی ہے۔

ہم لوگ شہر کے مرکزی چوک میں واقع ایک وسیع و عریض سرا میں جا اترے۔ میں نے اپنا اسباب خچر سے اتار کر اسے سرائے کے ملازم کے حوالے کیا اور اپنے ہم سفر سلطان بیگ کے ساتھ ایک حجرے میں جا پہنچا۔ سلطان بیگ پچھلے تین ہفتوں سے میرا شریک سفر تھا اور اب اچھا خاصا دوست بن گیا تھا۔ سلطان بیگ قافلہ باشی اور دوسرے سوداگروں کے ساتھ آتش بازی اور شہر کی چہل پہل دیکھنے چلا گیا لیکن میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ جوتے اتارے، کمر کھولی اور سیدھا بستر پر جا گرا اور گرتے ہی گہری نیند سو گیا۔

رات کسی وقت اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرا بدن پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے ایک عجیب خواب دیکھا تھا۔ میں اٹھ کر سرائے سے باہر نکل آتا ہوں اور ایک دمدمے پر جلتی ہوئی مشعل اٹھا کر پورے شہر کے گلی گلی، مکان مکان کو آگ لگاتا پھر رہا ہوں۔ آن کی آن میں آگ منھ زور آندھی کی طرح شہر کو لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ شعلوں کی لپٹیں شہر پناہ سے بلند ہو جاتی ہیں۔ ہر طرف چیخم دھاڑ مچ جاتی ہے۔ کیا مرد، کیا عورتیں، کیا بچے دہر دہر جلتے ہوئے گھر بار چھوڑ کر چلاتے ہوئے گلیوں میں نکل آتے ہیں۔ پھر کوئی کہتا ہے کہ اس الاؤ میں کہیں بخارا کا خرقہ شریف بھی نہ جل کر راکھ ہو جائے۔ میں دہل جاتا ہوں اور پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے ہوئے لوگوں سے پوچھتا پھرتا ہوں کہ بخارا کا خرقہ کہاں ہے، خرقہ شریف کہاں رکھا ہے؟

میں اپنے بستر پر تکیے کے سہارے بیٹھا رہا۔ ابھی رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایک طرف سے سلطان بیگ کے خراٹوں کی مخصوص آواز آ رہی تھی۔ دروازے کی درز سے باہر جلتی ہوئی

Scanned with CamScanner

مشعل کی روشنی کی ہلکی سی لکیر اندر جھانک رہی تھی۔ فجر کی اذان تک مجھے نیند نہیں آئی۔

صبح ہم سب اپنا اپنا مال لے کر مرکزی بازار پہنچ گئے جو نقار خانہ کہلاتا تھا۔ یہاں شہر کے چار دروازوں باب ہرات، باب کابل، باب شکار پور اور باب عیدگاہ سے نکلنے والی چالیس قدم چوڑی چار بڑی شاہراہیں آکر ملتی ہیں۔ ایک طرف ایک قطار میں حمام واقع ہیں۔ ان کے گرد ایک دائرے میں بازار ہے۔ یہاں میں نے بھانت بھانت کے لوگ دیکھے، جن میں ہندوستانی، ایرانی، طورانی، عرب، ترکمان، چینی، آرمینی، یہودی اور دوسری نسلوں کے لوگ شامل تھے جو آوازے بلند کر کر کے اپنا اپنا سامان بیچ رہے تھے، یا خرید رہے تھے۔

میرا قافلہ بخارا سے چینی ظروف اور ریشمی پارچہ جات لے کر آیا تھا۔ قافلہ باشی نے ایک مناسب مقام دیکھ کر اپنا مال بچھا دیا اور گاہک تلاش کرنے لگا۔ لیکن میں یہاں کپڑوں کے تھان یا برتن بیچنے نہیں آیا تھا، اس لیے میں بھیڑ بھاڑ کا فائدہ اٹھا کر ادھر ادھر ہو گیا اور ادھر ادھر گھوم پھر کر اور لوگوں میں گھل مل کر سن گن لینے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے ایک حجام کی دکان پر جا کر حجامت بنوائی۔ پھر ایک حمام میں جا کر نہایا اور ایک قہوہ خانے میں لوگوں سے گپ شپ لگاتا رہا۔ جب سورج ڈھلنے لگا تب میں اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا۔ ہمارا قافلہ باشی میری گمشدگی سے خاصا پریشان تھا اور اس نے مجھے ڈھونڈنے کے لیے ایک آدمی بھی بھیجا تھا۔ میں نے بہانہ کر دیا کہ بازار کی ہاؤ ہو سے میرا جی گھبرا گیا تھا اور میں جا کر جامع مسجد کے صحن میں لیٹ گیا تھا۔

اگلے دن بھی میں نے یہی کیا اور بازار میں سامان کے پاس ایک پہر بیٹھنے کے بعد شہر کے دوسرے حصوں کی طرف نکل گیا۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ احمد شاہ ابدالی نے بخارا کے علاوہ دوسری کئی اقلیموں کو بھی لوٹا ہے۔ وہ ہندوستان سے بڑی مقدار میں ہیرے جواہرات اور منوں سونا لوٹ لایا تھا، جس کے بل پر اس نے اپنے لیے ایک عظیم الشان دارالحکومت بسانے کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ ماضی کے بڑے بادشاہوں اور فاتحین کی کہانیاں سنتا رہتا تھا، خاص طور پر اسے سکندر یونانی کی فتوحات میں بڑی دلچسپی تھی۔

قندہار کا نقشہ دیکھ کر میں دل ہی دل میں ہنس دیا۔ چور کہیں کا! بڑا آیا سکندر کے نقشِ قدم پر چلنے والا۔ ابدالی نے نہ صرف بخارا سے خرقہ ہتھیایا تھا بلکہ وہ چند تصورات بھی چوری کر کے لے آیا تھا۔ مثلاً اب اسی نقار خانہ بازار کو لے لیں۔ یہ ہو بہو بخارا کے ریگستان بازار کی نقل تھا۔

میں نے دیکھا کہ قندہار کے باسی خاصے ملنسار واقع ہوئے ہیں۔ خاص طور پر وہ اپنے بادشاہ ابدالی کے بارے میں بات کرتے نہیں تھکتے تھے، اور میں اس کے بارے میں معلومات لیتے نہیں تھکتا تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ ہندوستان سے مال و دولت کے علاوہ عظمت بیگ نامی ایک ماہر مہندس بھی لے آیا تھا اور اسے نیا شہر بسانے کا حکم دیا تھا۔ یہ عظمت بیگ بھی ایک الگ ہی چیز تھا۔ اس نے بڑی عرق ریزی سے شہر کا نقشہ تیار کیا، اپنی نگرانی میں بنیادیں کھدوائیں، اور پھر کسی بھوت کی طرح غائب ہو گیا۔

ابدالی بڑا پریشان ہوا اور مہندس کی تلاش میں ادھر ادھر ہرکارے دوڑائے، مگر اس کا کچھ پتہ چلنا تھا نہ چلا۔ چھ ماہ گزر گئے۔ ابدالی مایوس ہو کر ہندوستان یا ایران سے ایک اور مہندس بلوانے کی سوچ رہا تھا کہ عظمت بیگ جیسے غائب ہوا تھا، ویسے ہی اچانک نمودار ہو گیا۔ ابدالی اسے دیکھ کر اس قدر برہم ہوا کہ اسے ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوانے کا حکم جاری کر دیا مگر عظمت بیگ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ اسے شہر کی بنیادوں کو پختہ ہونے کے لیے چھ ماہ کا عرصہ درکار تھا اور اگر وہ اس دوران شہر میں موجود رہتا، تو ابدالی کے عمال یا خود ابدالی جلد بازی کر کے اسے جلد عمارات کی تعمیر کا کام شروع کرنے پر مجبور کر دیتے، اور اس طرح شہر کچی بنیادوں پر استوار ہوتا۔

اسی مہندس نے درگاہ خرقہ شریف کا نقشہ تیار کیا تھا۔ میں خاص طور پر اسے دیکھنے گیا اور جو مجھے توقع تھی یہ عمارت ویسے ہی نکلی۔ بھڑکیلی، ضرورت سے کہیں زیادہ شوخ۔ گہرے فیروزی رنگ کا بڑا گنبد، جسے چار چھوٹے گنبدوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اس عمارت کو دیکھ کر روحانی تسکین یا دلی سکون کی بجائے صرف یہ احساس ہوتا تھا کہ کسی نے اس پر بوریاں بھر کر پیسہ جھونکا ہے اور بس۔

Scanned with CamScanner

ایک قہوہ خانے میں ایک ضعیف شخص نے بتایا کہ ابدالی اس خرقے کو اپنی زندگی ہی میں تعمیر ہونے والے مقبرے میں رکھوانا چاہتا تھا لیکن مولویوں نے اس کی بڑی مخالفت کی اور اسے ارادہ بدلنے پر مجبور ہونا پڑا اور اسے نئی عمارت بنوانا پڑی۔

دور سے خرقہ شریف کی درگاہ دیکھتے دیکھتے میرا دل کٹنے لگا۔ میں واپس لوٹنا چاہتا تھا کہ اچانک میری نظر عمارت کی دیواروں کے پیچھے ایک چٹان پر پڑی۔ میں گھوم کر اس کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہ وہی چٹان ہے جو ہماری درگاہ کے پیچھے تھی۔ ابدالی کی عیاری و مکاری کی جیتی جاگتی تصویر۔ میرا خون رگوں میں اس قدر کھولا کہ میرے منہ سے ایک بلند چیخ نکل گئی۔ آس پاس چلتے ہوئے لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ 'کیا ہوا، کیا ہوا؟' انھوں نے پوچھا، لیکن میں انھیں ٹال کر اپنی سرائے کی طرف چل دیا۔

میں نے دیکھا کہ اکثر لوگ ابدالی کو بڑا رحم دل اور مہربان حکمران سمجھتے تھے۔ ہونہہ! ان جاہلوں کو کیا پتہ کہ ان کا رحم دل حکمران دوسری زمینوں میں کیا گل کھلاتا پھرتا ہے۔ مجھے کچھ لوگوں کا یہ خیال سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ ابدالی جتنا اچھا جنگجو اور سپہ سالار ہے، اس سے بہتر شاعر ہے۔ بہت سے لوگوں کو اس کے اشعار زبانی یاد تھے۔ مجھے پشتو نہیں آتی تھی لیکن سرائے میں ایک نوجوان نے مجھے فارسی میں ترجمہ کر کے اس کے چند اشعار سنائے تھے:

میں دہلی کا تخت و تاج بھول جاتا ہوں
جب مجھے پختونخوا کی حسین چوٹیاں یاد آتی ہیں
اگر مجھے دنیا اور تمھارے درمیان انتخاب کرنا پڑے
تو میں فوراً ہی تمھارے صحرا چن لوں

پتہ نہیں، مجھے تو یہ شاعری کچھ خاص نہیں لگی۔ شاید ترجمہ ٹھیک نہیں ہوا۔

ہمارا قافلہ تقریباً دو ہفتے تک قندہار میں رکا رہا۔ اس دوران میرا یہی معمول رہا کہ صبح فقارخانے کے بازار پہنچتے ہی میں الگ ہو جاتا تھا، اور سارے بازار کے چکر لگا لگا کر معلومات

حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ بخارا کے برعکس قندہار کے لوگ خاصے ملنسار اور گھلنے ملنے والے ثابت ہوئے اور میں نے ایک قہوہ خانے اور مسجد میں کئی دوست بنا لیے۔ ان کے ساتھ بات چیت سے معلوم ہوا کہ ابدالی اپنے بیٹے کی ولی عہدی کا جشن منا کر قندہار چھوڑ کر کوہِ سلیمان میں واقع توبہ معروف نامی ایک جگہ چلا گیا ہے جو قندہار سے تیس فرسنگ دور ہے۔

البتہ یہ جان کر مجھے تھوڑی تشویش ہونے لگی کہ ابدالی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ قہوہ خانے میں ایک شخص نے بتایا کہ کسی جنگ میں اس کی ناک پر ہلکی سی خراش آئی تھی جو اس حد تک بگڑ گئی ہے کہ اس نے پوری ناک کھا لی ہے اور احمد شاہ کو اسے چھپانے کی خاطر ناک پر چاندی کا خول چڑھانا پڑتا ہے۔ مسجد میں ایک نمازی نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے اطلاع دی کہ اس کی ناک میں کیڑے پڑ گئے ہیں جو کھانا کھاتے وقت اس کے منہ میں گر جاتے ہیں۔

احمد شاہ کی ناک میں نے دیکھی تھی۔ وہ اوپر کو اٹھی ہوئی مغرور ناک جسے دیکھ کر ذہن میں کسی متجسس شکرے کا تصور آتا تھا۔ واہ ری قدرت، تیری ستم ظریفی کا بھی جواب نہیں کہ تو نے اس کے گھمنڈ، اس کے تکبر کی جڑ ہی کو دیمک لگوا دی تھی جو اسے اندر ہی اندر سے کھائے چلے جا رہی تھی۔

لیکن اگر احمد شاہ اپنی ناک کے ہاتھوں مارا گیا تو میرا یہ سارا سفر رائیگاں چلا جائے گا۔ مجھے ہر حال میں توبہ معروف پہنچنا ہے۔ لیکن کیسے؟

سردیوں کی آمد آمد تھی، میرے قافلے کو جلد واپس جانا تھا ورنہ راستے کے پہاڑی درے برف سے اٹ کر ناقابلِ گزر ہو جاتے۔

قافلہ باشی اور میرے ساتھیوں نے مجھ پر بڑا زور دیا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں۔ انھیں اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں یکایک کسی اجنبی دیار میں رہنے پر کیوں کمربستہ ہو گیا ہوں۔ آخر انھیں ٹالنے کی غرض سے میں نے ایک افسانہ تراش کر انھیں سنا دیا کہ میں ایک قندہاری تاجر کی بیٹی پر عاشق ہو گیا ہوں اور جب تک اسے اپنا نہ لوں، تب تک یہاں سے نہیں ٹلوں گا۔

Scanned with CamScanner

آخر قافلہ باشی نے میرے اصل منافعے سے تھوڑی زیادہ رقم میری جیب میں ڈال دی، باوجود اس کے کہ میں نے خرید و فروخت میں کچھ زیادہ حصہ نہیں لیا تھا، اور میرا شانہ تھپتھپا کر مایوسی سے سر ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔

شفیق کو ایک لمحے کے لیے احساس ہوا کہ شاید گاؤں کے برجوں کے سوراخوں میں سے کوئی اسے ٹکٹکی باندھ دیکھ رہا ہے۔ وہ ایک خشک درخت کی اوٹ میں ہو گیا، لیکن خاصی دیر تک تکنے کے باوجود اسے کہیں حرکت نظر نہیں آئی۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ جیسے گاؤں میں کوئی نہیں ہے۔

آج دوپہر کے وقت شفیق کو پہاڑ کے دامن میں یہ گاؤں نظر آیا تھا۔ یہ مدرسے والے گاؤں جیسا ہی تھا بس یہ کہ وہاں کے مقابلے میں تھوڑا بڑا تھا اور یہاں اردگرد پتھروں اور گارے کی بنی ایک اونچی نیچی دیوار بھی تھی جو کہیں کہیں سے ڈھے چکی تھی۔ اکثر گھروں کے اوپر برج نظر آ رہے تھے جن کے اوپری حصے میں چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ وہ ڈرتے ڈرتے فصیل کے کھلے دروازے سے گاؤں میں داخل ہو گیا۔ اس نے کتوں کے متوقع حملے کے پیشِ نظر سوکھی ڈالی تلوار کی طرح ہاتھ میں سونت لی تھی، لیکن گاؤں واقعی غیر آباد تھا۔ کہیں کسی ذی روح کے آثار نہیں تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی آسیبی بگولا تمام آبادی کو اڑا کر لے گیا ہے۔

ایک تنگ گلی میں جا کر وہ الجھن میں پڑ گیا۔ زمین پر کارتوسوں کے کھوکھے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک گھر کی مٹی کی دہلیز پر سیاہ پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور کسی کو زمین پر گھسیٹے جانے کے آثار تھے۔ تین چار گھر آگے ایک برج ٹوٹ کر گلی میں یوں گرا تھا کہ راستہ مسدود کر دیا تھا۔

وہ ایک گھر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک تنگ صحن تھا، جس کے دوسری طرف کچا برآمدہ اور اس کے پیچھے ایک تاریک کمرا۔ برآمدے کے ایک طرف لوہے کا تکونا چولھا رکھا تھا جس پر مٹی کی ہانڈی دھری تھی۔ اس نے ہانڈی کے اندر جھانک کر دیکھا لیکن وہ خالی تھی۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ تھوڑی دیر آنکھیں پٹپٹانے کے بعد اسے

Scanned with CamScanner

ایک کونے میں دو تین رضائیاں نظر آئیں۔ اور بس۔ وہ کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ اسے اپنی ٹانگوں پر گیلی محسوس ہوئی۔ اس نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن گیلی بڑھتی گئی۔ وہ برآمدے میں آ گیا اور شلوار کا پائنچہ اٹھا کر پنڈلی کی طرف دیکھا۔ پنڈلی اس طرح سے کالی پڑ چکی تھی جیسے اس نے جراب پہن رکھی ہو۔

'پسوووو!' وہ چیختا ہوا باہر گلی میں آ گیا اور دیوانہ وار دونوں پنڈلیوں کو مل مل کر ان سے پسو ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ پسو اتنی دیر میں گھٹنوں سے اوپر چڑھ کر رانوں تک پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے اسے ابھی تک کاٹا نہیں تھا لیکن جلد پر ان کی سرسراہٹ اسے پاگل کیے دیتی تھی۔ وہ بھاگا بھاگا ندی کی طرف گیا اور ندی کے اندر چھلانگ لگا دی۔ اس نے شلوار اتار کر اسے خاصی دیر پانی میں بھگوئے رکھا۔ پھر خاصی دیر اسے دھوبیوں کی طرح پتھر پر کوٹتا رہا، اور اس وقت تک اسے نہیں پیٹا جب تک اطمینان نہیں ہو گیا کہ وہ پسوؤں سے مکمل طور پر پاک ہو گئی ہے۔ وہ ندی سے دوبارہ گاؤں کی طرف چل پڑا، لیکن آدھے راستے ہی میں رک گیا۔ واپس آیا اور قمیص اتار کر اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا۔

اب وہ کمروں کے اندر داخل ہونے سے گریز کر رہا تھا۔ بس دروازے میں سے جھانک کر دیکھ لیتا کہ اندر کوئی کام کی چیز تو نہیں۔ اکثر گھروں کا نقشہ اور ساز و سامان وہی تھا جو وہ پہلے گھر میں دیکھ چکا تھا۔ ایک چھوٹا سا صحن، اس کے بعد ایک تنگ برآمدہ اور اس کے پیچھے ایک یا دو تاریک کمرے۔ دالان کے ایک کونے میں چولھا۔ چھتیں اتنی نیچی تھیں کہ وہ انھیں آسانی سے ہاتھ اونچا کر کے چھو سکتا تھا۔ کسی گھر میں کھڑکی نہیں تھی اور نہ کھانے پینے کی کسی چیز کے آثار۔ شفیق نے اپنے بچپن اور لڑکپن میں گاؤں میں شدید غربت دیکھی تھی۔ شہر میں بھی کئی بار ایسا موقع آیا تھا کہ ایک وقت کا کھانا کھا لیا لیکن دوسرے وقت کا پتہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کا انتظام کہاں سے ہو گا۔ لیکن اس نے کہیں ایسی غربت نہیں دیکھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ لوگ گزارا کیسے کرتے ہوں گے۔ یہ لوگ اگر پنڈی میں اس کے گھر آ جائیں تو گھر کا ساز و سامان دیکھ کر شفیق کو

کوئی نواب رئیس سمجھنے لگیں۔

ایک گھر سے اسے ایک میلی چکٹ گدیلی مل گئی جو کسی وقت سرخ رنگ کی رہی ہو گی۔ اس نے گدیلی پھاڑ کر اپنے زخمی بائیں پاؤں پر یوں کس کر باندھ دی کہ تھوڑی بہت روئی پاؤں کے نیچے رہے۔ ایک اور صحن میں لوہے کے تار پر بارشوں کی ماری پھٹی پرانی قمیص نظر آئی تو اس نے اٹھا کر کاندھے پر ڈال دی کہ رات کو سردی سے بچاؤ میں مدد دے گی۔

آخر گاؤں کے مغربی کونے میں ایک نسبتاً کشادہ گھر میں اسے کمرے کے اندر مکئی کے مٹھی بھر دانے دالان کے فرش پر گرے نظر آئے جو اس نے اٹھا کر منہ میں ڈال لیے۔ ایک چوبارے کی مغربی دیوار پر محراب بنی تھی، اور اندر بڑے کمرے میں فرش پر خشک گھاس بچھی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید یہ مسجد ہے۔ محراب کے ساتھ ایک طاقچہ بنا ہوا تھا جس میں کپڑے کے غلافوں میں بند دو تین کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ باہر صحن میں مٹی کے ایک کوزے میں نہ جانے کب کا پانی پڑا ہوا تھا۔ شفیق کی ہمت دوبارہ ندی تک جانے کی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے کوزہ منہ سے لگا کر وہ پانی آبِ زم زم کی طرح غٹا غٹ پی لیا۔

اب وہ اس الجھن میں تھا کہ اگلی رات کہاں گزارے۔ ایک صورت یہ تھی کہ توکل کر کے چل پڑے اور دیکھے کہ اندھیرے سے پہلے کہاں پہنچ سکتا ہے۔ دوسری یہ کہ اسی گاؤں کی عافیت میں رات بسر کی جائے، اور کل صبح سورج نکلنے سے پہلے پہلے چل دیا جائے، شاید شام تک کسی سڑک یا کسی بڑے قصبے تک رسائی ہو جائے۔

کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے دروازے کو کنڈی لگا کر بند کر دیا اور مسجد کے لمبے برآمدے میں چٹائی کے خشک پتوں پر لیٹ گیا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر سویا ہو گا کہ دھم کی آواز سن کر جاگ گیا۔ پھر ایک اور دھم ہوئی۔ باہر گاؤں میں کچھ ہو رہا تھا۔ اب کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ باہر جا کر دیکھوں کہ کیا ہو رہا ہے یا یہیں لیٹا رہوں؟ اگر گاؤں کے لوگ مجھے پکڑ کر قید کر لیں اور تاوان کا مطالبہ کر دیں تو کیا ہو گا؟ مدرسے والوں سے تو کسی نہ کسی طرح

Scanned with CamScanner

جان چھوٹ گئی لیکن یہ لوگ نہ جانے کیا سلوک کریں۔ کیا پتہ آگے کسی کو بیچ دیں؟ لیکن میں تو مسجد کے اندر موجود ہوں۔ ان قبائلیوں میں پناہ دینے کا بڑا رواج ہوتا ہے۔ کیا وہ یہ دعویٰ کرے کہ اسے خدا کے گھر میں ہونے کے ناتے اس کی پناہ حاصل ہے؟

اسی ادھیڑ بن میں اسے مسجد کے باہر سے کسی کے اونچی آواز میں بولنے کی آواز آئی تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ باہر کوئی شخص پشتو نہیں بلکہ پنجابی میں بات کر رہا تھا۔ 'ادھر کدھر جا ریا اے چودھری، اتھے سیدھے تے کر کے پا۔' جواب میں کسی نے اسے ماں کی گالی دی اور پھر تین چار لوگوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا دروازے کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس نے جھری سے جھانک کر دیکھا۔ گلی کے کونے میں تین مرد ایک دیوار کے قریب بیٹھے کچھ کر رہے تھے۔ انھوں نے کسی قسم کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ خاکی رنگ کی عام فوجی وردیوں سے مختلف ان وردیوں پر گہرے سبز اور بھورے رنگ کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے ماچس جلا کر ایک رسی کو آگ دکھائی اور تینوں تیزی سے پیچھے ہٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک زوردار دھماکہ ہوا اور مکان ڈھیر ہو گیا۔ دھول ہوا میں بلند ہوئی اور پھر اس نے آہستہ سے نیچے اتر کر ملبے کو چادر کی طرح ڈھک لیا۔ تینوں دوبارہ برآمد ہوئے اور مسجد کی طرف آنے لگے۔ ان کے کندھوں پر خوفناک قسم کی بندوقیں تھیں اور کمروں پر بھی خاصا اسباب لدا ہوا تھا۔ قریب آ کر انھوں نے دروازہ ہلایا۔ لیکن وہ شفیق نے اندر سے بند کر رکھا تھا۔ انھوں نے دروازے کو زور سے لات ماری تو کنڈی اکھڑ گئی اور دروازہ چوپٹ ہو گیا۔ شفیق اگر عین وقت پر تیزی سے ایک طرف کو نہ ہو جاتا تو پٹ اس کے منہ پر آ کر لگتے۔ شفیق کو بالکل سامنے کھڑا دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئے اور ادھر ادھر ہو کر دیواروں سے لگ گئے اور اپنی بندوقیں کندھوں سے اتار کر شفیق پر تان لیں۔

ایک نے چیخ کر کہا: 'ایک بندہ یہاں پر ہے۔' تھوڑی ہی دیر میں ادھر ادھر سے مزید فوجیوں نے آ کر اسے ہر طرف سے گھیر لیا۔ وہ مسجد کی دہلیز پر دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کیے کھڑا تھا۔

دو نے آگے بڑھ کر اس کی تلاشی لی اور جیبیں الٹ کر پھل گرا دیے۔ شفیق کی جیبیں ان کے رس سے داغ دار ہو گئی تھیں۔

'کون ہو تم، اور یہاں کیا کر رہے ہو؟' ایک فوجی نے پشتو میں پوچھا۔ وہ مناسب جواب سوچ رہا تھا کہ اس نے کھینچ کر ایک تھپڑ رسید کیا کہ وہ گرتے گرتے بچا۔ اتنے میں مختلف وردی پہنے ہوئے ایک شخص آیا۔ باقی فوجی باادب ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔

اسے اپنی کہانی کپتان صاحب کو سمجھانے میں خاصی دیر لگ گئی۔ کپتان بڑے انہماک سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ 'سر، آپ مجھے سڑک تک چھوڑ دیں گے؟ میرے گھر والے بہت پریشان ہوں گے، انھیں کچھ پتہ نہیں کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں،' اس نے اپنے لہجے میں ہر ممکن لجاجت ڈال کر درخواست کی۔ 'یقین جانیں میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔ چاہیں تو مجھ سے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھوا لیں۔ یہ مسجد ہے، یہاں اندر قرآن پڑا ہوا ہے۔'

'اس کی ضرورت نہیں ہے شفیق، مجھے تمھاری کہانی پر یقین آ گیا ہے' کپتان نے کہا۔ 'تمھارے کپڑوں پر رنگوں کے دھبے پڑے ہیں اور یہاں سے پندرہ کلومیٹر دور ایک ڈرون حملہ بھی ہوا ہے۔ جو تم نے بتایا ہے اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے کچھ ساتھی تم سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہیں گے۔ تم فکر نہ کرو، وہ تمھیں خود پنڈی لے جائیں گے۔ سٹاف!' اس نے مڑ کر کسی سے کہا۔ 'اس کے ہاتھ باندھ کر گاڑی میں بٹھا دو۔'

58

دروازے پر دستک ہوئی۔ گل مینہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ عشا کی اذان ہو چکی ہے۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟

'میں محمد صدیق ہوں خالہ، فتح خان کا دوست، ہم دونوں اکٹھے مدرسے میں پڑھتے تھے۔ میں تمھارے لیے خبر لے کر آیا ہوں۔'

گل مینہ نے تیزی سے دروازے کے پٹ وا کر دیے۔ دہلیز پر ایک پندرہ سولہ سال عمر کا لڑکا کھڑا تھا جس کے بال سفید پگڑی میں سے نکلتے ہوئے گردن تک آ رہے تھے۔ اس نے کندھے پر سیاہ چار خانے والی چادر ڈال رکھی تھی جس میں چہرہ آدھا چھپایا ہوا تھا۔ گل مینہ تھوڑا پیچھے ہٹی تو اس نے اندر آ کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا، اور تقریباً سرگوشی میں بولا:

'گھر میں کوئی ہے تو نہیں؟ کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ میں یہاں آیا ہوں۔'

'گھر میں کوئی نہیں ہے،' گل مینہ نے کہا۔

'ابھی کوئی آئے گا تو نہیں؟'

'نہیں، کوئی نہیں آئے گا، تم بتاؤ کیا بات ہے، فتح خان کہاں ہے، وہ ٹھیک تو ہے نا؟'

'خالہ بری خبر لایا ہوں، لیکن تم وعدہ کرو، کہ کسی کو بتاؤ گی نہیں، ورنہ میں خود مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔'

'سب سے پہلے تم بتاؤ کہ فتح خان ٹھیک ہے یا نہیں، اس کے بغیر میں تمھاری کوئی بات نہیں سنوں گی۔' گل مینہ نے کہا۔

'اس وقت تک ٹھیک ہی ہے خالہ لیکن آگے کی کچھ خبر نہیں۔ وہ شوال کے ایک مدرسے میں پڑھتا ہے، لیکن اب وہ فدائی بن گیا ہے۔ وہ میرا دوست ہے، جگری دوست۔ اسی

نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ میں بڑی مشکل سے چھپتا چھپاتا یہاں پہنچا ہوں۔'

'شوال میں کس جگہ ہے وہ مدرسہ؟ مجھے اس کے پاس لے چلو، نہیں تو پتہ بتا دو۔ میں نے آٹھ مہینوں سے اس کی شکل نہیں دیکھی۔ آنکھیں ترس گئی ہیں میری۔ اس نے بھی اتنا نہیں کیا کہ اپنی دکھی ماں کو اپنے زندہ مردہ ہونے کی اطلاع ہی بھجوا دیتا، چٹھی ہی لکھ دیتا۔'

'خالہ، مدرسے میں کسی کو خط یا اطلاع بھیجنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور اب تو وہ فدائی بن چکا ہے، اس سے کسی کا رابطہ ممکن نہیں رہا۔ لیکن وہ تم کو اور اپنے ابا کو ہر وقت یاد کرتا ہے۔ اپنے گھر کو بہت یاد کرتا ہے۔ بعض اوقات رات کو روتا ہے۔'

گل مینہ نے صدیق کو برآمدے میں پڑی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن صدیق چارپائی پر نہیں بیٹھا بلکہ چولھے کے قریب پڑی چوکی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا اور چادر کندھے سے اتار کر گود میں رکھ لی۔ اس کی نظر دیوار پر لگے فٹ بال ٹیم کے گروپ فوٹو پر پڑی۔ 'اچھا، یہ تصویر میرے پاس بھی تھی۔ خالہ، یہ دیکھو، یہ میں ہوں، فتح خان کے پیچھے دوسرے نمبر پر،' صدیق نے انگلی سے اشارہ کر کے بتایا۔ 'ہم دونوں ایک ہی کلاس میں تھے اور فٹ بال بھی اکٹھے کھیلتے تھے۔ لیکن ایک سال پہلے میں نے سکول چھوڑ کر مدرسے میں داخلہ لے لیا تھا، وہیں میری ملاقات فتح سے ہوئی، پھر مدرسے پر ڈرون حملہ ہو گیا، خطیب صیب مارے گئے۔'

صدیق نے بھورے رنگ کے کپڑے اور شکنوں سے بھری کالی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے رخساروں پر مکئی کے بھٹے کی طرح دانے نکلے ہوئے تھے اور چہرہ چکناہٹ سے اس قدر بھرپور تھا کہ لگتا تھا منہ پر ہاتھ پھیرا تو روغن سے لتھڑ جائے گا۔

'خالہ فتح کی زندگی خطرے میں ہے،' صدیق دھیمی آواز میں جلدی جلدی بول رہا تھا۔ 'اس نے مجھے یہاں کا پتہ دیا تھا اور کہا تھا کہ میں اس کی خبر ملنے کے بعد جا کر تم کو بتاؤں، لیکن مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں پہلے ہی آ گیا۔'

'میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا،' گل مینہ نے کہا۔ 'آخر وہ ہے کہاں اور خود کیوں نہیں

آتا؟ کم از کم شکل تو دکھا جائے، آخر اس کی بے چاری ماں نے کیا بگاڑا ہے اس کا؟'

'فدائیوں کو کسی سے رابطے کی اجازت نہیں ہوتی خالہ۔ میری بات غور سے سنو، مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتا تھا۔ ہر وقت آپ کی اور اپنے مرحوم ابا کی باتیں کرتا رہتا تھا اور روتا رہتا تھا۔ اس نے مجھے خاص طور پر کہا کہ میں آپ کو یہ باتیں جا کر بتاؤں کہ وہ آپ سے بہت شرمندہ ہے اور معافی کا طلب گار ہے۔ وہ فدائی بھی اسی لیے بنا ہے ایک تو اپنے باپ کا بدلہ لے سکے اور دوسرا یہ کہ آپ کو آخرت میں اعلیٰ مقام اور بلند درجات نصیب ہوں۔ وہ میرا بہت اچھا دوست تھا اسی لیے میں آپ کو یہ سب کچھ بتانے کے لیے اتنی دور سے آیا ہوں۔'

گل مینہ کھلے منہ سے یہ سب کچھ سنتی رہی۔ آخر اس کے منہ سے نکلا، 'میں تم سے بار بار کہہ رہی ہوں، مجھے مدرسے کا پتہ بتا دو، میں ابھی اسے لینے کے لیے جا رہی ہوں۔'

'خالہ تم وہاں نہیں جا سکتیں۔ وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ خطیب صیب تو اب مر گئے ہیں لیکن لڑکے کہتے ہیں کہ انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بہت لوگوں کو قتل کیا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے بندہ مار دیتے ہیں۔ انھیں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔'

'مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، بے شک مار دیں۔ میرے لیے جینا اور مرنا ایک برابر ہے۔ میں دیکھتی ہوں کون ہوتا ہے اسے وہاں رکھنے والا اور فدائی ودائی بنانے والا۔'

'اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے خطیب صیب نے فدائی بنانے پر آمادہ کیا تھا۔ خطیب صیب ہمارے مدرسے کا مہتمم تھا اور سب سے بڑا عالم تھا۔ خطیب صیب نے فتح کو اس کے ابا کے مرنے کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اگر وہ اس کا بدلہ لینا چاہتا ہے تو خطیب صیب اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ خود خطیب صیب پچھلے ہفتے امریکی ڈرون حملے میں شہید ہو گیا، ہمارے بہت سے استاد اور طالب بھی مارے گئے۔'

صدیق چوکی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ 'کسی کو بتانا نہیں، لیکن وہ فدائی مہم پر گیا ہے، ایک دو دن کے اندر اندر حملہ کرے گا۔ فدائی اپنے سینے پر خودکش جیکٹ باندھ کر جاتے ہیں، ڈوری کھینچنے

سے بارود پھٹ جاتا ہے، بڑی تباہی ہوتی ہے۔ فدائی کے بدن میں صرف سر بچتا ہے جو دھماکے سے اچھل کر بیس گز دور جا کر گرتا ہے۔ حملے سے پہلے فدائی کو نیکر لگایا جاتا ہے، اور نیند اور سکون کی گولی بھی دیتے ہیں۔ فتح خان بھی ایک ہفتے سے روزانہ دو بار گولی کھاتا ہے۔ اس کے علاوہ خطیب صیب کہیں سے ایک پینٹر لے کر آئے تھے، اس نے مدرسے کے ایک کمرے کی دیواروں پر جنت کی تصویریں بنائی ہیں، پہاڑ، باغ، جھیل وغیرہ۔ خودکش کو یہ سب کچھ دکھا کر کہا جاتا ہے کہ جنت میں اس طرح کے باغ تمھیں ملیں گے، بلکہ فتح خود اس پینٹر کے ساتھ کام کرتا رہا ہے۔'

صدیق نے بتایا کہ خودکش حملہ آور تیار کرنے میں چار پانچ لاکھ روپیہ خرچ آتا ہے، اس میں فدائی کے لواحقین کو لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ دیا جاتا ہے، بقیہ پیسوں میں تربیت کار اور ادارے کا حصہ ہوتا ہے جب کہ جیکٹ صرف چند ہزار میں بن جاتی ہے۔ یہ سارا کام بہت منظم انداز میں کیا جاتا ہے اور اس کی منصوبہ بندی میں بہت سے لوگ شامل ہوتے ہیں جو ہدف کا انتخاب کرنے سے لے کر فدائی کی تربیت اور اسے حملے کے مقام تک پہنچانے کا انتظام کرتے ہیں۔

گل مینہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صدیق کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی، 'اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مجھے یہ باتیں لڑکوں سے معلوم ہوئی ہیں جو انھوں نے ادھر ادھر سے سن رکھی ہیں۔ خالہ، یقین کرو کہ میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر تم کو بتا رہا ہوں، اس لیے یہ بات خود تک ہی رکھو، اگر کسی کو پتہ چل گیا تو تم سوچ نہیں سکتی کہ میں کتنی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔'

'میں تم سے بار بار پوچھ رہی ہوں، تم بتاتے کیوں نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔'

'خالہ، میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ شوال کے مدرسے میں پڑھتا تھا لیکن اب وہ مدرسے میں نہیں ہے۔ فدائی کو کس جگہ جانا ہے اور کس پر حملہ کرنا ہے، یہ بات سب سے چھپائی جاتی ہے۔ خود فتح خان کو پتہ نہیں ہوگا کہ اس نے کہاں جانا ہے۔ لیکن مدرسے میں ایک لڑکے نے

Scanned with CamScanner

دروازے کے پیچھے سے نصیب گل کو بات کرتے ہوئے سن لیا تھا کہ وہ فتح خان کو لے کر پنڈی جا رہا ہے۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو وہ اس وقت پنڈی کے راستے میں کہیں ہوگا۔'

یہ کہہ کر صدیق اٹھ کھڑا ہوا۔ گل بینہ روکتی رہی لیکن اس نے دروازہ کھول کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر تیزی سے باہر نکل کر اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔

توبہ معروف جانے کے لیے سفر کی تیاری و انتظام میں دس دن لگ گئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس علاقے میں کسی قافلے کے بغیر جانا ناممکن تھا اور ادھر جانے کے لیے کوئی قافلہ مل نہیں رہا تھا۔ آخر جب میں نے تہیہ کر لیا کہ اکیلا ہی نکل پڑوں گا، کہ مجھے باب شکار پور کے باہر اس طرف جانے والے چند لوگوں کا گروہ مل گیا۔

یہ پہاڑوں میں گھرا ہوا چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں ابدالی کے ننھیال کی زمینیں تھیں اور اس نے اپنی ماں کے ساتھ بچپن کا بڑا حصہ وہاں گزارا تھا۔ وہاں اس نے ایک عالیشان محل تعمیر کروا رکھا تھا اور ہندوستان پر چڑھائی کی مہمات کے درمیانی وقفوں میں جب بھی اس کا دل قندہار کے شور و غل اور ہنگاموں سے اوب جاتا تھا تو وہ یہاں ڈیرا ڈال دیتا تھا۔

توبہ معروف کے چند مقامی دکاندار قندہار سامانِ خرید نے کے لیے آئے ہوئے تھے اور آج واپس جا رہے تھے۔ میں نے انھیں کہا کہ میں امیر سمرقند کی جانب سے احمد شاہ ابدالی کے لیے خصوصی پیغام لے کر آیا ہوں اور میرا قافلہ قندہار پہنچنے سے قبل ہی لٹ گیا ہے، تمام ساتھی ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے، صرف میں ہی اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ معلوم نہیں انھیں میری کہانی پر یقین آیا یا نہیں، بہرحال انھوں نے اس سلسلے میں مزید استفسارات نہیں کیے اور مجھے اپنے ساتھ سفر کی اجازت دے دی۔

سفر کے تیسرے دن، جب ہم توبہ معروف سے ایک دن کی مسافت پر رہ گئے تھے، میں نے سپاہیوں کی ایک لمبی قطار سامنے والے پہاڑ سے سست روی سے اترتے دیکھی۔ اس لشکر کے ہراول دستے نے ہاتھوں میں رنگ رنگ کے بلند و بالا علم اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کی پیچھے شاندار گھوڑوں پر سوار دستہ تھا جو آہستہ روی سے پیادہ سپاہیوں کے قدم سے قدم ملائے چلا آ رہا

Scanned with CamScanner

تھا۔

میرے ہم سفروں میں سے ایک نے کہا: 'واہ بھئی مان گئے تمھاری کرامتوں کو۔ تم جس سے ملنے جا رہے تھے، وہ خود چل کر تمھارے پاس آ گیا ہے۔'

معلوم ہوا کہ یہ احمد شاہ کا قافلہ ہے جو واپس قندہار جا رہا ہے۔ میں نے فوری طور پر اپنا سفر موقوف کر دیا اور شاہی قافلے سے جا ملا۔ لیکن کئی حکام اور عمال سے بار بار التجا کرنے اور امیر سرفند کے غضب کی دھمکیاں دینے کے باوجود بھی میری رسائی احمد شاہ تک نہیں ہو سکی۔ مجھے بتایا گیا کہ شاہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ملنے جلنے، حتیٰ کہ بولنے سے بھی قاصر ہو گیا ہے اور اس کے پاس اپنے مقرب خاص خواجہ سرا یاقوت خان کے سوا کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ یاقوت کو اشاروں سے، یا پھر لکھ کر احکامات جاری کرتا ہے، جو یاقوت خان متعلقہ حکام کے حوالے کر دیتا ہے۔ یاقوت خان سے ملنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ بمشکل کماندار مکرم خان کی وساطت اور ذاتی دلچسپی سے مجھے یاقوت خان سے ملنے کا موقع فراہم ہو گیا۔

'مجھے یہ بات سن کر بے حد صدمہ پہنچا ہے کہ معزز سفیر کو سلطنتِ افغانستان میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑا،' چربیلے خواجہ سرا نے اپنی گول گول آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے وسیع و عریض خیمے میں زربفت کے موٹے تکیوں پر نیم دراز تھا، اور اس کے ہاتھ میں موٹے موٹے منکوں کی مالا تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں، اس کے تکلم اور لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ اس شخص پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم نہیں ابدالی کیوں اسے اس قدر قریب رکھتا تھا کہ اسے عملاً وزیرِ اعظم کا درجہ حاصل تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران اس کے خیمے میں اعلیٰ حکام کی ایک قطار دوزانو بیٹھی تھی، اور ان کے انداز سے لگتا تھا کہ یاقوت خان کا بولا ہوا ہر لفظ حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں ابدالی سے ملنے کی خاطر کسی اور درباری یا عہدے دار سے رابطہ کرنے کی بجائے اس خواجہ سرا کے آگے دامن پھیلانے پر مجبور تھا۔

'میں محترم مہمان کو یقین دلاتا ہوں کہ قندہار پہنچتے ہی مجرموں کی گرفتاری اور عبرت ناک سزا کے احکامات جاری کر دیے جائیں گے،' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ 'البتہ جہاں تک شہنشاہ سے ملاقات کا سوال ہے تو مجھے افسوس ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔'

اس مقربِ شاہی نے سر پر سنہرے رنگ کا پگڑ باندھ رکھا تھا جو اس کے سر سے کم از کم دوگنا بڑا تھا۔ داڑھی کی جگہ اس کے چہرے پر فقط چند ہی بال نظر آ رہے تھے۔ اس کی آواز خراش آلود سی تھی، جیسے اس کا گلا خراب چلا آ رہا ہو۔ وہ ہر لفظ رک رک کر یوں بول رہا تھا جیسے یہ پرکھ رہا ہو کہ کہیں کوئی اس کی کسی بات کا غلط مطلب نہ لے لے۔

'میں اس کرم نوازی کا ذاتی طور پر شکر گزار ہوں،' میں نے کہا۔ 'البتہ میرے اس سفر کا مقصد عالم پناہ احمد شاہ سے ملاقات کر کے انھیں امیر کا پیغام پہنچانا تھا۔ اگر ایسا ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ میرے مرحوم ساتھیوں کی جانیں اکارت نہیں گئیں بلکہ اپنے امیر کی اطاعت میں صرف ہوئیں۔'

'جیسا کہ میں نے عرض کیا، شہنشاہ کی صحت اس کی اجازت نہیں دیتی، اور انھوں نے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ میرے علاوہ کوئی اور ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو، حتیٰ کہ سپہ سالار مومن الدولہ کو بھی اذنِ باریابی نہیں۔ البتہ آپ اپنا پیغام مجھے دے دیں، میں اسے شہنشاہ کے گوش گزار کر دوں گا۔'

'مجھے حکم ہے کہ میں صرف شہنشاہ ہی کو پیغام دوں۔ ان کے علاوہ کسی اور سے بات کرنے کا مجھے اختیار نہیں ہے، اگر میں ایسا کروں گا تو اپنے امیر کے حکم سے روگردانی کا مرتکب ٹھہروں گا،' میں نے کہا، لیکن مجھے صاف لگ رہا تھا کہ یہ شاطر خواجہ سرا مجھے شہنشاہ کے پاس نہیں پھٹکنے دے گا۔ مجھے کچھ اور سوچنا ہوگا۔

'ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس بات چیت کو مزید آگے بڑھانا محض وقت کا ضیاع ہوگا،' یاقوت نے کہا اور ساتھ ہی اپنے قریب بیٹھے ہوئے افسرِ سفارت کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ

Scanned with CamScanner

مجھے خیمے سے باہر تک چھوڑ آئے۔ مجھے رخصت کرنے کے لیے خود اس نے اپنی نشست سے اٹھنے کی زحمت تک نہیں کی۔

لیکن یاقوت کے خیمے سے نکلتے نکلتے میرے ذہن میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک منصوبے کا نقشہ تیار ہو گیا تھا۔

گل مینہ اس سے پہلے کبھی پاکستان نہیں گئی تھی۔ اس نے صبح اٹھ کر انتظار کیا کہ بازار کھل جائیں۔ سورج خاصا اوپر چڑھ آیا تو اس نے صحن میں سے دیکھا کہ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی ہے۔ اس نے اپنی تھری ناٹ تھری برقعے کے اندر چھپائی، بیگ میں دو جوڑے کپڑے رکھے، پھر اسے کچھ یاد آیا تو بڑے بکسے کی جیب سے خرقہ شریف سے مس ہونے والی پگڑی کا وہ ٹکڑا نکال لیا جو پچھلے دس سال سے اسی بکسے میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے ٹکڑا اپنی بغل والی جیب میں رکھ لیا اور دروازے کو تالا لگا کر بازار کی طرف روانہ ہو گئی۔ بازار کے مشرقی کونے میں اسلحے والوں کی دکانیں تھیں، جن میں سے دو کھلی ہوئی تھیں۔ پہلی دکان کے باہر 'سپین غر اسلحہ فروش' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ گل مینہ نے برقعے کے اندر سے تھری ناٹ تھری نکالی تو دکان کے مالک کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ خاصی دیر رائفل کو الٹتا پلٹتا رہا۔ میگزین کا حصہ الگ کر دیکھا، نالی کے اندر جھانکا، اور پھر ساتھ والے دکاندار کو آواز دے کر بلا لیا۔ اس نے بھی خاصی دیر تک تفصیلی معائنہ کیا اور پھر پہلے دکان دار کو رائفل تھما کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہہ کر چلا گیا۔

'بہن جی، یہ رائفل بہت پرانی ہے۔ آج کل اس کا رواج نہیں ہے۔'

'پرانی ہے تو کیا ہوا، اس کا نشانہ آج بھی بالکل درست ہے۔ بس جلدی سے اس کی قیمت لگا دو، مجھے بہت دور جانا ہے، دیر ہو رہی ہے،' گل مینہ نے کہا۔

دکان دار نے ایک بار پھر رائفل کے پیچھے کندہ حروف پڑھنے کی کوشش کی۔ 'یہ کم از کم سو سال پرانی ہے۔ آج کل لوگ اس قسم کی رائفلیں پسند نہیں کرتے۔ میں اس کے زیادہ سے زیادہ دس ہزار دے سکتا ہوں۔' اس نے بندوق میز پر رکھ دی۔

'ٹھیک ہے، جلدی کرو، مجھے جانا ہے،' گل مینہ نے کہا۔

Scanned with CamScanner

دکان دار نے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے موٹا بٹوہ نکالا اور جلدی جلدی نوٹ گن کر گل مینہ کے حوالے کر دیے۔ وہ نوٹ بیگ میں ڈال کر اڈے کی طرف آئی اور وانہ جانے والی ڈاٹسن میں بیٹھ گئی۔ اونچی نیچی پہاڑیوں پر بل کھاتی ہوئی پکی سڑک پر چلتی ہوئی ڈاٹسن نے اسے ایک گھنٹے میں وانہ پہنچا دیا۔ وانہ اڈے سے اسے ٹانک جانے والی منحہ والی پھٹیچر بس مل گئی جو سواریوں سے اٹاٹ بھری ہوئی تھی۔ ایک آدمی نے اپنی بیوی کے پہلو سے اٹھ کر اس کے لیے سیٹ خالی کر دی۔

ٹانک میں اسے اپنی نند حسن پری کا گھر ڈھونڈنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ موئی نیکہ آبسنے کے بعد ایک بار زرجانان اسے اور فتح خان کو یہاں لے کر آیا تھا اور وہ خود زرجانان کی موت پر تعزیت کے لیے انگورا ڈاڈا آئی تھی۔ اس کے علاوہ ان دونوں کے درمیان رابطہ نہیں رہا تھا۔ حسن پری کا خاوند یہاں کی عدالت میں کسی وکیل کے منشی کا کام کرتا تھا اور اس نے اچھا اور پکا مکان بنا رکھا تھا۔ گل مینہ نے نند کو صرف اتنا بتایا کہ فتح خان گھر سے بھاگ کر کہیں چلا گیا تھا مگر اب اس کا پتہ مل گیا ہے اور وہ پنڈی میں ہے۔ حسن پری نے بہت کہا کہ اس کا خاوند پشاور گیا ہوا ہے، دو دن بعد واپس آ کر خود جا کر فتح خان کو لے آئے گا، اور گل مینہ اتنا لمبا سفر نہ کرے۔ 'میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اکیلے وہاں کس کے پاس جاؤ گی، رات کہاں گزارو گی؟ تم انجان ہو، تمھیں اردو بھی ٹھیک سے نہیں آتی۔' لیکن گل مینہ یہی دہراتی رہی، 'میرے پاس وقت نہیں ہے، بہت دیر ہو جائے گی۔'

ابھی رات کا اندھیرا پوری طرح سے زائل نہیں ہوا تھا کہ گل مینہ حسن پری اور اس کی ساس کو سوتا چھوڑ کر ایک کلومیٹر پیدل چل کر اڈے پہنچ گئی اور بنوں جانے والی پہلی ہائی ایس وین میں دوسری سیٹ پر کھڑکی کے ساتھ لیک لگا کر بیٹھ گئی۔

وہ شمالی وزیرستان کی وادیِ شوال میں صنوبر اور دیودار کے درختوں میں گھرے اونچے برفانی پہاڑوں سے پگھل کر آنے والے گنگناتی شوال ندی کے کنارے پلی بڑھی تھی۔ اسے

خاصے دنوں سے اپنے علاقے اور بچپن کی یاد نہیں آئی تھی لیکن ڈیرہ اسماعیل خان کے ٹیڑھے میڑھے بازاروں سے گزرتی ہوئی وین کے سرد شیشے سے گال لگتے ہی اسے ٹھنڈا ٹھنڈا شوال یاد آ گیا۔ سردیوں میں چھت پر برف جمع ہوتی جاتی اور اس کے بھائی باری باری جا کر چھت سے برف گراتے اور پھر جلدی سے نیچے آ کر کر چولھے کے آگے اکڑوں بیٹھ کر ہاتھ تاپتے۔ گل مینہ بھی ضد کرتی کہ میں بھی جا کر برف گرا آتی ہوں، تو اماں کہتیں، 'ارے چھوڑو، یہ بھاری کام مردوں کے ہیں، انھی کو کرنے دو، ہم لڑکیاں کیوں ٹھنڈ میں باہر جا کر اپنی ہڈیاں جما ئیں، ہم تو شہزادیوں کی طرح آرام سے گرم گرم آگ کے پاس بیٹھے رہیں گے۔' پھر اماں چولھے کی دہکتی راکھ میں دو تین موٹے موٹے آلو دبا دیتی۔ جب وہ پک کر تیار ہوتے تو اماں اسے نکال کر دیتیں۔ آلو کا اوپر حصہ انڈے کے چھلکے کی طرح سخت ہوتا تھا، البتہ اندر سے نرم گرم لذیذ آلو پر نمک مرچ چھڑک کھانے کا وہ مزا آتا جو اچھے اچھے کھانوں میں بھی نہیں تھا۔

اب سڑک دریا کے کنارے سے گزرنے لگی تھی۔ دریا کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ کوشش کے باوجود دوسرا کنارہ نظر نہیں آیا۔ گل مینہ نے زندگی میں کبھی اتنا زیادہ پانی نہیں دیکھا تھا۔ سردیوں میں شوال ندی کا پانی خاصا کم ہو جاتا اور پتھروں پر پھلانگ پھلانگ کر اس کے پار جایا جا سکتا تھا، لیکن گرمیوں کے آتے ہی بہاؤ تیز اور جوشیلا ہو جاتا اور دوسری طرف جانا بے حد مشکل ہو جاتا۔

وہ جب تھوڑی بڑی ہوئی تو اماں اور آس پڑوس کی عورتوں کے ساتھ ندی پر کپڑے دھونے جانے لگی۔ ندی کے اندر اور کناروں پر چھوٹے بڑے ہر قسم اور شکل کے پتھر تھے۔ عورتیں وہاں بیٹھ کر کپڑوں پر پتھر ہی کی طرح سخت کالے صابن کی موٹی تکیہ ملتیں، اور پھر کسی چپٹے پتھر پر رکھ کر لکڑی کے ڈنڈوں سے کپڑوں کو پیٹ پیٹ کر ان کے اندر سے پانی نکالنے کی کوشش کرتیں۔ گل مینہ اور اس کی عمر کی دوسری لڑکیوں کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ کپڑے نچوڑ کر انھیں چٹانوں پر بچھائیں۔ ایک دن ایک چٹان کے آخری سرے تک پہنچنے کی کوشش میں وہ پھسل کر پانی میں جا

Scanned with CamScanner

گری۔ اماں اور عورتیں اس وقت دور تھیں اور ان تک آواز نہیں پہنچی۔ بڑی مشکل سے ہاتھ پاؤں مار کر اور کنارے پر لگی گھاس پکڑ کر اس نے خود کو بہہ جانے سے روکا۔ البتہ اس ہنگامے میں پانی اس کے پلاسٹک کے چپل ساتھ لے گیا اور وہ ننگے پاؤں اماں تک پہنچی۔ جب اماں نے اس کا لٹھے کی طرح سفید چہرہ دیکھا تو ڈانٹنے ڈپٹنے کی بجائے اس کے سر سے پانچ روپے وار کے صدقہ کر دیے۔

گاڑی دریا سے ہٹ کر پہاڑی علاقے میں داخل ہوگئی۔ خوبصورت چمکتی ہوئی سڑک اونچی نیچی پہاڑیوں کو کاٹتی ہوئی گزرتی تھی جس پر وین تیرتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ گل مینہ کا دھیان فتح خان کی طرف چلا گیا۔

جب وہ انگور اڈا آئے تو اس وقت فتح خان ارغنداب کے سکول میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ زرجانان اسے انگور اڈا کے مدرسے میں داخل کروانا چاہتا تھا۔ لیکن گل مینہ نے ضد کی کہ پہلے یہ سکول کی تعلیم مکمل کرلے، پھر بے شک اسے مدرسے بھیج دینا۔ علاقے کا اکلوتا مڈل سکول حالات خراب ہونے کی وجہ سے کئی مہینے بند رہا۔ آخر جب مارچ کے آخر میں وہ کھل گیا تو زرجانان فتح کو چوتھی جماعت میں داخلہ دلوانے لے گیا۔ فتح خان پہلی بار لیشیا کی وردی اور سر پر سرخ چوکور نشان والی ٹوپی پہن کر باپ کے ہمراہ سکول جانے کے لیے خوشی خوشی تیار ہوا تو گل مینہ نے بھاگ کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔ فتح کے انتظار میں اس کا سارا دن بے کیف گزرا۔ خدا خدا کر کے جب وہ ہاتھ میں تختی اٹھائے اور کندھے پر بستہ لٹکائے گھر میں داخل ہوا تو گل مینہ نے دوڑ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

وہ وقت سے دو ہفتے پہلے پیدا ہوا تھا اور اتنا لاغر تھا کہ دائی نے صاف کہہ دیا تھا کہ اس کے بچنے کی زیادہ امید مت رکھنا۔ اس کا رنگ اتنا زرد تھا جیسے کسی نے بدن پر ہلدی کوٹ کر مل دی ہے۔ سنگین خان کی بہن گل پانڑہ نے گل مینہ کو پردیسی سمجھ کر بہت ہمدردی کی اور ہر طرح سے اس کی مدد کی، ورنہ تو گل مینہ کو ننھے بچوں کی پرورش کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کی بیٹی

خواڑہ کی قریبی محلے میں شادی ہوگئی تھی، وہ بھی کئی دن تک روزانہ گل مینہ کے پاس آتی اور بچے کی دیکھ بھال میں ہاتھ بٹاتی رہی۔ بلکہ جب تک گل مینہ کا دودھ نہیں آیا، وہ خود ننھے فتح کو دودھ پلاتی رہی۔ زرجانان نے بھی اڈے سے چھٹی لے لی تھی اور جب تک گل مینہ گھر کے کام کرنے کے قابل نہیں ہوئی، وہ ہوٹل سے کھانا لاتا، برتن دھوتا اور گھر کی صفائی کرتا۔ گل پانڑہ اسے گل مینہ کے لیے کوئی چیز لانے کو کہتی تو دوڑا دوڑا جاتا اور بازار سے لے آتا۔ فتح کی پیدائش کے وقت گل مینہ کا اتنا خون ضائع ہوگیا تھا کہ وہ مرتے مرتے بچی تھی۔ دو دن تک تو اسے ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کا بچہ کہاں ہے۔ لیکن جب ساتویں آٹھویں دن فتح خان نے دودھ پیتے پیتے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور جلدی دوبارہ دودھ پینے میں منہمک ہوگیا تو گل مینہ کو ایسے لگا تھا جیسے اس کا سارا وجود موم کی طرح پگھل کر زمین پر بہنے لگے گا۔

کوئی اس کا کندھا ہلا رہا تھا۔ گل مینہ بڑی مشکل سے خیالوں کی دنیا سے واپس آئی۔ اس کے پاس بیٹھی بہنوں سے گاڑی میں سوار ہونے والی سفید برقعے میں ملبوس موٹی عورت اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ 'بہن خیر تو ہے؟ سب ٹھیک ہے؟' اس نے پوچھا۔

'ہاں ہاں، سب ٹھیک ہے،' گل مینہ نے کہا۔ اس عورت نے گل مینہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، 'بہن، تم پچھلے آدھے گھنٹے سے رو رہی ہو۔'

Scanned with CamScanner

شفیق کی آنکھوں سے پٹی ہٹی تو ایک روشن کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اسے ساتھ لانے والے دو سپاہیوں میں سے ایک نے اسے کمرے کے کونے میں پڑی لوہے کی ایک سرد بینچ پر بٹھا دیا۔ دوسرے نے جیب سے چابی نکالی اور شفیق کے بائیں ہاتھ کی ہتھکڑی کھول کر بینچ کے بازو میں ڈالی اور کلک کی آواز کے ساتھ تالا بند کر دیا۔ پھر دونوں بھاری دروازہ بند کر کے چلے گئے۔

شفیق نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اس کی مخالف دیوار پر دروازے کے قریب بھی ویسی ہی ایک بینچ تھی۔ ایک طرف ایک بڑی سفید الماری تھی اور بس۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی روشن دان تک نہیں۔ اس نے نیچے دیکھا۔ فرش غالباً رگڑ رگڑ کر اتنا صاف کیا گیا تھا کہ لگتا تھا کہ اگر بے احتیاطی سے اس پر چلا گیا تو پاؤں پھسل سکتا ہے۔ شفیق نے دیکھا کہ بینچ کے پائے مضبوطی سے فرش میں گڑے ہوئے تھے اور اس کے بائیں پاؤں میں ابھی تک وہی گدیلی والی چپل تھی۔

اسے کل رات ہتھکڑیاں لگا کر ایک بند فوجی گاڑی میں کہیں لے جایا گیا۔ سفر کئی گھنٹے جاری رہا۔ وہ گاڑی کے فرش پر بیٹھا تھا جو اتنا ٹھنڈا تھا کہ جیسے وہ برف کی سل پر بیٹھا ہو۔ وہ بار بار پہلو بدل بدل کر تکلیف کم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے سر ایک طرف ٹکا کر سونے کی کوشش کی لیکن جب بھی جھپکی لگتی تھی، گاڑی کسی گڑھے سے ٹکرا کر اس قدر اچھلتی تھی کہ اس کا سر دیوار پر لگ کر جھنجھنا جاتا تھا۔ ایک طرف سیٹ پر تین فوجی سارا راستہ سوتے ہوئے آئے۔ خدا خدا کر کے جب گاڑی رکی تو باہر اندھیرا چھا چکا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی کس کر باندھنے کے بعد ہی اسے نیچے اتارا گیا۔ ایک فوجی اسے کندھے سے پکڑ کر چلاتا رہا۔ خاصی دیر چلنے اور متعدد موڑ مڑنے

کے بعد اسے اس کمرے میں بینچ سے باندھ کر چھوڑ دیا گیا۔ غنیمت یہ تھی کہ کمرے میں ایک طرف گیس کا ہیٹر چل رہا تھا جس سے گرمی کی خوش گوار لہریں نکل کر اس کا بدن گرمانے لگیں۔

غیر آباد گاؤں میں پکڑے جانے کے بعد کپتان نے کہا تھا کہ اسے شفیق کی بات پر یقین آ گیا ہے، لیکن اپنے ٹھکانے پر پہنچانے کے بعد اس کپتان کی بجائے دوسرے لوگوں نے اس سے پوچھ گچھ کی اور اس دوران بہت درشتی سے پیش آئے تھے۔ انھوں نے اس پر یقین کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ وہ دہشت گرد ہے اور پنجابی طالبان گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے ساتھیوں کا پتہ بتانے کے لیے اسے بار بار تشدد کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ انھوں نے ایسے ایسے ہولناک تشدد کی دھمکیاں دیں جسے نہ اس نے کسی فلم میں دیکھا اور نہ ہی اس کا ذکر کسی ڈائجسٹ میں پڑھا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے سوائے دو چار تھپڑوں کے ان خوفناک دھمکیوں پر عمل نہیں کیا گیا۔ شفیق کو کئی دن ایک پنجرے میں قید رکھا گیا۔ آس پاس دوسرے پنجروں دوسرے قیدی بھی تھے لیکن کسی کو ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی، اس لیے اسے کچھ اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ لوگ کون ہیں اور انھیں کس جرم میں پکڑا گیا ہے۔ تین دن اس پنجرے میں بند رہنے کے بعد بالآخر اسے وہاں سے نکال کر ایک دن کے سفر کے بعد یہاں لایا گیا تھا۔

اس صاف ستھرے کمرے میں شفیق کو اندازہ ہوا کہ وہ خود کس قدر گندا تھا۔ پچھلے ہفتے مدرسے سے بھاگ نکلنے کے بعد سے اسے صرف ایک بار غیر آباد گاؤں کے قریب بہنے والی ندی میں منہ دھونے کا موقع ملا تھا۔ پچھلی پانچ راتیں وہ زمین پر سوتا رہا تھا جس سے کپڑے کیچڑ ہو رہے تھے۔ قمیص پر جنگلی پھل کے داغ اب مٹیالے ہو چلے تھے اور پاؤں کی گدیلی نہایت بھدی لگ رہی تھی۔

اس کی آنکھ دروازہ کھلنے کی آواز سے کھل گئی۔ ایک جسیم شخص نے کمرے میں داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے کریم کلر کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی جس میں سے اس کی توند

Scanned with CamScanner

صاف نکلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ مسوں کے علاوہ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز صفائی کرنے والے برش جیسی گھنی مونچھیں تھیں جنھوں نے اس کے ہونٹوں کو ڈھک رکھا تھا۔ البتہ اس نے صفائی سے مونچھیں تراش رکھی تھیں کہ ایک بال بھی ادھر ادھر نکلا ہوا نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر شفیق کو وہ درشتی نظر نہیں آئی جسے وہ پچھلے ڈیڑھ ماہ میں متعدد چہروں پر دیکھ چکا تھا۔ وہ کرسی گھسیٹ کر شفیق کے سامنے بیٹھ گیا۔

'ہاں بھئی شفیق، سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟' مونچھوں والے کی آواز اس کے بدن کے برعکس خاصی پتلی، بلکہ کسی حد تک زنانہ تھی۔

شفیق سر کو نفی میں ہلا کر رہ گیا۔

'کچھ کھایا پیا ہے تم نے؟'

شفیق نے سر پھر نفی میں ہلا دیا۔ اسے مونچھوں والے کی بات سے احساس ہوا کہ وہ کس قدر بھوکا تھا۔

'کمال ہے! خیر، میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔' یہ کہہ کر وہ شخص باہر چلا گیا۔ کئی منٹوں بعد جب وہ لوٹا تو اس کے پیچھے ایک شخص اور بھی تھا جس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی۔ مونچھوں والے نے ٹرے اس سے لے کر شفیق کی بینچ پر رکھ دی۔ پھر اس نے قمیص کی جیب سے ایک چابی نکالی اور شفیق کی ہتھکڑی کھول دی۔ شفیق نے تشکیوں سے ٹرے کی طرف دیکھا۔ اس میں دو پیالیاں، ایک چھوٹی سی چائے دانی اور ڈبل روٹی سے بھری پلیٹ رکھی تھی۔ مونچھوں والے نے دو پیالیوں میں چائے ڈالی اور ایک پیالی شفیق کو دی اور ساتھ ہی ڈبل روٹی کی پلیٹ اس کے قریب کر دی۔

'میرا نام مقصود ہے،' مونچھوں والے نے چائے کی سڑکی لیتے ہوئے اپنی پتلی آواز میں کہا۔ 'مجھے تمھارا کیس دیا گیا ہے۔ میرا تعلق ایک سرکاری ادارے سے ہے، اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم مجھ سے مکمل تعاون کرو گے کیوں کہ یہ ملک کی خدمت ہوگی۔ اس کے بدلے میں میں

پوری کوشش کروں گا کہ تمھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔'

'لیکن سر، میں بے گناہ ہوں۔ میرا دہشت گردوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سر وہ لوگ مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے، یقین کریں کہ میرا اس میں۔۔۔'

'میں جانتا ہوں، میں نے تسلی کر لی ہے، تمھاری پینٹنگ کی ورکشاپ، گھر، بیوی بچوں سب کا پتہ چلا لیا ہے۔ میں تو صرف اس بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمھیں کیوں اغوا کیا گیا تھا اور تم اس مدرسے میں کرتے رہے ہو۔'

'سر، مجھے پہلے خود پتہ نہیں چلا کہ وہ مجھے کیوں لے کر آئے ہیں۔ میں ٹرک پینٹر ہوں، ساری زندگی یہی کام کرتا رہا ہوں۔ میرا کسی سے کوئی جھگڑا کوئی لین دین نہیں ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ دیواروں پر تصویریں بناتی ہیں۔'

'جنت کی تصویریں؟'

'جی سر، ویسی ہی جیسی ٹرکوں کے پیچھے بنتی ہیں۔'

'شفیق، تمھیں معلوم ہے کہ وہاں خودکش حملہ آور تیار کیے جاتے تھے۔ تمھارے بنائے ہوئے جنت کے منظر دکھا کر انھیں خودکش حملوں کے لیے ورغلایا جاتا تھا۔'

'لیکن سر، میں مجبور تھا، اگر میں نہ بناتا تو وہ مجھے مار دیتے۔ اور سر، وہ کمرا ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا۔ ابھی آدھی دیوار باقی تھی۔'

'ٹھیک ہے، میں تم پر کوئی الزام نہیں لگا رہا۔ میں تم سے کچھ اور چاہتا ہوں۔ تم سینریوں اور بیل بوٹوں کے علاوہ انسانوں کی تصویریں بھی بنا سکتے ہو نا؟'

'جی سر، بنا سکتا ہوں۔ بلکہ پہلے میں یہی کام کرتا تھا، لیکن ایک دن انھوں نے مجھے دھمکی دی تھی، جس کے بعد سے میں نے انسانی تصویریں بنانا چھوڑ دی تھیں۔'

'بہت خوب۔ تم نے اتنا عرصہ دہشت گردوں کے لیے کام کیا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس کے ازالے کے لیے تم ملک کے بھی کچھ کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے ان خودکش دہشت

Scanned with CamScanner

گروؤں کی تصویریں بنا کر دو جو اس مدرسے میں دہشت گردی کی تربیت حاصل کر رہے تھے، تاکہ ہم انھیں حملہ کرنے سے پہلے ہی پکڑ سکیں۔'

'جی سر، لیکن یادداشت سے تصویر بنانا مشکل۔۔۔'

'مشکل وشکل کچھ نہیں شفیق۔ تم اپنے بیوی بچوں سے جلد ملنا چاہتے ہو تو تمھیں ہر صورت جلد از جلد یہ خدمت انجام دینا ہوگی۔ ایک ماہ تم ملک کے بدترین دشمنوں کے لیے کام کرتے رہے ہو، اب کچھ دن ملک کے لیے بھی کام کر کے دیکھو۔ اس کے بعد ہم تمھیں چھوڑ دیں گے اور جو کام پہلے کرتے تھے، وہ جاری رکھ سکتے ہو۔'

میں شاہی قافلے کے ساتھ ہی سوئے قندہار روانہ ہو گیا۔ حالات دیکھتے ہوئے امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ قندہار پہنچ کر بھی ابدالی سے ملاقات کا موقع مل سکے۔ جس رفتار سے قافلہ گامزن تھا، اسے ابھی منزل تک پہنچنے کے لیے دو مزید راتیں درکار تھیں۔ ابدالی کا شاہی خیمہ ایک درجن خچروں پر سوار ہو کر اس لاؤ لشکر کے آگے آگے چلتا تھا۔ جس منزل پر رات بسر کرنا ہوتی تھی، وہاں کم از کم پچاس کاریگر اسے پھرتی سے نصب کر کے ابدالی کے پہنچنے تک تیار کر دیتے تھے۔ اس میں ابدالی اور اس کے حرم کی رہائش کے لیے کئی کمرے، ایک خواب گاہ اور ایک بڑا دربار تھا، لیکن مجھے بتایا گیا کہ ابدالی اپنی خرابیِ صحت کے بنا پر فی الحال دربار منعقد نہیں کرتا، اس لیے دربار والا حصہ نصب نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کی خواب گاہ کے گرد مسلح محافظوں کی ایک قطار کھڑی رہتی تھی۔ مجھے کسی طرح سے ان کی آنکھ بچا کر خیمے میں داخل ہونا تھا۔ باقی کام میرے خم دار آبائی خنجر کا تھا۔

آج سفر کی آخری رات تھی، اور میرے پاس اپنا کام کرنے کا آخری موقع تھا۔ قندہار کے شاہی محل میں میری نقل وحرکت بے حد محدود ہو جائے گی۔ وہاں ابدالی کی خواب گاہ تک رسائی کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔ کیا پتہ یہ موٹا خواجہ سرا مجھے شہر میں کس جگہ ٹھہرائے؟ مجھے سفیر ہونے کے ناتے ایک خیمہ دیا گیا تھا جو ابدالی کے شاہی خیمے سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر نصب تھا۔ میں نے رات کو اپنے خیمے کا موٹا کپڑا خنجر سے کاٹ کر چھوٹا سا روزن بنا لیا اور ایک آنکھ ابدالی کے خیمے پر جما دی۔ اس کے باہر کم از کم ایک درجن سپاہی چاک وچوبند کھڑے تھے، جن میں سے تین کے پاس توڑے دار بندوقیں بھی تھیں۔ خیمے کے چاروں طرف شمعیں روشن تھیں۔

سوال یہ تھا کہ کیا یہ سپاہی ساری رات ایسے ہی چوکس رہیں گے، یا کسی پہر سست پڑ جائیں گے؟ مجھے یہی دیکھنا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رات کے کسی پہر موٹا مقرب خاص یاقوت خان

Scanned with CamScanner

اپنے محافظوں کے ہمراہ خیمے کے قریب پہنچا۔ اس کے محافظ باہر ہی رہ گئے اور وہ اکیلا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کسی قسم کی شیشی تھی۔ تو گویا ابدالی کو دوا بھی یہی موٹا دیتا ہے؟ میں نے پچھلے دو دن سے یاقوت کے علاوہ کسی اور شخص کے خیمے کے اندر جاتے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ شدید بیمار ہے، لیکن اس کا علاج کرنے والے حکیم کہاں ہیں؟ اس کا خیال رکھنے کے لیے شاہی حرم کی خواتین اس کے خیمے میں کیوں نہیں جاتیں؟ یہ بات مجھے کھٹکنے لگی۔ یہ موٹا آخر کیا کھیل کھیل رہا ہے؟ میرے ذہن میں الف لیلہ و لیلہ کی کہانیاں گھوم گئیں جن میں مکار درباری خواجہ سرا محلاتی سازشوں کے تانوں بانوں میں حکمرانوں کو ایسے کس لیتے ہیں کہ وہ ان کی مرضی کے بغیر سانس تک نہیں لے سکتے۔ لیکن ابدالی تو ایسا نہیں لگتا کہ کوئی خواجہ سرا اس پر اثر انداز ہو سکے؟ لیکن کیا پتہ بڑھاپے اور بیماری نے اسے لاچار کر دیا ہو۔

نصف رات کے قریب بارش شروع ہو گئی۔ ابھی موسمِ سرما نہیں شروع ہوا تھا لیکن ہم قندہار سے خاصا اوپر بلندی پر خیمہ زن تھے اس لیے یہاں سردی کی کاٹ گہری تھی۔ رات بھیگتی گئی، ہوا کی تڑپ اور شدت بڑھتی گئی۔ شاہی خیمے کے باہر نصب مشعلیں ایک ایک کر کے بجھ جاتی تھیں، محافظ انھیں بار بار روشن کرتے تھے مگر وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ گل ہو جاتیں۔

روزن سے آنکھ لگائے لگائے کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔ نیچے سے گاؤ تکیہ کھسکا تو میں جاگ گیا۔ باہر گھپ اندھیرا طاری تھا۔ ساری مشعلیں بجھ چکی تھیں اور محافظوں کا کہیں اتہ پتہ نہیں تھا۔ یہی میرا وقت تھا۔ میں نے اپنے پہلو سے لگی نیام میں سے خم دار خنجر نکالا۔ اس کا پھل میرے بدن کی حرارت سے خاصا گرم ہو رہا تھا۔ میں نے اونی شال اپنے گرد لپیٹی اور خیمے کا پردہ اٹھا کر باہر نکل آیا۔ ہوا کے تند جھونکوں نے بھوکے بھیڑیوں کی طرح مجھ پر ہلہ بول دیا۔ میں نے شال کے پلو اپنے گرد لپٹا لیے اور ابدالی کے خیمے کی طرف بڑھا۔ مجھے زمین نظر نہیں آ رہی تھی لیکن میں نے شام ہی کو یہاں کے کئی چکر لگا کر راستہ ازبر کر لیا تھا۔ ایک آدھ جگہ مجھے ناہموار زمین پر بیٹھ کر نیچے اترنا پڑا۔ شاہی کاروان کے بیرونی حلقے پر تعینات پہرے دار جاگ رہے تھے اور

وقفے وقفے سے ان کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ صرف ہوا کے شور کا راج تھا جو خیموں کے پٹ پھڑپھڑاتی ہوئی گزر رہی تھی، لیکن ہر خیمہ نیند کے نشے میں یوں دھت تھا کہ اس پر ہوا کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ شاہی حکام اور اعلیٰ فوجی افسران کی قیام گاہوں کی تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا بالآخر میں ابدالی کے خیمے کے عقب میں پہنچ گیا۔ موٹے کپڑے، چمڑے اور لکڑی کے تختوں سے بنا یہ دو منزلہ خیمہ کسی چھوٹے موٹے محل سے کم نہیں تھا۔ میں نے ٹٹول کر ایک جگہ طنب کی، خنجر کی نوک وہاں چبھوئی اور نیچے تک کھینچ کر چیرا لگا دیا۔ کپڑا بہت موٹا اور سخت تھا، لیکن میرے خنجر کی آب ایسی تھی کہ لوہا بھی کاٹ دیتی۔ چر کی ہلکی سی آواز نکلی۔ میں دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ جب خاصی دیر تک کہیں سے کوئی ردِعمل برآمد نہیں ہوا تو میں نے دوبارہ خنجر لگا کر اتنا لمبا چیرا لگا لیا جس سے میں اندر داخل ہو سکوں۔

شاہی خیمے کے ایک کونے میں ایک موم بتی جل رہی تھی لیکن اس کی روشنی وسیع و عریض خیمے کی تاریکی دور کرنے میں ناکام تھی۔ خیمہ کسی چھوٹی موٹی جامع مسجد کے دالان جتنا کشادہ تھا، اور اس کے فرش پر کم از کم تیس چالیس لوگ آرام سے سو سکتے تھے۔ یہاں عنبر و لوبان کی بجائے کسی قسم کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی جو ناک کے راستے دماغ میں گھسی جا رہی تھی۔ شاید ان دواؤں کی بو تھی جو ابدالی کو دی جا رہی تھیں۔ یہاں ابدالی کہاں ہو سکتا ہے؟ کہیں اوپر والی منزل پر تو نہیں؟ لیکن اگر وہ اتنا ہی بیمار ہے جتنا اس سازشی خواجہ سرا نے مجھے باور کروانے کی کوشش کی تھی تو پھر اسے نچلی منزل ہی پر ہونا چاہیے۔ میں نے فرش پر بچھے دبیز قالین پر لیٹے لیٹے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ باہر کیچڑ میں چلتے ہوئے میرے ہاتھ پاؤں اور کپڑے لت پت ہو گئے تھے۔ میں نے قالین پر رگڑ رگڑ کے ہاتھ صاف کیے اور کھسکتے ہوئے آگے بڑھا۔ فرش پر دلائیاں اور تکیے بچھے تھے۔ ایک طرف پانچ سات بھاری کرسیاں پڑی تھی۔ میں خیمے کے وسط تک پہنچ گیا۔ دائیں طرف کونے میں مہین پردوں کا ایک حجلہ سا بنا ہوا تھا۔ میں نے کان اس طرف لگا دیے کہ سانسوں کی آواز آئے، لیکن ادھر مکمل سکوت تھا۔ اب وہ لمحہ آ گیا تھا جس کی خاطر میں

Scanned with CamScanner

پچھلے ایک سال سے آتش زیرِ پا تھا۔

آج سے صدیوں قبل میرے جدِ کن الدین بغدادی کے قدم بغداد کے عباسی خلیفہ کے دربار میں لڑکھڑا گئے تھے، اور وہ اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہے تھے، لیکن ان کے برعکس میں کسی قسم کی کمزوری یا سستی دکھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ خاندان کی ناموس کا صدیوں بھاری بوجھ میرے سر پر تھا، جس سے مجھے اپنی جان پر کھیل کر عہدہ برا ہونا تھا۔ میں نے خنجر اپنے دانتوں میں دبا لیا اور قالین پر لیٹے لیٹے حجلے کی جانب سرکنے لگا۔ خیمے کے باہر کسی محافظ نے آوازہ لگایا، پھر اس کے جواب میں کوئی اور بولا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ان میں سے کوئی شاہی خیمے میں گھسنے کی جرات نہیں کرے گا۔ اب میں حجلے کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے پردہ ہٹا کر اندر دیکھا۔ یہاں آویزاں ریشمی پردے اس مال سے کہیں قیمتی اور نازک تھے جو میں نے قندہار کے توپ خانہ بازار میں بیچا تھا یا کسی اور کی دکان پر دیکھا تھا۔ یہاں ایک بھاری چھپر کھٹ بچھا تھا۔ اس کے اوپر موٹا لحاف تھا جس کی گولائی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے اندر کوئی موجود ہے۔

میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

63

گل مینہ کی ہائی ایس وین جب پیر ودھائی کے کیچڑ سے لت پت لاری اڈے میں جھٹکے کے ساتھ رکی تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ دن میں کسی وقت بارش ہوئی تھی جس کے باعث ہر طرف پانی کے چھوٹے چھوٹے تالاب کھڑے تھے جن میں گاڑیاں چھچھپاتی ہوئی گزر رہی تھیں، اور کندھوں پر بیگوں، تھیلوں یا ہاتھوں میں شاپنگ بیگوں سے لدے پھندے کہیں سے آنے والے یا کہیں جانے والے مسافر چھینٹوں سے بچنے کے لیے اپنی شلواروں کے پائنچے چڑھا کر کمر کی کمان سی بنا لیتے تھے۔ کنڈکٹر سواریوں کو بلانے کے لیے نچلے سروں میں آوازیں لگا رہے تھے، گاڑیوں میں بیٹھے بے صبرے ڈرائیور بار بار انجن کو ریس دے رہے تھے۔

ایک وین کے قریب دو آدمی کھڑے پشتو میں بات کر رہے تھے۔ گل مینہ نے ان سے پوچھا کہ لیاقت باغ کون سی گاڑی جائے گی تو ان میں سے ایک نے ہاتھ لمبا کر اس سڑک کی جانب اشارہ کر دیا جہاں سے گل مینہ کی گاڑی تھوڑی دیر پہلے اڈے کے اندر مڑی تھی۔

گل مینہ کو احساس ہوا کہ سڑک پر اب گاڑیوں کی تعداد پہلے کے مقابلے پر بہت کم ہو گئی ہے اور لوگ جگہ جگہ ٹولیوں میں کھڑے بلند آواز میں باتیں کر رہے ہیں۔

گل مینہ نے ایک آدمی سے پشتو میں دریافت کیا، لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ گل مینہ نے ادھر ادھر کسی پشتو بولنے والے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ اردو بول لے گی لیکن سکول میں مس فرزانہ کے بعد سے اب تک اسے کسی کے ساتھ اردو بولنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے اسے جھجک محسوس ہوتی تھی کہ نہ معلوم زبان سے لفظ کس طرح نکلیں۔ کونے میں ایک رکشہ کھڑا تھا جس کا نوجوان ڈرائیور اپنے حلیے اور نین نقش سے پٹھان لگتا تھا۔ گل مینہ نے جب اس سے پوچھا تو اس نے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس نے کوئی انتہائی بے تکا سوال کر دیا

Scanned with CamScanner

ہو: 'چچی، ادھر حملہ ہو گیا ہے، بے نظیر کو کسی نے مار دیا ہے، سارے راستے بند ہیں۔'

گل مینہ کی سانس بند ہو گئی۔ اسے لگا جیسے اچانک رات نے کسی برساتی ریلے کی طرح آ کر چاروں طرف تاریکی پھیلا دی ہو۔ اس نے رکشے کا سہارا لے کر بڑی مشکل اپنے آپ کو زمین پر ڈھیر ہونے سے روکا۔

'بیٹا، مجھے ہر حال میں وہاں جانا ہے۔ خدا رسول کا واسطہ ہے مجھے وہاں لے چلو۔ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے،' اس نے کہا۔

'اچھا، چچی، روؤ تو نہیں، پیچھے بیٹھ جاؤ، آگے راستہ بند ہے، جہاں تک رکشہ جا سکے، میں تمھیں لے جاؤں گا، آگے پھر تم پیدل چلی جانا،' ڈرائیور نے کہا۔ 'پانچ سو روپے ہوں گے۔'

گل مینہ رکشے کے اندر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر پہلے جب اس کی گاڑی پنڈی میں داخل ہوئی تھی تو اس وقت جگہ جگہ گاڑیوں کی لمبی قطاریں نظر آتی تھیں جن کی وجہ سے اڈے تک پہنچتے پہنچتے خاصا وقت لگ گیا تھا، لیکن اب سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف کھمبوں کی زرد بتیاں جل اٹھی تھیں لیکن وہ ویرانی کے تاثر میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ ڈرائیور اس دوران مسلسل بولتا رہا: 'مار دیا مشرف نے، سولہ آنے اسی کا کام ہے۔ ایک ہی لیڈر تھی ملک میں، پہلے اس کے باپ کو مارا، پھر بھائیوں کو چن چن کے ختم کیا اور بھٹو کی آخری نشانی بچی تھی اسے بھی مار ڈالا، سندھ میں ہنگامے شروع ہو گئے ہیں، اب اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔' گل مینہ سیٹ کی پشت پر سر ٹکائے گم صم حالت میں سنتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد رکشہ ایک قبرستان کے پہلو سے ہوتا ہوا ایک سیاہ ندی کے اوپر بنے زیر تعمیر پل پر سے گزرا اور تنگ و تاریک ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں داخل ہو گیا جن کے دونوں طرف دکانیں تھیں۔ اکثر دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے۔

چند گلیاں مڑنے کے بعد رکشہ چوک میں پہنچ کر رک گیا۔ 'آگے سڑک بند ہے چچی، بس یہیں اتر جاؤ، یہ سڑک سیدھی لیاقت باغ کو جا رہی ہے۔ آگے جہاں بڑا چوک آئے گا وہی

لیاقت باغ ہے۔ لیکن میری مانو تو اس وقت ادھر مت جاؤ، حالات بڑے خراب ہیں، کوئی پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہو جائے۔'

گل مینہ نے بغیر کچھ کہے ڈرائیور کو پیسے دیے اور اس کی بتائی ہوئی سمت میں چل پڑی۔

شام گہری ہو چلی تھی اور خنکی خاصی بڑھ گئی تھی۔ وہ میکانکی انداز سے چلتی رہی۔ بازار مکمل طور پر بند تھا، سڑک پر کبھی کبھی کوئی گاڑی گزرتی تھی اور اس کے بعد پھر سکوت چھا جاتا تھا۔ البتہ اوپر فضا میں خوب گہما گہمی تھی اور ہیلی کاپٹر بھنوروں کی طرح منڈلاتے ہوئے بظاہر بے مقصد ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ دور سے سائرن کی آواز آتی تھی اور پھر آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتی تھی۔ اونچی عمارتوں پر نصب رنگا رنگ اشتہاری روشنیاں نیچے شہر پر چھائی ہوئی ویرانی سے بے نیاز ایسے جل بجھ رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

آگے سڑک پر پولیس کی گاڑیوں کی قطاریں کھڑی تھیں جن کی آگے کی بتیاں بھی روشن تھیں اور چھت پر نیلی اور لال بتیاں بھی تیزی سے گھوم رہی تھیں۔ پولیس کی وردی کے علاوہ اور بھی کئی قسم کی وردیاں پہنے جوان ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ وہ جب چوک کے قریب پہنچی تو دیکھا کہ سڑک کے دونوں جانب پانی کی ٹینکیاں کھڑی تھیں جن سے بڑے بڑے پائپ اژدہوں کی طرح نکل کر سڑک پر تھرا رہے تھے اور ان کے دہانوں سے پانی کی موٹی دھاریں نکل کر سڑک کو نہلا رہی تھیں۔ گیلی سیاہ سڑک گاڑیوں کی تیز بتیوں کی روشنی میں جگ مگ کر رہی تھی۔ درجنوں خاکروب لمبے لمبے جھاڑوؤں کی مدد سے سڑک کو رگڑ رگڑ کر صاف کر رہے تھے۔

گل مینہ خاکروبوں کے درمیان ادھر ادھر دیوانہ وار پھرتی رہی، وہ سڑک کے سرے تک جاتی تھی جہاں سے گاڑیاں نے سڑک مسدود کر رکھی تھی اور پھر وہاں سے واپس چوک تک آ جاتی تھی۔ اس کی اسی آمد و رفت کے دوران ایک گاڑی میں سے چار پانچ مرد نکل کر اس کی جانب لپکے۔ وہاں موجود اکثر لوگوں کے برخلاف انھوں نے کوئی وردی نہیں پہن رکھی تھی۔ ان میں سے

Scanned with CamScanner

ایک نے تیز لہجے میں اس سے پوچھا، 'کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہی ہو؟' اس شخص کی گھنی سیاہ مونچھیں تھیں جنھوں نے اس کے ہونٹوں کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا تھا۔

گل مینہ نے اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے اس کا راستہ روک دیا۔ جس آدمی نے پہلے سوال کیا تھا، اس نے چیخ کر کچھ کہا اور دو آدمیوں نے جھپٹا مار کر گل مینہ کے ہاتھ جکڑ لیے۔ گل مینہ نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن انھوں نے اس کے بازو مروڑ کر اسے زمین پر لٹا دیا، ایک آدمی نے اس کے پاؤں پر گھٹنے رکھ کر اسے بے بس کر دیا۔ ایک اور آدمی نے اس کا برقع الٹ دیا۔ گل مینہ کے منہ سے تیز چیخ نکلی جس نے آس پاس کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ باوردی جوان ڈبل کیبنوں، کھلے ٹرکوں اور ویگنوں سے دھم دھم کود کر اتر آئے اور اپنے ہاتھوں میں تھامی ہوئی خوف ناک بندوقوں کا رخ گل مینہ کی طرف کر دیا۔ لیکن یہ سب گل مینہ اور اس کے ہاتھوں کو جکڑے ہوئے آدمیوں سے اتنا دور رہے کہ بیس پچیس قدم کا دائرہ بن گیا۔

جس آدمی نے گل مینہ سے سوال کیا تھا اس نے چیخ کر کہا، 'کسی کے پاس چاقو ہے؟ جلدی سے، چاقو!' دائرے میں کھڑے ہاتھوں میں خوف ناک بندوقیں تھامے ہوئے جوانوں میں سے دو نے جھک کر اپنی فوجی وردی کے پائنچوں میں سے خنجر نکالے اور انھیں دائرے کے مرکز کی جانب اچھال دیا۔ خنجر گیلی سڑک پر کھسکتے ہوئے اس کے قدموں کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے تیزی سے ایک خنجر اٹھایا اور گل مینہ کی طرف جھپٹا۔ گل مینہ کے منہ سے ایک اور چیخ برآمد ہوئی۔ اس نے جلدی سے سڑک پر گھٹنے ٹیک کر خنجر کی نوک برقعے کی گردن میں کھبوئی اور تیزی سے اسے کھینچتا ہوا نیچے لے گیا۔ سیاہ سٹیل کے خنجر کی تیز دھار نے نہ صرف برقعے کے ساتھ ساتھ گل مینہ کی قمیص کا بڑا حصہ بھی کاٹ ڈالا بلکہ اس کے بدن پر بھی گہری خراش ڈالتا ہوا نیچے تک چلا گیا۔ گل مینہ نے رسیوں میں جکڑے ہوئے قربانی کے جانور کی طرح اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی لیکن اسے تین مردوں نے ایسا دبوچا ہوا تھا کہ وہ قربانی کے جانور ہی کی طرح

ڈکرا کر رہ گئی۔ اس کشمکش سے اس کی پشت سڑک پر پڑے ٹھنڈے کیچڑ سے لت پت ہو گئی۔

گھنی مونچھوں والے نے برقع کاٹ کر الگ کر دیا اور پھر کٹی ہوئی قمیص اٹھا کر دیکھا لیکن اسے سڑک پر لگے کھمبوں کی بیمار روشنی میں گل مینہ کی گندمی جلد پر لحظہ لحظہ پھیلتی ہوئی ایک سرخ لکیر اور میلی کچیلی سفید انگیا کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ خنجر وہیں پھینک کر اٹھ کھڑا اور زور سے بولا، 'چھوڑ دو اسے، خودکش نہیں ہے یہ۔'

Scanned with CamScanner

64

فتح خان کے لیے آج سکول میں بہت خاص دن تھا۔ انگور اڈا مڈل سکول کا اپنا میدان نہیں تھا لیکن سڑک کے کنارے موئی نیکہ بابا کی زیارت کے آگے خاصی کھلی جگہ تھی، وہیں دو دو پتھر رکھ کر گول بنائے گئے اور لڑکوں کی دو ٹیموں کو میدان میں اتار کے ہیڈ ماسٹر نے فٹ بال بیچ میں اچھال دیا۔

اگلے مہینے وانہ میں فٹ بال ٹورنامنٹ ہو رہا تھا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی خواہش تھی کہ ان کی ٹیم بھی اس میں حصہ لے۔ آج انھوں نے ٹیم کے لیے لڑکے منتخب کرنے کے لیے اس میچ کا اہتمام کیا تھا۔ دو تین لڑکوں کو چھوڑ کر کسی کے پاس جوگر یا پی ٹی شوز نہیں تھے۔ جن لڑکوں کے جوتے نرم تھے وہ ہیڈ ماسٹر نے رہنے دیے، لیکن پلاسٹک یا چمڑے کے سخت جوتے اتروا لیے۔ زمین ریتلی تھی اور لڑکے کھیل کی نزاکتوں سے نابلد، اس لیے جب گیند جہاں جاتی، دس پندرہ لڑکے وہیں لپک پڑتے اور ٹانگیں اور بازو حریف بارہ سنگھوں کے سینگوں کی طرح یوں گتھم گتھا ہو جاتیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا۔

فتح خان دوسرے لڑکوں سے عمر میں چھوٹا تھا اور ہلکا پھلکا بھی۔ کئی بار تو وہ بڑے لڑکوں کے دھکوں سے دور جا گرا لیکن ایک بار موقع مل گیا۔ اسے الجھی ہوئی ٹانگوں کے جنگل میں تھوڑا سا خلا نظر آیا تو غوطہ لگا کر وہاں سے گیند نکال لایا۔ اس سے پہلے کہ آپس میں الجھا جمگھٹا سنبھلتا، فتح خان گیند مخالف گول کے پار کر چکا تھا۔

فتح خان کا دل گھر میں نہیں لگتا تھا۔ جب سے اماں نے دوسری شادی کی تھی اسے ساری دنیا سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے ابا کی جگہ کوئی اور لے سکے۔ اس شخص کو اپنے گھر میں اپنے شہید باپ کی جگہ بیٹھا دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ اس کی

کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ گھر میں کم سے کم وقت گزارے۔ اسی لیے وہ سکول سے گھر آتا، اور بستہ ستون پر لٹکا کر اور دو چار لقمے نگل کر باہر نکل جاتا اور دوستوں کے ساتھ کھیلنے لگتا، یا ویسے ہی انگور اڈا بازار میں سرگشت کیا کرتا۔ اسی کبھی کبھی اپنے پردادا پاؤ جان کا خیال آتا، جن کے بارے میں اماں نے بہت سے قصے سنا رکھے تھے۔ فتح خان کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ اماں نے بتایا تھا کہ پاؤ جان نے اس عمر تک انگریزوں کے علاقوں میں حملہ کرنے والے چھوٹے موٹے گروہوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ کاش وہ بھی اسی دور میں ہوتا تو اپنی بھڑاس دشمن پر نکالنے کا موقع مل جاتا۔ اسے ایک بار انگور اڈا میں ایک طالب نے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی تھی لیکن فتح کو طالبان پسند نہیں تھے۔ اسے لگتا تھا کہ وہی اس کے ابا کی موت کے ذمہ دار ہیں۔

اگلے مہینے جب وانہ میں ضلعے بھر کے مڈل سکولوں کا ٹورنامنٹ ہوا تو انگور اڈا مڈل سکول کی ٹیم میں فتح خان کو بھی منتخب کر لیا گیا۔ ایک ڈاٹسن میں بھر کر تمام ٹیم وانہ کے لیے روانہ ہوئی۔ فوجیوں نے بہت عمدہ پکی سڑک بنائی تھی، جس پر سفر بہت مزے سے کٹا۔ تمام راستے لڑکے گانے گاتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب، جو ویسے تو بڑے سخت گیر تھے، اور شور شرابہ کرنے والے لڑکوں کو کلاس کے ایک کونے میں کان پکڑوا دیا کرتے تھے، اس موقعے پر بس کے اگلے حصے میں پی ٹی آئی سے باتیں کرتے رہے اور انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جب وہ نیزہ نرئی کے جنگل میں پہنچے تو ہیڈ ماسٹر نے بس رکوا کر لڑکوں کو نیچے اتارا اور انھیں محمود غزنوی کے پتھروں کی تاریخ بتائی جن پر ہندوستان پر یلغار کرنے والے سپاہیوں نے نیزے تیز کیے تھے۔ اس کے بعد بس زرمین کے جنگلوں سے ہوتے ہوئے نیچے اتری اور شوالم سے ہوتی ہوئی وانہ پہنچ گئی۔

وانہ ہائی سکول میں مختلف علاقوں سے کم از کم دس ٹیمیں آئی ہوئی تھیں جنھوں نے رنگ برنگی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ انگور اڈا مڈل سکول کی وردی سرخ قمیص اور زرد نیکر پر مشتمل تھی۔ فتح

خان پر یہ وردی تھوڑی کھلی تھی۔ اس نے کس کر نیکر باندھ لیا اور قمیص اس کے اندر اچھی طرح اڑس لی۔ میدان واقعہ قلعے کی اونچی دیواروں کے بالکل ساتھ بنایا گیا تھا۔ قلعے کی پتھریلی دیواریں ہلکی پیلی رنگی ہوئی تھیں جب کہ سنجاف گہرے بھورے رنگ کا تھا۔ میدان میں چونے سے لکیریں لگائی گئی تھیں اور اس کے چاروں طرف سینکڑوں لوگ جمع تھے، جن میں سکولوں کے بچوں اور ان کے والدین کے علاوہ وہ گاہک بھی شامل تھے جو دانہ بازار سے سودا سلف لینے آئے تھے لیکن جب یہاں گہما گہمی نظر آئی تو تماشا دیکھنے پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد قلعے کے مہیب سیاہ پھاٹک کے اندر سے نکل کر درجنوں فوجی بھی میچ دیکھنے کے لیے آ گئے۔

انگورا ڈا کا پہلا میچ شوالم کی ٹیم کے ساتھ تھا جس نے نیلی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ فتح خان جب میدان میں اترا تو اسے سب سے پہلے جس بات کا شدت سے احساس ہوا وہ یہ تھی یہ میدان بہت بڑا تھا۔ اس کے تصور سے بھی کہیں بڑا۔ یہاں کھلاڑیوں کا اس طرح سے الجھنا ممکن نہیں تھا جس طرح وہ انگورا ڈا کے صحرائی میدان میں ایک دوسرے سے بھڑ جاتے تھے۔ یہ میدان تو اس قدر لمبا چوڑا تھا کہ ایک سرے سے گیند دوسرے سرے تک لے جانا ہی بڑا مشکل کام معلوم ہوتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ انگورا ڈا کے صحرا کے برعکس یہاں زمین خاصی سخت تھی، اس لیے گرنے کی صورت میں چوٹ آنے کا خدشہ بھی تھا۔

پہلے دو میچوں میں فتح کو گیند کے قریب جانے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ ٹیم کا سب سے اچھا کھلاڑی گلباز تھا جسے اس کی تیزی کی وجہ سے لڑکے چنگارہ کہتے تھے۔ وہ ان کی ٹیم کا واحد کھلاڑی تھا جس کے پاس فٹ بال کھیلنے والے جوتے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی کو پاس دینے کا قائل نہیں تھا۔ اکثر اوقات دوسری ٹیموں کے تین چار لڑکے اسے گھیرے رکھتے تھے جس کی وجہ سے وہ گول کے قریب نہیں جا پاتا تھا۔ فتح اس کے ساتھ ساتھ خالی خولی بھاگتا اور چیختا رہتا کہ 'ادھر، ادھر!' لیکن وہ گیند اپنے پاس ہی رکھتا جو جلد ہی اس سے چھن جاتی۔

جب سے اس کی ماں نے نئی شادی کی تھی، فتح خان کو گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ ماں

کے نئے خاوند کی غیر موجودگی میں بھی اسے لگتا تھا جیسے اس کے ساتھ کوئی زبردست ناانصافی ہو گئی ہے جس کا ازالہ ممکن نہیں ہے۔ ماں کی بات تو اس کے پلے ہی نہیں پڑتی تھی، نہیم کے والد شیر خان چاچا نے بھی اسے خاصا سمجھایا تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد وہ بے سہارا ہو گئے ہیں اور سہارا حاصل کرنے کے لیے یہ شادی اسلام کے حکم کے عین مطابق ہے۔ لیکن فتح کا دل نہیں مانتا تھا۔ کیا اس کی ماں چند سال انتظار نہیں کر سکتی تھی جب وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر اسے سہارا فراہم کرنے کے قابل ہو جاتا؟ اس نے کئی بار سوچا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ کر پاکستان کے کسی شہر چلا جائے اور وہاں محنت مزدوری کر کے کسی مقام پر پہنچ جائے اور پھر ایک دن ماں کو ساتھ لے آئے۔ لیکن اس وقت تک وہ ماں کو اکیلا کیسے چھوڑے اور خود اس کے بغیر کیسے رہے؟ یہ بات ہمیشہ اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی تھی۔

ٹورنامنٹ کے تیسرے اور آخری دن فائنل میں آخری پانچ منٹ تک انگورا ڈا اور کھجوری کس کی ٹیمیں ایک ایک گول سے برابر جا رہی تھیں۔ حسب دستور گلباز گیند کے لے کھجوری کس کے ہاف میں داخل ہوا اور حسب دستور ہی اسے مخالف ٹیم والوں نے گھیرا مار کر تابو کر لیا۔ گلباز نے تنگ آ کر زور سے کک لگائی۔ گیند ایک مخالف کھلاڑی کے گھٹنے سے ٹکرا کر ہوا میں تیرتے ہوئے فتح کے پاس آ گئی جو گول کے پاس اکیلا کھڑا تھا۔ اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ کھجوری کس کا گول کیپر تک گلباز اور اس کے گرد ہجوم کی طرف متوجہ تھا۔ پی ٹی آئی صاحب نے ٹیم کی تربیت کے دوران بتایا تھا کہ گیند کو سر سے مار کر بھی پاس دیا جا سکتا ہے اور کھلاڑیوں کو اس کی مشق بھی کروائی تھی۔ فتح خان سر سے گیند مارتے ہوئے کتراتا تھا۔ اسے خدشہ ہوتا تھا کہ کہیں گیند اس کے چہرے پر نہ آ لگے۔ لیکن اس وقت سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں تھا۔ گیند ہوا میں گھومتی سیدھی اس کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے گیند کی قوس کے راستے میں سر رکھ دیا۔ گیند سر سے ٹکرا کر مڑی اور سیدھی گول کی جالی میں جا گری۔ تماشائیوں نے تالیاں اور سیٹیاں بجا کر میدان سر پر اٹھا لیا۔

قلعے کے کمانڈر صاحب نے کپتان گلباز کو کپ دیا۔ اس کے بعد انگورا ڈا ٹیم کے

Scanned with CamScanner

سارے کھلاڑی قطار بنا کر کھڑے ہو گئے اور کمانڈر صاحب نے ایک ایک کر کے سب سے ہاتھ ملانا شروع کر دیا۔

فتح خان قطار کے بیچ میں کھڑا تھا۔ 'کیا نام ہے تمھارا؟' وہ فتح کے آگے رک گئے۔

'ف فتح خان۔'

'بہت زبردست گول کیا تم نے۔ شاباش!' انھوں نے فتح خان کے کندھے پر تھپکی دی، اور آگے بڑھ گئے۔

اس کے بعد قلعے سے آنے والے ایک فوٹو گرافر نے چیمپیئن ٹیم کے تمام کھلاڑیوں کا گروپ فوٹو لیا۔ ساتھ میں سکول کے دوسرے لڑکے بھی آ کر کھڑے ہو گئے۔ آٹھویں جماعت والے لڑکے آلتی پالتی مار کر نیچے بیٹھے، ان کے پیچھے نسبتاً چھوٹے قد والے لڑکے کھڑے ہوئے، جب کہ آخر میں گلباز اور دوسرے لمبے لڑکے۔ ان کے ساتھ ہیڈ ماسٹر صاحب، پی ٹی آئی صاحب اور ڈرائنگ ماسٹر صاحب اور دوسرے استاد بھی کھڑے ہو گئے۔ سٹیل کا چمکتا ہوا کپ سب کے سامنے زمین پر رکھ دیا گیا۔

فتح خان دوسری قطار میں دائیں سے تیسرے نمبر پر کھڑا تھا۔

ہفتہ دس دن بعد تصویریں صاف ہو کر آئیں تو اس نے ایک دوست سے پانچ روپے قرض لے کر ایک تصویر خرید لی۔ فتح خان کو یہ تصویر بہت پسند تھی۔ اس نے اسے گوند کی مدد سے ایک پرانی کاپی کے گتے پر چپکایا اور برآمدے میں دروازے کے اوپر ٹھونک دیا۔ وہ اپنی ماں کو تمام ٹورنامنٹ، تصویر میں ایک ایک لڑکے کا نام اور اس نے کس میچ میں کیا کیا، خاص طور پر اختتامی لمحات کی تفصیلات بتاتے نہیں تھکتا تھا۔ دوپٹہ پھیلا کر بیٹے کی لمبی عمر کی دعا مانگتے ہوئے گل مینہ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔

احمد شاہ ابدالی کے پرتعیش خیمے کے پردے دیکھ کر میرا دھیان قندھار کے بازار کی طرف چلا گیا تھا۔ میرے ساتھیوں کو وطن کا سفر اختیار کیے کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ اب وہ شاید بخارا پہنچ بھی چکے ہوں۔ آہ بخارا۔ اس کا ہر وقت لوگوں سے معمور ریگستان بازار۔ سبز گنبد والی کوک مسجد۔ شہر کی حدوں سے اوپر آسمان کی وسعتوں سے ہم کلام مینار کلاں، جہاں سے خونیوں، لوطیوں اور سیاہ کاروں کو نیچے پھینکا جاتا ہے۔ بخارا کی شہ رگ گہری نیلی شری رود نہر جو دور زرافشاں دریا سے پانی بھر بھر لاتی اور شہر کی رگ رگ سینچتی ہے۔ میرے بچپن کا بڑا حصہ اس نہر میں نہانے کی حسرت میں گزرا۔ شاہی خرقے کے وارث کی حیثیت سے والد پسند نہیں کرتے تھے کہ میں دوسرے لڑکے بالوں کی طرح وہاں جا کر نہاؤں۔ آہ، میرے والد صاحب۔ شاہ صدرالدین بغدادی۔ ان کا پرنور، گمبھیر چہرہ میرے آگے گھوم گیا۔ آہ، خرقہ چھن جانے کے بعد ان کی بے قراری مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ جب وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر خانقاہ کے صحن میں گھنٹوں ادھر سے ادھر چکر لگاتے رہتے تو اپنے بستر پر لیٹے لیٹے میں کرب کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا تھا۔ میرا دل کرتا تھا کہ میں اٹھ کر باہر جاؤں اور انھیں دلاسا دوں لیکن ان کا رعب مجھ پر غالب آ جاتا۔ دوسری طرف میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر میں ہمت کر کے چلا بھی جاؤں تو ایسی ہر کوشش بے سود ثابت ہو گی۔ ان کے جگر میں جو کانٹا پیوست تھا جسے میں نکال نہیں سکتا تھا، اس لیے میں اندر پڑا کڑھتا رہتا اور باہر ان کی گردش جاری رہتی۔

بابا کا چہرہ یاد آنے سے میرا لہو ایک بار پھر کھولنے لگ گیا۔ ان کے بے قراری، ان کے جگر میں کانٹا چبھونے والا مجھ سے تین قدم کے فاصلے پر لیٹا تھا۔ میں اور آگے سرکتا ہوا چھپر کھٹ کے آگے پہنچ گیا اور کان لگا کر سانسوں کے آواز سننے کی کوشش کی، لیکن وہاں مکمل خاموشی چھائی

Scanned with CamScanner

تھی، اور ٹھنڈک۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے بستر سے ٹھنڈک خارج ہو کر آس پاس پھیل رہی ہے۔
میں نے اپنا خنجر ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ چاہے جو بھی ہو جائے، ابدالی میرے خنجر کی نوک کا ذائقہ چکھ کر ہی رہے گا۔ میرے دل کی دھڑکن اب متوازن ہو گئی تھی۔ اب اگر خیمے کے باہر سے کوئی محافظ اندر آ بھی جاتا ہے تو میرے پاس اتنا وقت موجود ہے کہ میں اپنا ہلالی خنجر ابدالی کے سینے میں پہنچا دوں۔ چاہے اس کے بعد وہ میرے ساتھ جو سلوک کریں، میں اپنا کام مکمل کر چکا ہوں گا۔ میں ابدالی کی پائنتی جا کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ سے اس کے چہرے سے لحاف اٹھایا۔

اف۔ اس کی سرد آنکھیں۔ وہ پشت کے بل لیٹا ادھ کھلی آنکھوں سے میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا وہ جاگ رہا ہے؟ کیا وہ خیمے کے اندر میری آمد سے باخبر تھا لیکن پھر اس نے آواز لگا کر محافظوں کو کیوں نہیں بلایا؟ لیکن ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے خنجر سر سے اوپر بلند کیا اور تاک کر عین اس کے دل کے اوپر سینے میں بھونک دیا۔ کھچ کی آواز آئی اور خنجر اس کی پسلی کاٹتا ہوا اندر تک چلا گیا۔ میں نے خنجر گھما کر باہر نکالا اور دوبارہ پوری قوت سے اس کے سینے پر وار کیا۔ وہ اسی طرح ادھ کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ خنجر کا مزہ چکھتے ہی اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکل کر خاموشی کو چکنا چور کر دے گی اور لمحوں کے اندر اندر اس کے محافظ خیمے میں آ کر میرا بدن تلواروں سے کاٹ کاٹ ڈالیں گے۔ میں نے بھی ٹھان لی تھی کہ بھرپور مقابلہ کروں گا اور کوشش کروں گا کہ مرتے مرتے ان میں سے ایک دو کو اپنے ساتھ لیتا جاؤں۔ مجھے اس بات کی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ مجھے زندہ گرفتار کر کے اس چرب زبان خواجہ سرا کے سامنے پیش کریں۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری موت انتہائی حد تک اذیت ناک بنا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے پر بدحواس محافظوں کے چند وار اور پھر ابدی سکون نہایت اچھا سودا تھا۔

لیکن ابدالی کے منہ سے چیخ تو کیا، کوئی آہ، کوئی سسکاری، کوئی آخری ہچکی تک برآمد

نہیں ہوئی۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ خنجر میرے ہاتھ سے قالین پر گر گیا۔ خود مجھے بھی چکر آ گیا، گھٹنے لچکے ہو گئے اور میں قالین پر ڈھیر ہو گیا۔

چند لمحوں بعد میرے اوسان بحال ہوئے۔ میں نے کہنیوں کے بل اوپر ہو کر دوبارہ چھپر کھٹ کی جانب دیکھا۔ ابدالی اوپر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سینے میں میرا خم دار خنجر دستے تک گڑا ہوا تھا اور وہ اسی طرح بے حس و حرکت تھا۔ دور خیمے کے دوسرے کونے میں شمع دان میں جلتی ہوئی موم بتی کی روشنی خنجر کے دستے میں جڑے یاقوت سے ٹکرائی تو مجھے احساس ہوا کہ دراصل ہوا کیا ہے۔ میں موم بتی اٹھا لایا جو اب اپنے آخری دموں پر تھی جس کی پھڑ پھڑاتی ہوئی لو کی روشنی میں ابدالی کا چہرہ اس کی داڑھی کی طرح سفید تھا۔ اس کی ناک پر چاندی کا خول چڑھا ہوا تھا، جس کے نیچے سے اس کے زخم کے پنجے بچھو کی طرح نکل کے دائیں رخسار اور اوپری ہونٹ تک پھیل رہے تھے۔

اسے مرے ہوئے کم از کم تین دن گزر چکے تھے۔

تو پھر موٹے سازشی خواجہ سرا نے کیوں کہا کہ ابدالی آرام کر رہا ہے اور مجھے نہیں مل سکتا؟ اس نے ابدالی کی موت سب سے کیوں چھپا رکھی ہے؟

مجھے خیال آیا کہ میں نے پچھلے ایک دن سے اس کے علاوہ کسی اور کو ابدالی کے خیمے میں جاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیے کھانا بھی خود ہی لے کر اندر جاتا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن مجھے کہیں کھانا یا خالی برتن نظر نہیں آئے۔ شاید وہ خود کھانا کھا کر برتن واپس لے جاتا ہو گا۔ آخر وہ بدبخت کیا کھیل کھیل رہا ہے؟ وہی الف لیلہ و لیلہ کی کہانیاں۔ کہیں وہ خود تو ابدالی کی جگہ تخت پر نہیں بیٹھنا چاہتا؟ لیکن قندہار میں آمد کے دن ہی جو جشن برپا تھا وہ اس کے چھوٹے بیٹے مرزا تیمور شاہ کے ولی عہد مقرر کیے جانے کی خوشی میں تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ابدالی کے بڑے بیٹے سلیمان کے علاوہ متعدد درباریوں نے بھی اس پر ناخوشی ظاہر کی تھی لیکن بالآخر ابدالی کی جانب سے مرزا تیمور کی رحم دلی اور ذہانت کی دلیل پانے کے بعد وہ بھی قائل ہو گئے تھے۔ ان سب کے

Scanned with CamScanner

ہوتے ہوئے کوئی خواجہ سرا کیسے تخت پر بیٹھنے کے خواب دیکھ سکتا ہے؟

سوچتے سوچتے میرا سر چکرانے لگا اور میں قالین پر ہی بیٹھا رہا۔ آخر کسی وقت ہوا سے خیمے کا پردہ پھڑ پھڑایا تو مجھے ہوش آیا۔ میں نے خنجر ابدالی کے سینے سے نکال کر اسے نیام میں رکھا۔ ابدالی کے اوپر لحاف برابر کیا اور خیمے کے پچھلے حصے میں واقع شگاف سے باہر نکل آیا۔

سو گل مینہ یہ ہے کل کہانی خرقہ شریف کی جو ملا داؤد کی فرمائش پر خرقہ شریف درگاہ کے ایک مجاور نے سنائی۔ اس نے بتایا کہ شمس الدین بابا ابدالی کے خیمے سے نکل کر ادھر ادھر بھٹکتا ہوا ہفتوں بعد اس وقت قندھار پہنچا، جب تیمور بادشاہ بن چکا تھا۔ شمس الدین کا دماغ چل گیا تھا اور وہ شہر کی سڑکوں پر گھومتا، آسمان سے باتیں کرتا، کبھی بلاوجہ ہنسنا اور کبھی رونا شروع کر دیتا۔ کسی نے کچھ کھانے کو دے دیا تو لے لیا، ورنہ بھوکا کسی بھی گلی میں پڑ رہتا۔ اس کے کپڑے چیتھڑا بن گئے، بال اور داڑھی ہندوؤں کے جٹا دھاری سادھوؤں کی طرح ہو گئی۔ سال دو سال بعد وہ درگاہ کے عقب میں بخارا سے لائی گئی چٹان کے چھجے تلے رہنے لگا۔ درگاہ کے متولی اسے کبھی کبھی کچھ کھانے کو دے دیتے تھے۔ کبھی کبھار وہ اپنے آپ میں آتا تو بخارا، شہر اور خرقہ شریف کی باتیں کرتا۔ یہ جو واقعات میں نے تمھیں سنائے، یہ اس نے درگاہ کے موجودہ متولی کے پرکھوں سے کبھی بیان کیے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے جد نے یہ باتیں اپنے پاس لکھ لی تھیں جو کسی کتاب میں شائع بھی ہوئی تھیں۔ میری فرمائش پر اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے کتب خانے میں سے وہ کتاب ڈھونڈ کر مجھے لا دے گا۔ تم بھی پڑھنا، بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔

گل مینہ سے بار بار ایک ہی سوال پوچھا جاتا تھا: وہ لیاقت باغ میں کیا کر رہی تھی اور اس کا بے نظیر بھٹو پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں سے کیا تعلق ہے؟ اس سے قطع نظر کہ اس کتنا ڈرایا دھمکایا جاتا، کتنی بار چیخ چیخ کر مختلف الفاظ میں اس سے پوچھا جاتا، گل مینہ منہ بند اور نظریں کرسی کے پائے پر جمائے رکھتی۔ اس کی آنکھوں کے آگے فتح خان اور بے نظیر کے چہرے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے تھے اور پھر دھویں کے مرغولوں میں تحلیل ہو جاتے تھے۔

کل رات گل مینہ کا برقع اور قمیص چاقو سے کاٹنے کے بعد اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر اس عمارت میں لایا گیا تھا جہاں ہر طرف راہداریاں ہی راہداریاں تھیں۔ ایک نرس نے اس کے زخموں پر دوائی لگا کر پٹی باندھ دی تھی جس نے اس کی چھاتی اور پیٹ ڈھانپ دیا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹ جانے کے بعد اسے نیلے رنگ کے موٹے کپڑے کا ڈھیلا ڈھالا جوڑا دیا گیا تھا، جو کچھ کچھ ایسا ہی تھا جو نرس نے پہن رکھا تھا۔ اس نے سراسیمہ ہو کر پگڑی کا ٹکڑا ڈھونڈنے کی کوشش کی جو اس کے برقعے کی جیب میں تھا۔ رات اس کا برقع بھی پھٹ گیا تھا، وہ اسے واپس نہیں ملا۔

اس دوران نرس نے اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی تھی لیکن گل مینہ نے لب سلے رکھے تھے۔

گل مینہ کے پہلو سے ٹیس اٹھی وہ کراہ دی۔ اس نے اپنے پہلو پر ہاتھ پھیرا۔ بائیں چھاتی کے نیچے جہاں چاقو گہرا لگا تھا وہاں سے درد کی لکیر نیچے تک چلی گئی تھی۔

اب گل مینہ سے پوچھ گچھ کے لیے ایک عورت کو بلایا گیا جسے دوسرے لوگ میڈم رخسانہ کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ اس کے جبڑے خاصے چوڑے تھے اور بال کنپٹیوں پر سے سفید ہو رہے تھے لیکن اس نے انھیں کالا کرنے کی زحمت محسوس نہیں کی تھی۔ گل مینہ کو بڑی حیرت

Scanned with CamScanner

ہوئی کہ وہ مردوں کی طرح کھلے عام سگریٹ پیتی تھی۔ گل مینہ سے تفتیش کے دوران سوال پوچھتے وقت سگریٹ مسلسل اس کی انگلیوں میں سلگتا رہتا تھا۔ ایک سگریٹ ختم ہوتا تھا کہ وہ اسے فرش پر مسل کر دوسرا سلگا لیتی۔ وہ پشتو بول رہی تھی لیکن یہ گل مینہ کی پشتو نہیں تھی۔ اس کا لہجہ بہت عجیب سا تھا اور وہ بعض لفظوں کو بڑے عجیب طریقے سے ادا کرتی تھی۔ گل مینہ کو شروع میں اس کی کسی بات کی سمجھ نہیں آئی اور وہ سمجھی کہ شاید یہ کوئی اور زبان ہے اس لیے اس نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ پشاور کے اطراف کی زبان بول رہی ہے۔ گل مینہ نے صرف ایک بار اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے کسی قسم کا میک اپ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، اور کپڑے بھی شکن آلود تھے۔ گل مینہ نے اپنا منہ سختی سے بند رکھا اور اپنی حرکات و سکنات سے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس کی کوئی بات اس کے پلے پڑ رہی ہے۔

گل مینہ سے روزانہ دو تین بار پوچھ گچھ کی جاتی تھی۔ وہ ہر سوال کے جواب میں خالی خالی نظروں سے میز پر پڑے کپڑے کو دیکھتی رہتی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں اسے کتنے دن گزر گئے ہیں۔ شاید پانچ دن، شاید ایک ہفتہ۔ بدترین دھمکیوں کے باوجود ایک دو تھپڑوں کے علاوہ اب تک اس کے اوپر کسی قسم کی سختی نہیں کی گئی تھی، جس کی وجہ شاید اس کے پہلو کا زخم تھا۔

میڈم رخسانہ کہہ رہی تھی: 'دیکھو میں تمھارے ساتھ بڑی نرمی اور شرافت سے پیش آ رہی ہوں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ تمھارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ زبان تو تمھیں ہر حال میں کھولنا پڑے گی، آج نہیں تو کل، لیکن اس دوران تمھارا حشر نشر ہو جائے گا، اس لیے اپنے اوپر مہربانی کرو اور جو میں پوچھ رہی ہوں وہ بتا دو۔' گل مینہ نے اپنا چہرہ بالکل جھکا لیا تھا، رخسانہ نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھا دیا۔ 'عورت، میں آخری بار پوچھ رہی ہوں، تم کل وہاں کیا کر رہی تھیں؟ اگر اب تم نے جواب نہیں دیا تو میں تمھارے اوپر آوارہ کتے چھوڑ دوں گی!' یہ کہہ کر میڈم رخسانہ نے اس کے دائیں گال پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔

گل مینہ کے پہلو کے زخم سے ایک شعلہ سا نکلا اور وہ اپنی بغل پکڑ کر جھک گئی۔

شاید اس کے زخم کے ٹانکے کھل گئے تھے۔ اس نے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے تاکہ منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکے۔ اس نے بہت پہلے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ان لوگوں کی کسی بات کا جواب نہیں دے گی۔ فتح خان کے بعد اب مجھے کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بے شک میرے بدن سے بوٹیاں نوچ لی جائیں۔

شام کو اسے ایک لمبے کمرے میں پہنچایا گیا۔ یہاں ایک لمبی میز کے پیچھے چھ سات مرد بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں میڈم رخسانہ بھی تھی۔ ایک ترشی ہوئی داڑھی والے نے نسبتاً ملائم لہجے میں اس سے پوچھا، 'بی بی تمھارا نام کیا ہے؟ تمھارا تعلق کس علاقے سے ہے؟' اس کی پشتو رخسانہ کی زبان سے مختلف تھی۔ شاید بنوں کی زبان۔ گل مینہ چپ رہی۔ اس کے بعد ایک اور آدمی نے کچھ کہا جو گل مینہ کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ پھر کسی نے دری میں یہی سوال دہرایا۔ گل مینہ کو دری بولنے میں تھوڑی مشکل ہوتی تھی لیکن افغانستان میں اتنا عرصہ رہنے کے بعد وہ اسے سمجھ اچھی طرح لیتی تھی۔

ترشی ہوئی داڑھی والے نے کسی سے اردو میں پوچھا، 'کیا یہ ممکن ہے یہ عورت بہری ہو، یا مکمل بہری نہ سہی، بہت اونچا سنتی ہو؟'

'نہیں سر، ہم نے چیک کروا لیا تھا۔ دروازے پر دستک ہو تو یہ ادھر دیکھتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ گونگے بہرے ہونے کا ڈراما کر رہی ہے۔'

'رخسانہ، مجھے غالباً تمھیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ کیس ہم سب کی زندگیوں کا شاید سب سے اہم کیس ہے۔ ہم نے تمام کام چھوڑ کر اپنی ساری توانائیاں اور اپنے تمام وسائل یہاں لگا دیے ہیں۔ میرے تین یونٹ اسی پر کام کر رہے ہیں۔ ہمیں دوسری جگہوں سے کچھ لیڈز ملی ہیں اور ادھر دن رات کام ہو رہا ہے، لیکن اس عورت کا بولنا بہت ضروری ہے، اس سے ہمیں بہت اہم سراغ مل سکتا ہے، میں تمھیں ایک دن اور دے رہا ہوں، کل مجھے ہر حال میں رپورٹ چاہیے۔'

Scanned with CamScanner

یہ کہہ کر ترشی ہوئی داڑھی والا اور اس کے ساتھی اٹھ کر چلے گئے۔ کمرے میں رخسانہ اور گل مینہ اکیلے رہ گئے۔ 'سنا تم نے؟' رخسانہ نے کہا۔ 'یہ میرے بڑے افسر تھے۔ ان کے سامنے ذلیل کروایا ہے تم نے مجھے۔ میں تمھارے ساتھ بہت شرافت سے پیش آ رہی ہوں، لیکن لگتا یہی ہے کہ تمھیں شرافت راس نہیں آ رہی۔ ابھی میں تمھیں اپنے کمرے میں بھجوا رہی ہوں، لیکن ایک گھنٹے بعد میں ایک خاص بندے کو لے کر تمھارے پاس آؤں گی جو تم جیسوں کی زبان کھلوانے کا فن جانتا ہے۔ میں نے اب تک تمھارے ساتھ شرافت کا برتاؤ کیا ہے لیکن تم اس کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔ تمھارے پاس دو گھنٹے ہیں، اس وقت تک اچھی طرح سوچ لو کہ تم نے میرے ساتھ سیدھی طرح تعاون کرنا ہے یا پھر میں کوئی اور راستہ اختیار کروں۔'

یہ کہہ کر رخسانہ اٹھ کر چلی گئی۔ دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور گل مینہ کی ہتھکڑی والی زنجیر پکڑ کر اسے اٹھا دیا۔ ان میں سے ایک نے گل مینہ کے سارے بدن پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا، 'میں تو کہتا ہوں کہ میڈم ویسے ہی وقت ضائع کر رہی ہیں۔ اسے صرف آدھے گھنٹے کے لیے میرے حوالے کر دے۔ میں سارا کچھ اگلوا لوں گا اس سے۔'

دوسرا ہنسنے لگا۔ 'تم آدھا گھنٹہ کہہ رہے ہو، میں نے پندرہ منٹ میں اس کی زبان تو کیا سب کچھ نہ کھول کے رکھ دیا تو مونچھیں کٹوا دینا۔ چل آگے!' اس نے گل مینہ کی زنجیر کو جھٹکا دیا اور دونوں کا قہقہہ کمرے میں گونج گیا۔

گل مینہ ان دونوں کے پیچھے پیچھے لبے کمرے سے باہر نکلی اور وہ تینوں راہداری سے ہوتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف واپس جانے لگے۔ گل مینہ کے دائیں ہاتھ میں ہتھکڑی تھی جس کا دوسرا حصہ ایک اہلکار نے اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔

گل مینہ راہداری میں چلتے ہوئے اپنی نظریں فرش پر رکھتی تھی لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے دائیں طرف کے ایک کھلے دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس کے قدم رک گئے۔ ہتھکڑی تھامے ہوئے اہلکار نے زنجیر ہلا کر اسے چلنے کا اشارہ کیا لیکن گل مینہ کے قدم

جیسے فرش میں گڑ گئے تھے۔ سپاہی نے دوبارہ ہتھکڑی کو جھٹکا دیا لیکن وہ وہیں جمی رہی۔

'میں کہتا ہوں چل!' سپاہی نے اسے زنجیر کھینچ کر گھسیٹنے کی کوشش کی۔ گل مینہ کے منہ سے چیخ نکلی، 'فاااتح ح ح ۔۔۔ میرا بچہ۔'

اندر کمرے میں ایک کھچڑی داڑھی والا آدمی ایک سفید بورڈ پر فتح خان کی تصویر بنا رہا تھا۔

اس سے پہلے فتح خان کو خطیب صیب نے کبھی نہیں بلایا تھا اس لیے جب نصیب گل نے اسے پیغام دیا تو وہ بڑا حیران ہوا۔ فتح خان خطیب صیب کے حجرے میں پہنچا تو وہاں ان کے علاوہ دو اور مرد بھی سبز دری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کمانڈو وردیاں پہن رکھی تھیں اور قریب ہی ان کی کلاشنکوفیں پڑی تھیں۔

فتح جھجکتا ہوا دہلیز سے اندر داخل ہوا تو خطیب صیب نے اسے ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فتح دروازے کے قریب ہی بیٹھ گیا تاہم اس نے دیوار سے ٹیک نہیں لگائی۔

'فتح خان، خطیب صیب نے دھیمی آواز میں کہا۔ تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے والد کہاں اور کیسے شہید ہوئے تھے؟'

'ش شکین میں، خطیب صیب، اماں نے بتایا تھا۔'

'یہ تمھارے شہید والد کے ساتھی ہیں، یہ سربلند خان ہے اور اس کے ساتھ جو بھائی بیٹھا ہے وہ مقرب خان ہے۔ یہ دونوں آخری وقت پر اس کے ساتھ تھے۔ تمھارے والد نے اپنی جان پر کھیل کر ان کی زندگیاں بچائی تھیں۔'

'جی خطیب صیب، بالکل سئی کہا آپ نے،' سربلند خان نے کہا۔ اس کی گھنی سیاہ داڑھی غالباً تازہ لگائے ہوئے سرسوں کے تیل سے چمک رہی تھی، اور ماتھے پر زخم کا نشان تھا جو دائیں آنکھ کے اوپر سے شروع ہو کر اس کی چترالی ٹوپی میں گم ہو گیا تھا۔ فتح کو وہ شکل اور لہجے سے ان علاقوں کا نہیں لگا۔ اسے معلوم تھا کہ بہت سے مجاہد پنجاب سے آئے ہیں اور قبائل کے ساتھ مل کر لڑ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بھی ادھر ہی کا ہو۔

'مجھے وہ دن ایسا یاد ہے جیسا آج صبح۔ ہم لوگ انگور اڈا میں تھے کہ ہمیں اوپر سے حکم

ملا سرحد کے پار شکین میں امریکی کا نیا پلاٹون آ رہا ہے، اس سے پہلے کہ وہ علاقے سے پوری طرح واقف ہو جائے، اس پر حملہ کرنا ہے۔ ہم نے ایک ہفتہ سر جوڑ کر سارا منصوبہ تیار کیا۔ بزدل دشمن زیادہ وقت اپنا قلعہ میں رہتا تھا، باہر بہت کم نکلتا تھا اور وہ بھی اپنا ہموی گاڑی میں جس پر گولی اثر نہیں کرتا۔ تمھارے والد زرجانان خان اور میں نے خشک ندی میں تین ٹینک والے مائن دبائے اور ان کو لمبی تار سے جوڑ دیا۔ زرجانان کو مائن اور بم وغیرہ کا اتنا پتہ نہیں تھا لیکن کیا مجال کہ اس کو ذرا بھی پروا ہو کہ یہ مائن چار انچ لوہے کی پلیٹ کو چھینٹ کی چادر کی طرح تار تار کر سکتی ہے۔ واللہ کیا نڈر بچہ تھا، میں کہتا تھا کہ تھوڑی احتیاط کرو، امریکیوں کے پاس رات کو دیکھنے والا دوربین ہے، وہ قلعے کے برج سے ہمیں دیکھ نہ لے، لیکن اس نے کہا کہ سردی ہے، رات کا ٹیم ہے، اس وقت کافر سارا شراب کے نشہ میں چور پڑا ہوگا۔ خیر میں نے مائن کھود کر دبا دیں، زرجانان میری مدد کرتا رہا، پھر ہم تار اوپر جنگل میں لے گئے اور تار پر مٹی اور گھاس پتہ ڈال دیا۔ ہم سارا رات وہیں پڑا رہا۔ ادھر بس پتھر تھے اور چھوٹے چھوٹے جھاڑی جتنے چیڑ کے درخت تھے جن کے اندر انسان بیٹھ کر آسانی سے چھپ سکتا ہے، لیکن کھڑا ہو جائے تو سر نظر آتا ہے۔

'زرجانان تو ویسے بھی ہم سب مجاہدوں میں سب سے لمبا تڑنگا تھا اس لیے میں اسے بار بار سر نیچا رکھنے کو کہتا تھا۔ کھانے کے لیے ہمارے پاس صرف کچھ بادام اور کشمش تھی، ساری رات انھی پر گزارا کیا۔ اگلے دن صبح برل کی طرف سے ہمارا ساتھی نے راکٹ سے حملہ شروع کیا۔ ایک قلعے کی دیوار سے ٹکرایا، دو قلعے کے اندر جا گرے۔ اس پر امریکی جاگ گئے اور قلعے کے برج سے برسات کی طرح فائر شروع ہو گیا۔ کچھ ہموی گاڑیاں نکلیں لیکن وہ اوپر قلعے کے پاس ہی رہیں، نیچے نہیں آئیں۔ تم نے کبھی ہموی گاڑی دیکھی ہے؟ ٹی وی پر تو دیکھی ہوگی؟' سربلند خان نے فتح خان سے پوچھا۔

فتح خان نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے خاموشی سے یہ سارا واقعہ سن رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کے باپ کی تصویر گھوم رہی

Scanned with CamScanner

تھی جب وہ ارغنداب میں شام کے وقت گھر کی طرف آتا اور فتح کو خبر ہو جاتی تو وہ دوستوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے کنچے یا فٹبال وہیں چھوڑ چھاڑ کر پورے بدن کا زور لگا گلی میں بھاگتا اور گلہری کی طرح چھلانگ لگا کر زرجانان خان سے لپٹ جاتا تھا۔ زرجانان اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھیلے زمین پر رکھ کر ہنستے ہنستے فتح کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر اتنا بلند کر دیتا کہ فتح خان آس پاس کی پہاڑیوں سے اونچا ہوا اپنا سر نیلے آسمان قریب پہنچتا ہوا محسوس کر دیتا تھا۔ پھر وہ اسے تین چار گھمیریاں دے کر جب زمین پر اتارتا تھا تو فتح کو یوں لگتا جیسے تمام ارغنداب اور اس کے آس پاس کی پہاڑیاں اس کے گرد گول گول گھوم رہی ہیں۔

زرجانان کی جیب ٹافیوں اور چیونگ گموں سے بھری ہوتی تھی اور وہ خود ہی ان میں سے ایک کے اوپر لپٹا رنگین کاغذ ہٹا کر اسے فتح کے منہ میں ڈال دیتا تھا، اور پوچھتا تھا، 'فتح خان، باپ کی جان، ماں کا خیال رکھتا ہے یا نہیں؟' باپ بیٹا جب گھر میں داخل ہوتے تو گل مینہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہوتی اور منہ سے کچھ بولے بغیر زرجانان کے ہاتھ سے تھیلے لے لیتی اور صحن میں انگور کی بیل کے نیچے پڑی چارپائی کو ہاتھ سے جھٹک کر تکیہ سیدھا کر لیتی۔ فتح خان بھی اچک کر چارپائی پر باپ کے ساتھ چڑھ بیٹھتا اور اس کی پیٹ پر اچھلنے کودنے لگتا تو چولھے میں آگ جلاتی گل مینہ وہیں سے پکار کر کہتی، 'فتح، باپ کو زیادہ تنگ نہ کرو، دور سے آئے ہیں، تھکے ہوئے ہوں گے۔' اس موقعے گل مینہ کا چہرہ یوں دمک رہا ہوتا جیسے خواجہ خضر کی برفیلی چوٹی صبح سویرے سورج کی پہلی کرن پڑنے سے چمکتی ہے۔

گل مینہ پھر لوٹے میں پانی لے آتی اور اپنے خاوند کے ہاتھ پاؤں دھلواتی اور وہ اس کے پلو سے ہاتھ پونچھ کر تکیے سے ٹیک لگا فتح خان کو اپنے قریب لے آتا اور اسے اپنے سفر کے بارے میں ایسی دلچسپ اور عجیب باتیں سناتا کہ فتح خان منہ کھولے ہوئے اس کی ایک ایک بات دل پر نقش کرتا جاتا۔

'اکرام اللہ، برمل سائیڈ سے حملہ کرنے والوں میں تم بھی شامل تھے نا؟' خطیب صیب

نے سربلند خان کے پاس بیٹھے ہوئے شخص کو مخاطب کیا جو اب تک آلتی پالتی مارے خاموشی سے بیٹھا تھا۔

'جی خطیب صیب، شکین قلعہ میں تین سو سے زیادہ امریکی فوجی تھے۔ ہمارا پلان تھا کہ ہم مغرب کی طرف سے حملہ شروع کر کے جنوب میں آ جائیں گے اور پھر چھوٹی پہاڑی کے پیچھے سے گھوم کر اس درہ کی طرف نکل جائیں گے جہاں سربلند خان اور زرجانان نے مائن لگا رکھی تھی، لیکن خانہ خراب امریکی ہم سے پہلے پہاڑی پر پہنچ گیا اور ساتھ میں شکین قلعہ کے برج سے بھی تیز فائر شروع کر دیا۔ ہمارے دو مجاہد شہید ہو گئے، ایک اور مجاہد کو گولی لگ گئی، دو ساتھی اسے پیچھے لے گئے اور اس کی پٹی کرنے لگے۔ اس لیے ہم آگے نہیں جا سکے اور پہاڑی کے پیچھے ہی رک کر وہیں سے قلعے پر فائر کرنے لگے۔ اتنے میں اڈے کی طرف سے بھی ہمارے ساتھیوں نے راکٹ لانچر چلانا شروع کر دیا۔ میں نے خود تین امریکی کو کتے کی طرح اچھل کر گرتے دیکھا۔'

'ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ تم وہیں رک گئے ہو اور آگے نہیں آ سکتے،' سربلند خان نے کہا۔ 'لیکن ہم اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے تھے، اور نہ ہی فائر کر سکتے تھے تاکہ امریکی کو ہماری جگہ کا پتہ نہ چلے۔ پھر کچھ اور ہموی گاڑیاں بھی قلعے سے نکل آئیں اور تمھاری طرف فائرنگ شروع کر دی۔ لیکن اس طرف کوئی گاڑی نہیں آ رہی تھی جدھر مائن لگی تھی۔ پانچ گھنٹہ تک فائرنگ ہوتی رہی۔ ہمارے کچھ ساتھی شہید ہوئے اور کافر بھی مردار ہوا کیوں کہ ہم نے دیکھا ایک میڈیکل کاپٹر بھی اوپر آ گیا، (اس کو وہ بلیک ہاک بولتے ہیں) لیکن ہمارے اڈے والے ساتھیوں نے اس پر اتنا فائر کیا کہ وہ گیدڑ کا اولاد دم دبا کر وہاں سے بھاگ گیا۔ دشمن کے پاس اپاچی ہیلی کاپٹر بھی تھے لیکن وہ ابھی آئے نہیں تھے اور ہم چاہتے تھے کہ ان کے آنے سے پہلے پہلے کام ختم کر دیں۔

'پھر زرجانان خان نے مجھ سے کہا کہ ایسا کام نہیں چلے گا، میں کافر کو ادھر کر آتا ہوں۔ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا لیکن بازو چھڑا کر چیڑ کے درختوں کی آڑ میں ہوتا ہوا نیچے وادی میں اتر

گیا۔ امریکی نے اس کو دیکھ لیا مگر وہ پتھر کے پیچھے چھپ جاتا تھا اور پھر وہاں سے فائر کر کے دوسرے پتھر کے پیچھے چلا جاتا تھا۔ اس طرح کرتے کرتے وہ دو ہموی کو اپنے پیچھے لگا کر مائن والی جگہ پر آ گیا۔ میں اوپر چوٹی پر درختوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ زرجانان بھاگتا ہوا مائن کے اوپر سے گزر گیا، اس کے پیچھے پیچھے ہموی دھول اڑاتی، پتھروں پر اچھلتی، برسٹ مارتی ہوئی آ رہی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ زرجانان بھاگتے بھاگتے زمین پر گر گیا۔ میں انتظار کرتا رہا کہ وہ اٹھے لیکن وہ بالکل نہیں ہل رہا تھا۔'

فتح خان اس وقت بھی منہ کھولے ہوئے سربلند خان کی بات سن رہا تھا۔ جب بھی سربلند خان کے ہونٹوں پر زرجانان کا نام آتا، فتح خان کے سینے سے ایک گولہ سا اٹھتا اور حلق میں آ کر پھنس جاتا۔ اسے بار بار آنکھیں پنک پنک کر آنسوؤں کو نکلنے سے روکنے کی کوشش کرنا پڑتی تھی۔ اس کے باوجود ایک آنسو اس کی بائیں آنکھ کے کونے سے آہستگی سے سرکتا ہوا نکلا اور رخسار پر آ کر ٹک گیا۔ فتح خان نے سوچا کہ اسے پونچھ دے لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔

'میں سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں،' گل مینہ نے پہلی بار میڈم رخسانہ کے سامنے زبان کھولی۔ اس کے ساتھ ہی کرسی پر اس کے بیٹے کی تصویر بنانے والا بھی بیٹھا تھا، جس کے ہاتھوں سے کل گل مینہ نے تصویریوں چھینی تھی کہ اس کے کچے رنگ اس کے ہاتھوں اور آستین پر لگ گئے تھے۔ 'میں سب کچھ بتا دوں گی، لیکن پہلے میری ایک شرط ہے۔ مجھے میرے فتح خان کی قبر دکھا دو تا کہ میں وہاں جا کر کم از کم اس کی جواں مرگ پر بین کر سکوں، اپنے دل کی بھڑاس نکال سکوں۔'

گل مینہ کی آنکھوں سے آنسو مسلسل رواں تھے۔ اس نے فتح خان کی تصویر ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ شفیق نے بتایا تھا کہ وہ تصویر اس نے یادداشت سے بنائی تھی لیکن پھر بھی وہ فتح خان کا کردار ابھارنے میں کامیاب رہا تھا۔ فتح ہلکی ہلکی مونچھیں کے نیچے مسکراہٹ چھپانے میں کوشاں تھا۔ اس کی آنکھیں براہِ راست گھورنے کی بجائے دیکھنے والے کے بائیں کندھے کے پار کسی چیز کی متلاشی تھیں۔ فتح نے سر پر سفید ٹوپی پہن رکھی تھی، جس کے نیچے سے اس کے گھنے بھورے بال، زرجانان کے بال، جھانک رہے تھے۔ تصویر کے پس منظر میں شفیق نے نیلا آسمان بنایا تھا اور پھر شاید خالی جگہ پر کرنے کے لیے تین عدد کونجیں بھی بنا ڈالی تھیں، دو اس کے بائیں کندھے کے اوپر اور ایک تصویر کے دائیں طرف۔

میڈم رخسانہ نے کہا: 'ہم تو سمجھ بیٹھے تھے کہ تم گونگی بہری ہو۔ شکر کرو کہ تمھاری زبان کھلوانے کے لیے کوئی ہتھکنڈا نہیں اپنانا پڑا، ورنہ سب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے والا تھا۔ تمھیں کوئی اندازہ نہیں کہ یہ کتنا بڑا کیس ہے اور ہم پر کتنا دباؤ ہے۔ خیر، شروع سے بتاؤ، فتح خان تمھارا کون تھا؟'

Scanned with CamScanner

'میرے جگر کا ٹکڑا تھا۔ کسی کو کیا معلوم، میں جانتی ہوں اور میرا خدا! کہ میں نے کن مشکلوں سے اسے پالا تھا۔ اس کی خاطر میں نے کیا کیا قربانی نہیں دی۔ ہائے، ظالموں نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ خدا ان کا بیڑا غرق کرے۔ ان کے بچے ان کے سامنے تڑپ تڑپ کر مریں۔' گل مینہ سر پر ہاتھ رکھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔

'فتح خان کو کس نے بھیجا تھا؟'

'یہ تو میں تم لوگوں سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ اسے کس نے بھیجا تھا۔ مجھے وہ مل جائیں تو میں ان کا منہ نوچ لوں، کلیجہ نکال کر کچا چبا جاؤں۔ لیکن پہلے مجھے فتح کی قبر پر لے جاؤ۔'

رخسانہ نے شفیق کی طرف دیکھا اور پھر اپنا کان کھجانے لگی۔ شفیق بولا: 'بہن جی، میں نے فتح خان کے ساتھ مدرسے میں کچھ وقت گزارا ہے۔ بہت نیک اور سعادت مند بچہ تھا۔ بس غلط ہاتھوں میں پڑ گیا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غلط حالات میں گھر گیا تھا۔ اس کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔'

'مجھے نہیں پتہ کون غلط ہے، کون صحیح، جو بھی ہے بس مجھے اس کی قبر پر لے جاؤ۔ مجھے اس کے باپ کی لاش یا قبر دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس زخم سے ابھی تک خون رس رہا ہے۔ خدا کے لیے مجھے فتح کی قبر پر لے جاؤ۔ کہتے ہیں کہ قبر پر جانے سے دل کو قرار آ جاتا ہے۔ میرا دل ناسور بن چکا ہے، شاید اسے کچھ سکون ملے۔'

'گل مینہ، تمھیں نہیں پتہ کہ کیا حالات چل رہے ہیں، ہمارے اوپر کتنا دباؤ ہے،' میڈم رخسانہ نے کہا۔

'کسی ماں کے لیے اس کے گود کے پالے لال کی موت سے بڑھ کر کیا حالات چلیں گے؟ اور اس سے بڑھ کر ظلم یہ ہے کہ اسے اپنے اکلوتے بیٹے کی قبر دیکھنے بھی نہیں دی جا رہی۔ اے خدا کہاں ہے تو؟ اس ظلم پر، اس زیادتی پر تیرے قہر کی بجلیاں کیوں نہیں گرتیں؟'

رخسانہ نے سر جھکا لیا۔ شفیق بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خاصی دیر سوچ میں گم رہنے کے بعد اس نے سر اٹھا لیا۔ 'ٹھیک ہے، گل مینہ، وعدہ تو نہیں لیکن میں پوری کوشش کروں گی کہ تمھیں اس کی قبر پر لے جاؤں۔ لیکن اس سے پہلے تمھیں سب کچھ صاف صاف بتانا ہو گا۔'

Scanned with CamScanner

فتح خان خطیب صیب کے کمرے میں دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا سربلند خان کو بولتے ہوئے سن رہا تھا اور اس کا ذہن ماضی کے ملگجوں میں کھویا ہوا تھا۔

فتح کو یاد نہیں تھا کہ اسے کبھی باپ نے مارا تو ایک طرف رہا، کبھی ڈانٹا تک ہو۔ انگوراڈا میں ان کے پڑوس میں رہنے والے فہیم کا باپ تو اتنا غصیلا تھا کہ کبھی کبھی اسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیتا تھا۔ ایک بار تو اس کا بازو بھی توڑ دیا تھا وہ بے چارہ ہفتوں تک گلے میں لٹکائے لٹکائے پھرا۔ فتح اپنی ماں کو بہت تنگ کیا کرتا تھا، اور وہ ہمیشہ کہتی کہ آنے دو تمھارے باپ کو، ساری باتیں ایک ایک کر کے بتاؤں گی، پھر دیکھنا وہ کیا حشر کرتا ہے تمھارا۔ اکثر تو ماں کی دھمکی دھمکی ہی رہتی تھی لیکن فتح کو وہ دن بھی یاد تھا جب ایک دن اس نے واقعی شکایت لگائی تھی شاید فتح سات آٹھ سال کا تھا اور وہ ارغنداب میں رہتے تھے۔ اس دن جب سخت گرمیوں میں زرجانان سفر سے واپس آ کر چارپائی پر بیٹھا تو گل مینہ نے اسے پنکھا جھلتے ہوئے واقعی فتح کی شکایت لگانا شروع کر دی۔

'سنبال لو اپنے بیٹے کو، روز بروز بگڑتا چلا جا رہا ہے، مجھ سے نہیں سنبھلتا اب، نہ بات سنتا ہے، نہ چشمے سے پانی بھر کر لاتا ہے، نہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کرنے جاتا ہے۔ ساتھ والے لڑکوں کو دیکھو، انھوں نے سردیوں کے لیے خشک لکڑیوں کا پورا ڈھیر لگا رکھا ہے۔'

زرجانان مسکراتے ہوئے یہ ساری باتیں سنتا رہا، کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی تھی۔ اس نے مصنوعی غصے سے کہا، 'کیوں نالائق، ماں کی بات کیوں نہیں سنتا، جب میں نہیں ہوتا تو تو ہی گھر کا مرد ہے، آئی سمجھ؟' یہ کہتے کہتے اس نے گل مینہ کی آنکھ بچا کر فتح خان کو آنکھ ماری اور کھجانے کے بہانے انگلی سر کے قریب لا کر گول گول گھما دی۔ لیکن گل مینہ نے دیکھ

لیا۔ 'جی جی، آخر کس پر گیا ہے صاحبزادہ، جیسا تنا ویسی شاخ، اور بگاڑ دا سے، میں تو کہتی ہوں کہ جب ہاتھ سے نکل جائے تو پھر پوچھوں گی میں کہ اب بتاؤ۔' اس پر دونوں باپ بیٹا اس قدر کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ گل مینہ دستی پنکھا وہیں پھینک کر اندر چلی گئی۔

'میں نے کئی سیکنڈ زرجانان کے اٹھنے کا انتظار کیا لیکن وہ خشک ندی میں ریت پر منھ کے بل پڑا رہا۔ پھر ایک ہموی قریب آئی اور اس نے ایک برسٹ مارا اور میں نے زرجانان کے کپڑے ہلتے اور اوپر اٹھتے ہوئے دیکھے۔ میں نے اللہ اکبر کہا اور ڈیوٹیٹر دبا دیا۔ یقین کرو کہ چھ ٹن کی ہموی ماچس کی ڈبیا کی طرح ہوا میں اچھلی اور سامنے جا کر ندی کے کنارے پر چٹانوں سے ٹکرا کر گری۔ اس کے ٹکڑے اور ٹائر تو پتہ نہیں کہاں کہاں تک گئے۔ ہر طرف دھول اور دھواں چھا گیا، جس میں پتہ نہیں چلتا تھا کہ دوسری ہموی کہاں گئی۔ آخر جب دھواں چھٹا تو میں نے دیکھا کہ دوسری ہموی اڑی تو نہیں لیکن الٹ ضرور گئی ہے، اور اس میں سے تین امریکی نکل کر بھاگ رہے ہیں۔ ہمارے برمل والے ساتھیوں نے ان میں سے دو کو مار گرایا۔ لیکن اتنے میں خانہ خراب تین اپاچی ہیلی کاپٹر آ گئے، ان کے پیچھے پیچھے ایک درجن گن شپ بھی تھا۔ انھوں نے تمام وادی میں اندھا دھند اتنی گولیاں برسائیں جیسے آسمان سے اولے گرتے ہیں۔ بزدل امریکی سامنے آنے سے تو ڈرتا ہے لیکن اوپر ہیلی کاپٹر میں شیر ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی جھاڑی، کوئی درخت کوئی پتھر ایسا نہیں تھا جو چھان کی طرح چھلنی نہ ہوئی ہو۔ میں تو کانوں ہر ہاتھ رکھے چٹان کے نیچے لیٹا ہوا کلمہ پڑھتا رہا۔ آج تک سمجھ نہیں آئی کہ میں اولوں کی اس برسات سے کیسے بچ گیا، سوائے اس کے کہ خدا اپنی راہ میں مجھ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے۔'

'بے شک بے شک، اللہ کے کام اللہ ہی بہتر جانتا ہے،' خطیب صیب نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ 'مقرب خان، تم اس وقت کہاں تھے؟'

'ہم نے جب اپاچی آتا ہوا دیکھا تو میں اور دو دوسرا مجاہد نیچے درے میں چلے گئے تھے۔ اس لیے ہم بچ گئے لیکن ہمارے کل اٹھارہ مجاہد شہید ہو گئے، لیکن ہم خوش ہیں کیوں کہ اس

Scanned with CamScanner

حملے میں ہم نے چھ کافر کو جہنم بھیجا، اور کئی کو زخمی بھی کیا۔ اس حملے کے بعد انھوں نے وہاں سے اپنا چوکی ہی بند کر دی اور یہ سارا کارنامہ زرجانان خان کی وجہ سے ہوا۔ وہ اگر اتنا بہادری نہ دکھاتا تو آج بھی وہ امریکی چوکی ادھر ہی ہوتی۔'

'سچی بات تو یہ کہ میں نے اس جیسا جی دار مجاہد بہت کم دیکھا ہے۔ شیر کا بچہ تھا شیر کا،' سربلند نے کہا۔

فتح خان کے لیے اب آنسوؤں کو روکنا ممکن نہیں رہا تھا۔ آنسو اس کے رخساروں پر بھل بھل بہنے لگے اور اس کا گلہ نمکین ہو گیا۔ اسے خشک ندی میں اپنے باپ کا بے حس و حرکت جسم دکھائی دے رہا تھا جس کے اوپر آسمان میں ہیلی کاپٹر جھنجھنا رہے تھے۔ پھر اس کے سامنے اپنی ماں کا چہرہ آ گیا جو صحن میں زمین پر بال کھولے محلے کی عورتوں کے درمیان گھری چھاتی کوٹتی اور چہرہ پیٹ رہی تھی۔ وہ بین کرتے کرتے کہتی جاتی، 'میں نے کتنا سمجھایا کہ یہاں کام کم ہو گیا ہے، سڑک بند ہو گئی ہے تو کیا ہوا، پاکستان چلے جاؤ، وہاں محنت مزدوری کرو، میں فتح کے ساتھ روکھی سوکھی کھا کر گزارا کر لوں گی۔ لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔ کہتا تھا جیپ چلا کر دس ہزار روپے ملتے ہیں، مجاہد بن کر تیس ہزار ملیں گے۔'

محلے کی عورتیں بار بار اسے دلاسہ دیتیں۔ فہیم کی ماں کہتی، 'نہ نہ میری بچی، وہ شہید ہے، شہید کے لیے ماتم نہیں کرتے۔ بچے کی فکر نہ کرو، ہم اسے سنبھال لیں گے۔' گل مینہ اگر چارپائی کی پائنتی سے سر مارنے کی کوشش کرتی تو عورتیں اس کے ہاتھ پکڑ لیتیں۔ لیکن بچیاڑیں کھاتی گل مینہ کے بین رکتے نہیں تھے۔ وہ بار بار کہتی، 'اب بتاؤ کہاں ہیں تمھارے تیس ہزار؟ اب بتاؤ یہ پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزاروں گی میں، اس معصوم بچے کو لے کر کہاں جاؤں گی؟'

فتح چارپائی کے کونے کے ساتھ ٹک کر خشک آنکھیں لیے سر جھکائے کھڑا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا دوسرا دکھ تھا، اور اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس کا اظہار کیسے کرے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں پکڑ رکھا ہے اور اسے مسلسل بھینچ رہا ہے لیکن اس کی آنکھیں

بالکل خشک تھیں۔

فتح خان کی زندگی کا پہلا دکھ بہت سال پہلے آیا تھا جب وہ افغانستان میں رہتے تھے۔ کسی نے گل مینہ کو بتایا تھا کہ فتح خان کی زبان اٹکتی ہے، اسے طوطے کی چونچ توے پر تل کر کھلاؤ تو پٹر پٹر بولنا شروع کر دے گا۔ زرجانان نے اس وقت تو ٹال دیا لیکن پھر ایک دن کچھ سوچ کر اسے ایک طوطا لا دیا۔ آنکھوں میں چبھتے ہوئے سبز رنگ، سرخ نوک دار چونچ، اور سیاہ جھریوں والے پنجوں پر بے ڈھنگے انداز میں چلنے والے طوطے کے پنجرے کو فتح خان سے جدا کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ باہر کھیلنے بھی جاتا تو اس کا پنجرہ ساتھ لے کر جاتا، رات کو سوتے وقت گل مینہ اس کی چارپائی کے قریب ستون پر لٹکا دیتی تھی تاکہ وہ اس کے سر کے بالکل اوپر رہے۔ ایک دن فتح خان دوستوں کے ساتھ دریا کی طرف گیا تو پنجرہ ساتھ لے کر نہیں گیا۔ واپس آیا تو پنجرے میں انگور کے کچے پتوں جیسے تین چار سبز پر پڑے تھے۔ ماں نے بتایا کہ وہ پنجرہ گھر میں چھوڑ کچھ دیر کے لیے باہر گئی تھی، نہ معلوم کیسے بلی نے دروازہ کھول کر طوطے کو باہر نکال لیا۔ اس وقت بھی فتح خون آلود پر ہاتھ میں لیے ایک طرف سر جھکائے کھڑا رہا تھا اور اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں لیکن ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اس کے دل کو مٹھی میں پکڑ زور سے بھینچے چلا جا رہا ہے۔ صرف ایک احساس تھا کہ اب وہ طوطا کبھی پلتا پھرتا، ٹیں ٹیں کرتا، اس کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا کھاتا ہوا نظر نہیں آئے گا۔

فتح کو احساس ہوا کہ خطیب صیب اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اس نے آستین سے پونچھ کر ناک صاف کی۔ خطیب صیب بولے: 'فتح خان میں تمھارا دکھ اور تمھارے آنسو اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ اس لیے میں تمھیں آنسو بہانے سے نہیں روکوں گا، لیکن میرے نزدیک تم جس شیر نر کے بچے ہو، اس کا تقاضا یہی ہے کہ آنسو بہانے کی بجائے تم اپنے باپ کے لیے کچھ کرو۔ کچھ ایسا کرو جس کے بعد جب تمھاری اس سے جنت میں ملاقات ہو تو وہ تم پر فخر محسوس کرے کہ شیر نے واقعی شیر کے بچے کو جنم دیا تھا۔'

Scanned with CamScanner

فتح گھر سے کیسے نکلا، کیوں نکلا، یہ لمبی کہانی ہے، لیکن تم نے کہا ہے تو میں اللہ کو حاظر ناظر جان کر تمھیں سب کچھ صاف صاف بتائے دیتی ہوں۔

فتح خان بارہ سال کا تھا جب میرا پہلا خاوند زرجانان امریکہ کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوا۔ اس کے بعد میرے لیے دنیا یوں اندھیر ہوگئی جیسے اس میں سورج کبھی دوبارہ طلوع نہیں ہوگا۔ سب کہتے ہیں کہ شہید مرتے ہی دودھ کی نہروں اور زمرد کے محلوں والی جنت میں اپنی ستر بہتر حوروں کے پاس چلا جاتا ہے۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس کے چلے جانے کے بعد اس کی بے یارومددگار بیوہ اور بچے اس سے بھی پہلے جیتے جی جہنم میں پہنچ جاتے ہیں۔ دو تین ہفتے تک تو مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے۔ میرا دماغ ہی چل گیا تھا۔ رات کو اٹھ کر اس کے لیے کھانا اور چائے بنانا شروع کر دیتی تھی۔ شام کو دروازے پر جا کر کھڑی ہو جاتی تھی کہ ابھی واپس آجائے گا۔ اس دوران گاؤں والوں نے بڑی مدد کی۔ مجاہدین نے اس کی شہادت پر مجھے بہت سے روپے دیے۔ پھر ہر مہینے باقاعدگی سے تنخواہ کی طرح پیسے دیتے رہے۔ پھر ایک دن انھوں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔

زرجانان کی قبر کہیں نہیں تھی۔ مجھے اس کے ساتھیوں نے بتایا تھا کہ وہ دشمن کے علاقے میں لڑتے ہوئے شہید ہوا تھا اور اس کی لاش اٹھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگر کہیں اس کی قبر ہوتی تو میں وہاں جاتی، پھول رکھتی، چراغ جلاتی، اگربتیاں سلگاتی، اس کے لیے دعا کرتی۔ لیکن اس کی قبر کہیں نہیں تھی۔ اس کے ساتھی کہتے تھے کہ اسے ٹینک کا گولہ لگا تھا، جسم بکھر گیا تھا۔ امریکیوں نے کہیں گڑھا کھود کر دبا دیا ہوگا، نہیں تو ویسے ہی ویرانے میں چھوڑ دیا ہوگا، گدھ، گیدڑ کھا گئے ہوں گے۔ جب اس کی قبر کہیں نہ بنی تو میں نے دل میں اس کی قبر بنالی تھی۔ اسی قبر پر پھول رکھتی،

چراغ جلاتی، اگربتیاں سلگاتی رہتی تھی۔

اس نہ ختم ہونے والی جنگ میں اصل میں دو فوجیں دو الگ الگ محاذوں پر لڑ رہی ہیں، ایک فوج میں زرجانان جیسے مجاہد ہیں، جو دشمن کے ٹینکوں اور آگ برسانے والے جہازوں سے جا بھڑتے ہیں اور آناً فاناً شہید ہو کر اوپر چلے جاتے ہیں۔ ایک اور فوج بیواؤں کی ہے۔ فوج اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں اکیلی مجاہد کی بیوہ نہیں تھی، اس پورے علاقے میں کوئی گلی، کوئی محلہ ایسا نہیں تھا جس میں میری طرح ایک دو بیوائیں نہ ہوں۔ ان بیواؤں کی فوج پہلی جنگ سے ہزار گنا زیادہ مشکل، زیادہ صبر آزما جنگ لڑ رہی ہے۔ مجاہد کو تو ایک گولہ لگتا ہے اور وہ ایک سیکنڈ کے اندر اندر اپنی بہتر حوروں کے مہکتے ہوئے پہلو میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ چار دیواری میں قید فوج تو ہر سیکنڈ میں ایک بار جیتی اور ایک بار مرتی ہے۔ آؤ زرجانان، میرے سامنے تو آؤ ذرا، دیکھیں کون زیادہ جانباز ہے، کس نے زیادہ بہادری دکھائی ہے۔

خیر، میں کہہ رہی تھی کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ گھر کی سب بکنے والی چیزیں بک گئیں اور فاقوں کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ فتح خان نے کئی بار کہا کہ وہ کوئی کام دام شروع کر دے اور کچھ نہیں تو اڈے کے ہوٹل پر لگ جائے لیکن میں نے ہر بار اسے منع کر دیا۔ میں چاہتی تھی کہ ہر حالت میں اپنی تعلیم مکمل کرے۔

پھر طالبان میرے لیے رشتہ لے کر آ گئے۔ مجبوری تھی، سوچتے سوچتے دماغ پک گیا لیکن کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اس لیے منظور کرتے ہی بنی۔ سعد اللہ محسود چھ ماہ زندہ رہا اور ایک دن بدن پر بارود باندھ کر فوجیوں کے قافلے سے جا ٹکرایا۔ کہتے ہیں وہ شہید ہوا ہے اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتی، ورنہ وہ ظالم ساری رات میرے میری ہڈیاں چچوڑتا رہا، لیکن اس نے صبح اٹھ کر جاتے ہوئے خدا حافظ کہنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔

اس کے بعد عین وہی کہانی دہرائی گئی جو زرجانان کے شہید ہونے پر گزری تھی۔ راج ولی بھی کہیں مارا گیا تھا اس لیے اب کے علی داد ماہ بماہ رقم گھر پہنچاتا رہا اور پھر وہ سلسلہ بھی ٹھپ۔

Scanned with CamScanner

بات بے شرمی کی ہے، لیکن منہ پر آ گئی ہے تو بتا دیتی ہوں۔ گاؤں کی ایک لڑکی کا خاوند اسی طرح لڑتے ہوئے مارا گیا۔ شادی کے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ بے چاری کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ عورتیں کہتی ہیں کہ پہلے تو اس کا دیور اسے استعمال کرتا رہا، پھر سسر۔ آخر وہ تنگ آ گئی اور گھر سے بھاگ کر کسی طرح لاہور پہنچ گئی۔ اب سنا ہے کہ وہ سرخی پوڈر لگا کر شام کو باغوں میں گھومتی ہے۔ اس طرح کی اور کتنی کہانیاں ادھر ادھر منڈلاتی ہوئی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

مجھے اس بات کی فکر تھی کہ فتح ابھی ساتویں میں پڑھتا ہے۔ اسے کم از کم بارہ جماعتوں تک تو پڑھنا چاہیے۔ اس کے لیے پانچ سال اور چاہییں۔ کیسے کٹیں گے یہ پانچ سال؟ اس کی تعلیم کا خرچ کہاں سے پورا ہو گا؟ یہاں کا سکول صرف آٹھویں تک ہے، نویں جماعت کے لیے اسے وانہ کے ہائی سکول میں داخلہ لینا پڑے گا۔ کسی سے مدد مانگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لوگ اتنے غریب ہیں کہ انھیں خود دو وقت کی روٹی پوری کرنی مشکل پڑ جاتی ہے۔ وہ تو ترس کھا کر مجھے بچا کھچا دے دیتے ہیں، کل کو حالات اور بگڑ گئے تو فاقوں تک نوبت پہنچ جائے گی۔ تو ایسے حالات میں فتح کے مستقبل کا کیا بنے گا؟ میں اسے پڑھانا لکھانا چاہتی ہوں، لیکن اگر وہ بھی ان مجاہدوں کے ہتھے چڑھ گیا تو کیا ہو گا؟

اب زندگی پھر جہنم بن کر میرے سامنے آ گئی جس سے نکلنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اسی دوران علی داد پھر آ گیا، اب کی بار وہ ایک ازبک کا رشتہ لے کر آیا تھا۔

میں نے اگلے دن اپنی پڑوسن نہیم کی ماں سے مشورہ کیا تو اس نے کچھ اور ہی کھاتہ کھول دیا۔ 'نہ نہ بہن، یہ غلطی بھول کر نہ کرنا۔ ازبک؟ تھو تھو۔ تمھیں پتہ ہے کہ ازبک اپنی بیویوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں؟'

'کیا کرتے ہیں؟'

'توبہ توبہ، کیا بتاؤں گل مینہ بہن۔ نہیم کے ابا کہتے ہیں کہ کلوشہ کے علاقے میں اسی

طرح ایک لڑکی کی شادی کسی ازبک سے کرا دی گئی۔ دو تین مہینے بعد جب وہ اپنے میکے گئی تو اس کے باپ نے لڑکی سے خاوند کا حال پوچھا۔ تو اس نے کہا کہ حال تو تب بتاؤں جب مجھے پتہ ہو کہ خاوند ہے کون۔ میرے پاس تو ہر رات ایک نیا بھائی آتا ہے۔'

یہ سن کر میں اپنے بوجھل دل کے باوجود ہنس پڑی۔ 'نہیں آپا، ایسی بات نہیں ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔'

'کوئی پتہ نہیں کب کہاں سے اس کے بھائی برآمد ہو جائیں۔ میری مانو تو زیارت کے قریب بہت اچھا بندہ رہتا ہے، اس سے بات چلائی جائے۔ بیچارے کو بیٹے کا شوق ہے، پہلی بیوی اوپر تلے چار بیٹیاں جن چکی ہے۔ کھاتا پیتا ہے، اپنا چلتا ہوا سمگلنگ کا کاروبار ہے۔ تمھیں سکھی رکھے گا۔'

'نا بہن، سوتن بن کر جانے اور وہ بھی چار بچیوں کی ماں پر سوتن بن کر جانے سے تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ اور پھر وہاں میرے فتح کا کیا ہو گا؟'

علی شیر عثمانوف کی شکل میں نے شادی کے کئی دن بعد دیکھی۔ میرا دوسرا خاوند سعد اللہ محسود مجھ سے سات آٹھ سال چھوٹا تھا جب کہ یہ کم از کم پندرہ سال بڑا تھا۔ اس کی داڑھی کے بال صرف ٹھوڑی پر تھے، آنکھیں ایسی جیسے سلائی پھیر دی گئی ہو۔ ماتھے پر گہری جھریاں جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی تھیں۔ اس کے سر پر ہر وقت نیلی دھاریوں والی پگڑی ہوا کرتی تھی۔ وہ بائیں ٹانگ پر زور ڈال کر چلتا تھا اور چڑھائی چڑھتے یا اترتے وقت اسے لاٹھی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

عثمانوف کی پشتو ٹوٹی پھوٹی تھی اور وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتا تھا۔ اس کا لہجہ بھی بہت مختلف تھا، مجھے وہ گل مینہ نہیں بلکہ گل مینے کہتا تھا۔ بعض اوقات کسی لفظ پر اٹک جاتا تھا تو کئی لمحوں کے لیے خاموش ہو جاتا تھا۔ پھر جب اسے مطلوبہ لفظ مل جاتا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں اور وہ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتا۔ سعد اللہ جتنا چپ چاپ تھا، یہ اتنا ہی باتونی۔ شادی کے بعد کئی دن تک صرف

Scanned with CamScanner

وہی بولتا رہا جس کے دوران اس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس دوران میں کبھی کبھی ہاں ہوں کر لیتی تھی یا سر ہلا دیتی تھی۔

عثمانوف ازبکستان کے شہر بخارا کے قریب پیدا ہوا تھا۔ اس کی زبان سے بخارا کا نام سن کر مجھے خرقہ شریف سے مس ہونے والی پگڑی کا ٹکڑا یاد آ گیا، جو اب بھی میرے بکسے کی جیب میں پڑا ہوا تھا، لیکن میں نے عثمانوف سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ 'جانتی ہو گل مینے، ازبکستان نے کیسے کیسے شیر پیدا کیے ہیں؟' اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ 'ظہیر الدین بابر کا نام سنا ہے؟ ارے بھئی وہی بابر، جس نے ہندوستان فتح کیا تھا۔

'وہ جری شیر تھا بابر جس نے بارہ ہزار فوج کے ساتھ کروڑوں کی آبادی کا ہندوستان فتح کیا تھا۔ اسی کی اولاد ڈھائی سو سال تک ہندوستان پر شان سے حکومت کرتی رہی۔ لیکن مکار اور عیار انگریز نے لومڑی کی چالیں چلتے ہوئے مغلوں کی حکومت پر بزدلانہ ڈاکہ ڈال کر قبضہ کر لیا۔ آج وہی انگریز امریکہ کی شکل میں افغانستان میں گھس آیا ہے، لیکن ہم فرغانہ کے باسی اس سے نہ صرف افغانستان بلکہ ڈیڑھ سو سال پہلے کے ہندوستان کا بدلہ بھی لے کر رہیں گے۔'

عثمانوف نے مجھے اپنی زندگی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ روس کے زمانے میں جوتے بنانے والے کارخانے میں کام کرتا تھا لیکن ازبکستان کی آزادی کے بعد جب صدر اسلام کریموف نے اپنے نام کی لاج نہ رکھتے ہوئے روسی دور کی اسلام دشمن حرکتیں جاری رکھیں تو عثمانوف تحریک حرکتِ اسلامی ازبکستان میں شامل ہو گیا اور حکومت کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ جب حرکتِ اسلامی پر ازبکستان کی زمین تنگ ہو گئی تو اس نے بھی ہزاروں دوسرے مجاہدوں کی طرح افغانستان کو گھر بنا لیا۔ لیکن امریکہ کے حملے کے بعد افغانستان میں بھی ان کے لیے جگہ نہ رہی۔ علی شیر ازبک جنگجوؤں کے قائد طاہر یولداشیف کے ہمراہ جنوبی وزیرستان کے قصبے کلوشہ میں آ کر بس گیا۔ لیکن پاکستانی فوج کے خلاف ایک جھڑپ میں وہ حملے کی زد میں آ گیا تھا۔ راکٹ کا ایک ٹکڑا اس کی ٹانگ پر آ لگا اور وہ کئی مہینوں ایک ملک کے گھر میں بستر پر پڑا رہا۔

ٹانگ بڑی مشکل سے ضائع ہوتے ہوتے بچی۔

'کبھی میرا بھی گھر بار ہوا کرتا تھا، بیوی تھی دو پیارے پیارے لڑکے تھے۔ بیوی نے تو خیر سنا ہے میرے ازبکستان سے نکلنے کے پانچ سال کے بعد دوسری شادی کر لی۔ بچے بھی بڑے ہو گئے ہیں۔ مجھے وہاں میری غیر موجودگی میں موت کی سزا ہو چکی ہے، میں وہاں واپس جاؤں گا تو پھانسی پر لٹکا دیا جاؤں گا۔ اب میں تھک گیا ہوں گل مینے۔ بھاگتے، دوڑتے، چھپتے چھپاتے تنگ آ گیا ہوں۔ نہ ہی میری عمر اب دوڑنے کودنے کی رہی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ امن و سکون سے رہوں، نہ کسی کو چھیڑوں، نہ کوئی مجھے چھیڑے۔ میرے پاس تھوڑا سا پیسہ ہے، سوچتا ہوں کہ یہیں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دوں اور جو بھی زندگی بچ گئی ہے وہ چین آرام سے گزاروں۔'

بازار میں تو کوئی مناسب دکان نہیں ملی، عثمانوف نے گھر ہی کے ایک کمرے میں باہر کی طرف دروازہ نکال کر کریانے کی دکان کھول لی جس کے لیے وہ ہر تیسرے چوتھے دن وانہ کے بازار سے جا کر آٹا، گھی، چینی، چاول، دالیں، سوجی، مرچ، مسالے، نسوار، بسکٹ، ٹافیاں، غبارے، اور اس قسم کی چیزیں لے کر آتا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ نسوار بنانے کا سامان لے آیا، تمباکو، چونا، انجیر کے تنے کی راکھ، اور دکان کے کچے فرش میں پتھر کی اوکھلی دبا کر اور چھت سے تانت کی مدد سے بھاری موسل لٹکا کر دھما دھم تمباکو نسوار کوٹنے لگا۔

یہ گفتگو ایک تفتیشی کمرے میں ہو رہی تھی۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ گیس والا ہیٹر لگا ہوا تھا جس سے خوشگوار حرارت کی لہریں نکل کر کمرے کو گرما رہی تھیں۔ ورنہ گل مینہ کو جس کمرے میں رکھا گیا تھا وہاں اتنی ٹھنڈ تھی کہ رات کو کئی بار اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ رخسانہ میز کے دوسرے کونے میں بیٹھی گل مینہ کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ کبھی کبھی بیچ میں کوئی سوال کر دیتی تھی، لیکن بیشتر اوقات اس نے گل مینہ ہی کو بولنے دیا۔

'مہینہ دو کے اندر اندر اس کی نسوار اس قدر مشہور ہو گئی کہ بعض اوقات انگور اڈا بازار

سے بھی گاہک اس سے نسوار کی پڑیا لینے آجاتے تھے۔

شروع شروع میں مجھے عثمانوف سے بہت کراہت محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب بھی میرے قریب آتا، میں آنکھیں سختی سے میچ لیتی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ باقی حواس کو بھی تالہ لگا کر سختی سے بند کردوں تاکہ مجھے کسی طرح سے بھی زرجانان کی یاد نہ آئے۔ لیکن چڑھتی ندی پر کاغذ سے کس نے بند باندھا ہے۔ ایک دن رات کو عثمانوف اچانک مجھ سے یوں الگ ہوگیا جیسے اسے بھڑنے ڈنک مار دیا ہو۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلا تھا اور میرے گال آنسوؤں سے تر ہو گئے تھے۔

اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اٹھ کر اپنی چارپائی پر چلا گیا، لیکن اس کے بعد سے اس کے رویے میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ ایک تو اس نے میرے پاس آنا بہت کم کر دیا اور دوسرے اٹھتے بیٹھتے نہ صرف مجھ پر بلکہ فتح پر بھی ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ فتح بھی تول کا پورا تھا۔ میرے ہزار بار سمجھانے بلکہ کوسنے دینے پر بھی اس نے کبھی عثمانوف کو باپ نہیں کہہ کر دیا۔ محلے کے لڑکوں کی طرح وہ بھی اسے ازبک چاچا پکارتا تھا۔ وہ ہر بار یہی کہتا تھا کہ میرا ابا مر چکا ہے، کوئی اور اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔

سعد اللہ نے صرف ایک بار فتح کو نماز نہ پڑھنے پر ٹوکا تھا، عثمانوف بات بے بات اس میں کیڑے نکالتا رہتا تھا۔ 'بال اتنے لمبے نہ رکھو، دوستوں کے ساتھ گلی میں فٹبال نہ کھیلا کرو، مجھ سے پوچھے بغیر گھر سے باہر کیوں گئے تھے' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جلد ہی بات ڈانٹ ڈپٹ سے آگے نکل گئی۔ ایک دن جب اس نے جب فتح کو ایسا تھپڑ مارا کہ اس کے ہونٹ کے کونے سے خون بہنے لگا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا کہ باقی ہر چیز قبول، فتح خان پر اس کا ہاتھ اٹھانا کسی صورت گوارا نہیں ہے۔ اس پر وہ مجھ سے بھی بگڑ بیٹھا اور ہمارے درمیان پورا ایک ہفتہ بول چال بند رہی۔ وہ یہی کہتا تھا کہ اگر یہ میری کمائی کھاتا ہے تو اسے میری بات بھی ماننا پڑے گی، 'اگر اسے یہ منظور نہیں ہے تو جہاں مرضی ہے چلا جائے۔ اب یہ بچہ نہیں رہا، اس عمر کے لڑکے پورا گھر چلاتے ہیں۔'

اس پر طرہ یہ کہ عثمانوف کنجوس تھا۔ مریضانہ حد تک کنجوس۔ سالن میں ایک چمچ گھی زیادہ پڑ جاتا یا آدھی روٹی بچ جاتی تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا۔ 'یہ فالتو گھی نہیں ہے، میرا خون ہے جو تم ماں بیٹا چوس رہے ہو۔'

مجھے ایک دوسرے گاؤں کی عورت نے بتایا کہ وہ دراصل پیسے بچا رہا تھا تاکہ واپس ازبکستان چلا جائے اور وہاں حکام کو رشوت دے کر اپنا نام صاف کروالے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس بات میں کتنی سچائی تھی لیکن میرا دل اور کھٹا ہوگیا۔

رخسانہ اس دوران اپنی عادت کے مطابق سگریٹ پر سگریٹ پھونکے چلی جا رہی تھی۔ اس نے ایک نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا: 'کیا عثمانوف اب بھی طالبان یا دوسرے ازبک جنگجوؤں سے رابطے میں تھا؟'

اس سے ملنے کے لیے کبھی کبھار دو ازبک آتے رہتے تھے اور اس کے ساتھ ازبکی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ ایک بار تو وہ کئی دن ہمارے گھر ٹھہرے رہے۔ اس کے علاوہ جہاں تک مجھے علم ہے، اس کا کسی اور سے رابطہ نہیں تھا۔

جب عثمانوف نے فتح پر سختی شروع کر دی تو ایسے موقعوں پر زرجانان کی یاد اور شدت سے آیا کرتی تھی۔ اس نے کبھی فتح کو پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا۔ مجاہد بننے کے بعد وہ پتہ نہیں کن کن حالات میں وقت گزار کر آتا تھا۔ کئی کئی دن سے بھوکا، پیاسا، دو دو تین تین راتوں کا جاگا ہوا۔ پہاڑوں، ویرانوں، جنگلوں میں نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا ہوا، موت کے منہ میں سے نکل کر جب وہ گھر میں داخل ہوتا تھا تو فتح کو دیکھ کر اس کی آنکھیں یوں چمک اٹھتی تھیں جیسے بٹن دبانے سے بجلی کا بلب روشن ہو جاتا ہے۔ وہ چٹاخ پٹاخ چومکر فتح کے گال لال کر دیتا تھا۔ فتح مصنوعی غصے میں تلملا کر ہتھیلیوں کی پشت سے گال پونچھتا ہوا باپ کی گود سے اتر جاتا لیکن تھوڑی دیر بعد سب کچھ بھلا کر دوبارہ وہیں جا گھستا تھا اور ہم دونوں ہنستے ہنستے دہرے ہو جاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ فتح کو بھی یہ باتیں یاد آتی ہوں گی، اسی لیے اس کے لیے کسی اور کو اپنے

Scanned with CamScanner

باپ کی جگہ دینا ناممکن تھا۔ دوسری طرف عثمانوف کے اپنے دو بیٹے تھے، وہ فتح کو کسی اور مرد کی اولاد سمجھتے ہوئے اس سے خار کھاتا تھا۔ اگر میں اس کی حمایت کرتی تو وہ میرے ساتھ مزید سختی شروع کر دیتا۔

اور پھر وہ دن آ گیا جب سب کچھ الٹ پلٹ گیا۔ میں ہمسائے کے گھر تنور پر روٹیاں لگانے گئی تھی کہ ہمارے گھر سے شور اٹھا۔ میں بھاگی بھاگی آئی تو دیکھا کہ عثمانوف فتح کو لاٹھی سے پیٹ رہا ہے اور ساتھ ساتھ دانت پیس پیس کر ازبکی زبان میں کچھ کہے جا رہا ہے۔ میں ان دونوں کے بیچ میں آ گئی۔ 'کیا بات ہے، کیوں مار رہے ہو اسے؟' میں نے پوچھا۔

عثمانوف کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا اور آنکھیں جیسے ابل کر باہر آ جائیں گی۔ 'ہٹ جاؤ میرے آگے سے، میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ میرے پیسے چرائے ہیں اس نے۔'

اس کی اس بات سے میں بھی بھنا گئی۔ 'دیکھو عثمانوف، تم میرے ساتھ جو سلوک بھی کرتے ہو، وہ اپنی جگہ لیکن میرا بیٹا چاہے ہو کچھ بھی ہو، چور نہیں ہو سکتا۔'

'نہیں نہیں، یہ کیسے چور ہو سکتا ہے بھلا،' عثمانوف کے نتھنے غصے سے تھرتھرا رہے تھے۔ 'میں تو کہتا ہوں آسمان سے فرشتے اتر کر میری واسکٹ سے پانچ سو کا نوٹ لے اڑے ہیں۔ یا کوئی جن بھوت میرے ساتھ دشمنی نکال رہا ہے۔ نمک حرام، چور کی اولاد۔' یہ کہہ کر اس نے فتح کو ایک اور لاٹھی جڑ دی۔

میں نے فتح کو پکڑ کر ایک طرف کیا اور عثمانوف کا ہاتھ پکڑ لیا۔ 'نہیں، اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے تم۔ اس کا پارہ اور چڑھ گیا۔ 'اچھا فاحشہ، حرافہ، تو بھی اسی کی طرفداری کر رہی ہے۔' اس کے منہ سے کف نکلنے لگا۔ 'اس کا مطلب ہے تم دونوں نے مل کر واردات کی ہے۔ ٹھیر میں تمھیں بھی مزا چکھاتا ہوں۔' یہ کہہ کر اس نے میرے سر پر لاٹھی اتنے زور سے ماری کہ میں نیچے گر گئی۔ اس نے لاٹھی ایک طرف پھینک دی اور میرے اوپر چڑھ کر میرا گلہ دبانے لگا۔

میں نے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی لیکن اس کے بھاری بدن نے مجھے پوری طرح

سے دبا لیا تھا۔ اس کی انگلیوں نے میرے گلے کو لوہے کے کڑے کی طرح جکڑ رکھا تھا اور منہ سے سانپ کی پھنکاروں جیسی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ اتنے میں ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ عثمانوف کا بدن یوں ہلا جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ دیا ہو۔ میری گردن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

میں عثمانوف کے بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ کسی نے مجھے کھینچ کر نیچے سے نکالا۔ میں خون سے لت پت تھی اور سانس لیتے وقت میرے نرخرے سے دمے کے مریض کی طرح خرخر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

'فتح، فتح!' میں نے صحن میں جمع ہو جانے والے ہجوم میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ میری تھری ناٹ تھری بندوق ایک طرف پڑی ہوئی تھی اور فتح کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

گل مینہ عمارت سے باہر نکلی تو سپاہی نے گیٹ بند کر دیا۔ باہر سڑک پر گاڑیوں کا ہجوم تھا۔ گل مینہ نے قندہار میں گاڑیوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھی تھی لیکن وہ سب گندی مندی اور پرانی ہوا کرتی تھیں، جب کہ یہاں درختوں سے ڈھکی ہوئی دورویہ شاہراہ پر چمچماتی گاڑیوں کا سیلاب بہا چلا جارہا تھا۔

اس کا برقع لوٹا دیا گیا تھا، اور اس کا چاک بھی سی دیا گیا تھا۔ گل مینہ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ اس میں نہ صرف اس کے پیسے موجود تھے بلکہ پگڑی کا ٹکڑا بھی پڑا ہوا تھا۔ اس نے ٹکڑا نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور سڑک پار کرنے کے لیے گاڑیوں کی قطار میں کسی وقفے کا انتظار کرنے لگی۔

'بہن جی، آپ کہاں جائیں گی؟ آپ کو راستوں کا پتہ نہیں تو میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔' گل مینہ نے مڑ کر دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے فتح خان کی تصویر بنائی تھی۔ گل مینہ کو یاد آیا کہ اس کا نام شفیق تھا۔

'تم بھی اس کی موت کے ذمہ دار ہو،' گل مینہ نے کہا اور سڑک پر قدم رکھ دیا، لیکن سیاہ رنگ کی ایک لمبی چوڑی کار نے کرخت ہارن بجا کر اسے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

'آپ غلط سمجھ رہی ہیں،' شفیق اس کے قریب آ گیا۔ 'میں ان کا ساتھی نہیں ہوں۔ میں تو خود دو بار اغوا ہو چکا ہوں۔ پہلے مجھے مدرسے والوں نے اغوا کیا، پورا ایک مہینہ قید میں رکھا، بیوی بچوں سے موبائل پر بات بھی نہیں کرنے دی۔ اس کے بعد یہ لوگ مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے۔ اب میں ہر روز صبح یہاں آتا ہوں اور ان کے لیے تصویریں بناتا ہوں۔ اب کم از کم اتنا ہے کہ انھوں نے مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی ہے۔ یقین جانیں مجھے خود فتح کا بہت افسوس ہے۔

بہت نیک بچہ تھا۔'

گل مینہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے مڑ کر شفیق کی طرف دیکھا۔ 'کیسا تھا وہ؟ کبھی اپنی ماں کو یاد کرتا تھا؟'

'وہ بہت خاموش طبیعت کا مالک تھا۔ جب کوئی بہت ضروری بات کہنی ہو تب بولتا تھا،' شفیق نے کہا۔

'وہ ٹھیک تو تھا ان دنوں میں؟ ان لوگوں نے کوئی ظلم زیادتی تو نہیں کی اس پر؟'

'نہیں جی، وہ میرے ساتھ کام کرتا تھا۔ میں نے ہی اسے برش پکڑنا اور رنگ کرنا سکھایا تھا۔ وہ سارا دن میرے ساتھ رہتا تھا۔'

گل مینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر نیچے گرنے لگے۔

'اب آپ کہاں جائیں گی؟' شفیق نے پوچھا۔ 'آپ تو وزیرستان سے آئی ہیں نا؟'

'ہاں، وہیں سے آئی ہوں۔'

'تو اب وہاں واپس جائیں گی یا یہاں پہ کوئی ہے جس کے پاس جانا ہے؟'

'واپس جانا ہے، لیکن خالی ہاتھ واپس نہیں جا سکتی میں۔ میں فتح خان کے لیے آئی تھی۔ اب یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس کے جسم کا پتہ نہیں ہے۔ اب میڈم نے وعدہ تو کیا ہے لیکن دیکھو ان کے وعدوں کا کیا بنتا ہے۔ ویسے اگر تمھیں کچھ پتہ ہے تو تمھیں اللہ رسول کا واسطہ، تم مجھے بتا دو، میں زندگی بھر تمھیں دعائیں دیتی رہوں گی۔ تمھیں کچھ پتہ ہے؟'

شفیق نے نظریں جھکا لیں۔

'بولو، جواب دو، تم فتح کے ساتھ رہے ہو، تمھیں اس کی جواں مرگ کا واسطہ، خدا کا واسطہ، بتا دو تاکہ میرے دل کو قرار آ جائے۔'

شفیق نے ادھر ادھر دیکھا۔ 'میرا اندازہ ہے کہ فتح خان کا جسم اسی عمارت میں ہے۔ لیکن یہاں بات کرنا مناسب نہیں ہے، چلو میں آپ کو اپنے گھر لے چلتا ہوں۔'

Scanned with CamScanner

فتح خان نے 'ہوٹل تاج محل' کی چوتھی منزل کے کمرے کی کھڑکی کے پٹ کھولے تو تین چیزوں نے اس کے حواس پر ہلہ بول دیا۔ ایک تو سرد ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے یوں ٹکرایا کہ اسے جھرجھری آ گئی۔ دوسری چیز تھی شور۔ کمرے کے اندر سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا لیکن باہر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ دو منزلیں نیچے سڑک پر موٹر سائیکلیں، کاریاں، ٹیکسیاں، پک اپ گاڑیاں، ٹرک اور ریڑھے رواں دواں تھے۔ سب سے بڑھ کر ٹرٹراتے رکشے ٹریفک کے دوران عقل کو چکرا دینے والی تیزی سے آتے تھے اور دوسری گاڑیوں کے بیچ میں گھس جاتے تھے اور پھر دائیں بائیں گھوم کر ادھر ادھر نکل جاتے تھے۔ لیکن یہ شور صرف سڑک کی جانب سے نہیں آ رہا تھا بلکہ گھر گھر کی آوازیں چاروں طرف سے آ رہی تھیں۔ فتح خان کو ایسا محسوس ہوا جیسے پورے شہر میں چھوٹی چھوٹی لاتعداد گراریاں چل رہی ہیں۔ یا پھر جیسے یہ شہر ایک بہت بڑا عظیم الجثہ جانور ہے جو اپنے پہلو پہ لیٹا دھیرے دھیرے غرا رہا ہے۔

تیسری چیز جس نے فتح خان کی توجہ مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ لی وہ تھی شہر کی چکاچوند۔ فتح خان نے اس سے پہلے اتنی زیادہ بتیاں جلتی ہوئی نہیں دیکھی تھی۔ ارغنداب یا انگوراڈا میں تو اول تو بجلی ہوتی ہی نہیں تھی، اور اگر ہوتی بھی تو بلبوں کی بیمار روشنی تاریکی کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے سے عاری رہتی تھی۔ لیکن یہاں جس طرف نظر دوڑاؤ، طرح طرح کی روشنیاں چمچما رہی تھیں، اور جگہ جگہ رنگ برنگے اشتہاری بورڈ جل بجھ رہے تھے۔ اس کی نظریں خاص طور پر مشرق کی جانب ایک اونچی بلڈنگ پر لگے ایک بڑے اشتہاری نشان پر ٹک گئیں جس پر اردو میں 'جامِ شیریں' کے لہو رنگ حروف جگمگاتے تھے، اور پل بھر میں جھلک دکھلا کر غائب ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد اسی جگہ ایک بوتل ابھر آتی تھی، جس میں نیچے سے اوپر تک سرخ رنگ کی شربت بھرتی

جاتی اور نیچے انگریزی میں سبز رنگ میں حرف بہ حرف FRESHNESS, LIFE لکھا جاتا جو اگلے ہی لمحے مٹ جاتا اور سرخ جامِ شیریں دوبارہ نمودار ہو جاتا۔ جیسے کوئی دیو نادیدہ ہاتھوں سے رات کے تختہ سیاہ پر رنگ برنگی چاکوں سے پھرتی سے لکھتا اور مٹاتا جا رہا ہے۔

فتح نہ جانے کتنی دیر مبہوت کھڑکی کی ٹھنڈی سل پر بازو ٹکائے یہ منظر دیکھتا رہا کہ اسے اپنے کندھے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا۔ یہ نصیب گل تھا۔ 'چلو فتح، چائے تیار ہے۔ زیادہ دیر یہاں کھڑے رہے تو ٹھنڈ لگ جائے گی، ہوا میں بڑی کاٹ ہے،' اس نے کہا۔

کمرے میں نصیب گل کے علاوہ ایک اور شخص بھی تھا، جس کا نام فتح خان کو معلوم نہیں ہو سکا کیوں کہ نصیب گل اسے 'کمانڈر' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ کمانڈر لمبا تڑنگا اور دبلا تھا۔ اس کے چہرے پر مختصر سی کھچڑی داڑھی تھی جو اس کے گالوں اور ٹھوڑی کو پوری طرح ڈھکنے میں ناکام رہی تھی اور کہیں کہیں اس کی گہری گندمی جلد نظر آ رہی تھی۔

فتح خان کو نصیب گل مدرسے سے ساتھ لے کر بنوں آیا تھا جہاں سے وہ ایک کھڑکھڑاتی ہوئی بس میں بیٹھ کر پشاور آئے۔ بس کی حالت اس قدر خستہ تھی کہ راستے میں اس کا ٹائر بار بار پنکچر ہو جاتا تھا۔ ہر پنکچر پر گاڑی دو بار رکتی، ایک تو ٹائر بدل کر فالتو ٹائر لگانے پر اور پھر آگے کسی پنکچر والے کی دکان پر ٹائر کی مرمت پر۔ اس طرح چھ گھنٹوں کا سفر نو گھنٹے میں طے ہوا۔ پشاور پہنچ کر دونوں اڈے کے قریب ہی ایک رات ہوٹل میں ٹھہرے، جہاں صبح صبح ہی کمانڈر پہنچ گیا اور اس نے آتے ہی فتح خان کو یوں اپنے ساتھ لپٹا لیا جیسے وہ برسوں سے بچھڑا ہوا رشتے دار ہو۔ وہ بار بار فتح خان کے ہاتھ چومتا اور انھیں ماتھے سے لگاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود فتح خود کو کمانڈر کی جانب زیادہ مائل نہیں کر سکا۔ اسے کمانڈر کے لمبوترے چہرے، اندر کو دھنسی تیز آنکھوں اور نوکیلی ناک سے کسی پہاڑی شکرے کا خیال آتا تھا، جو اپنے دشمن پر جھپٹ پڑنے کے لیے کسی مناسب لمحے کا منتظر ہو۔

نصیب گل نے راستہ بھر فتح خان کا بے حد خیال رکھا تھا۔ ہوٹل میں وہ سب سے مہنگا

Scanned with CamScanner

کھانا منگواتا، اور اصرار کر کے اسے کھلاتا۔ ہر کھانے کے بعد وہ پیپسی یا سپرائٹ کی بوتل بھی ضرور پلاتا۔

اس سے پہلے بھی جب مدرسے میں اس کے نام کا انتخاب ہوا تھا تو اس کی جانب سب کا رویہ بدل گیا تھا۔ وہی خطیب صیب جنھوں نے کبھی کسی طالب سے کم ہی انفرادی طور پر بات کی ہو گی، وہ بھی خود دو تین بار چل کر اس کے کمرے تک آئے اور دیر تک بیٹھے اس کا حال احوال پوچھتے اور اس کی ہمت بندھاتے رہے تھے۔

فتح خان رات سونے کے لیے لیٹا تو اس کے سر میں شدید درد تھا۔ وہ جب سے تتلی والی گولیاں کھا رہا تھا، اس کے سر میں ہلکا ہلکا غبار رہتا تھا جو کبھی درد کی شکل اختیار کر لیتا۔ نصیب خان نیچے جا کر اس کے لیے سر درد کی گولیاں لے آیا تھا لیکن ان سے بھی کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔ اس سے کھانا بھی صحیح طریقے سے نہیں کھایا گیا حالانکہ نصیب گل نے اتنا کھانا منگوایا تھا میز پر مزید ڈونگے رکھنے کی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ نصیب گل اور کمانڈر اصرار کر کے اس کی پلیٹ میں کھانا ڈالتے تھے، لیکن وہ بے خیالی میں ایک آدھ نوالہ لے کر سوچوں میں گم ہو جاتا تھا۔

کمانڈر دوسرے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا جب کہ نصیب گل نے اپنے لیے گدا منگوالیا تھا اور قالین پر اسے بچھا کر لیٹ گیا تھا۔ فتح خان نے کوشش کی کہ وہ نصیب گل کو پلنگ پر سونے پر آمادہ کرے اور خود گدے پر آ جائے لیکن اس نے اور کمانڈر نے سنی ان سنی کر دی۔

تتلی والی گولی سے نیند اچھی آتی تھی، لیکن آج گولی کے باوجود رات بھر اس کا ذہن غنودگی اور نیم غنودگی کے درمیان بھٹکتا رہا۔

فتح خان کو اپنی ماں کی یاد بھی آتی رہی۔ اس کا تنور پر جھک کر روٹی لگانا اور چنگیر میں ڈالتے جانا۔ فتح خان بھوکا ہوتا تو چنگیر میں سے انگلیوں کے پوروں کو جلاتی ہوئی کڑک بھوری روٹی کا ٹکڑا توڑ کر بھاگ جاتا اور ماں مصنوعی غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہتی: دو منٹ صبر نہیں ہوتا، روٹیاں پکنے دو پھر سالن کے ساتھ کھانا؛ لیکن اتنا انتظار کون کرے، فتح جلدی جلدی روٹی نگل کر

اس تاک میں ہوتا کہ کب ماں دوبارہ روٹی لگانے کے لیے تنور میں جھکے اور وہ ایک اور ٹکڑا اچک لے۔

پھر فتح خان کے آگے اس کے دوستوں کے چہرے منڈلانے لگے، جن کے ساتھ وہ پہروں تک گھر کے آگے گلی میں کنچے کھیلتا اور کپڑے دھول سے لت پت کر لیتا تھا۔

یہ سارے مناظر اس کی آنکھوں کے آگے جھلملاتے رہے۔ پھر وہ مکمل طور پر جاگ جاتا اور سامنے کے پلنگ پر سوئے ہوئے کمانڈر کے خراٹے سنتا۔ نصیب گل کھڑکی کے نیچے منہ سر چادر میں لپیٹے پڑا تھا۔ ایک بار اس نے کروٹ بدلی تو فتح کو احساس ہوا کہ شاید وہ بھی جاگ رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ کچھ کہے، لیکن کوئی بات ذہن میں آئی ہی نہیں۔

جب فتح کی آنکھ کھلی تو دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ نصیب گل نے فون کر کے اس کے لیے ناشتہ منگوالیا۔ کمانڈر کمرے میں نہیں تھا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ آ گیا۔ اس کے کندھوں پر ایک بڑا اور بھاری بیگ تھا، اور اس نے ہاتھوں میں بھی کئی چھوٹے چھوٹے تھیلے اٹھائے ہوئے تھے۔ نصیب گل نے اس کے کندھے سے بیگ اتارنے میں مدد دی۔

'فتح بھائی،' کمانڈر نے پرچ میں چائے ڈال ڈال کر سڑکی لیتے ہوئے کہا۔ 'چائے پی کر تمھیں شیو کرنی ہو گی۔ میں سامان لے آیا ہوں، باتھ روم میں پڑا ہے، ساتھ میں کپڑے بھی تبدیل کر لینا، پتلون لے کر آیا ہوں۔ کتوں کو اطلاع مل گئی ہے اور وہ ہر طرف بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔'

فتح کی داڑھی پوری طرح نہیں آئی تھی، صرف اس کی ٹھوڑی پر خال خال بال تھے جنھیں دو چار منٹ لگا کر گنا جا سکتا تھا۔ جب فتح خان شفیق استاد کے ساتھ کام کرتا تھا تو مدرسے کے لڑکے اس کی داڑھی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے تھے کہ کچھ عرصے کے بعد یہ کوچی کی طرح آگے گی اور پھر فتح خان کو دیوار پر رنگ کرنے کے لیے برش کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

فتح نے زندگی میں کبھی شیو نہیں کیا تھا، لیکن اس نے ناشتہ کرنے کے بعد غسل خانے میں

Scanned with CamScanner

جا کر جیسے تیسے چہرے پر صابن مل کر ٹھوڑی کے بال صاف کر ڈالے۔ ٹھنڈا پانی جب بھی اس کے چہرے پر لگتا تھا تو پورے بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ اس کے چہرے پر تھوڑا سا زخم بھی آ گیا، جس میں خون کی بوند نمودار ہو گئی۔ اس نے تھوڑی دیر انگوٹھا رکھ کر دبایا تو خون رک گیا۔ نصیب گل نے اسے غسل کرنے کی ہدایت کی تھی، مگر پانی بہت ٹھنڈا تھا اس لیے اس کی ہمت نہیں بندھ رہی تھی۔ پھر اس نے دیکھا کہ غسل خانے میں دو ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ اس نے دائیں طرف والی ٹونٹی گھمائی تو وہاں سے گرم پانی آنے لگا، جو تھوڑی دیر بعد ناقابلِ برداشت حد تک گرم ہو گیا۔ فتح نے آدھی بالٹی گرم پانی والی ٹونٹی سے اور آدھی ٹھنڈے پانی سے بھری اور نہ جانے کتنے دنوں بعد خوب صابن مل مل کر مگ سے پانی سر پر انڈیلتا رہا۔

'یہاں کام کرتے ہوئے مجھے جو پتہ چلا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ سارا بارودی مواد پیٹ اور سینے پر آگے پیچھے بندھا ہوتا ہے، اس لیے دھماکے میں دھڑ تو مکمل طور پر ضائع ہو جاتا ہے لیکن دس میں سے آٹھ دفعہ سر جسم سے کٹ کر دور جا گرتا ہے اور تباہ ہونے سے بچ جاتا ہے۔'

شفیق اپنے گھر میں کرسی پر بیٹھی ہوئی گل مینہ کو جب یہ باتیں سنا رہا تھا تو اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں اور وہ سامنے سفید دیوار کو گھور رہی تھی۔

'اس سر کو یہ لوگ لے آتے ہیں اور اس کی مدد سے حملہ آور کو شناخت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کو ڈی این اے ٹیسٹ کہتے ہیں، انھوں نے تمھارا خون کا نمونہ بھی لے کر اسے فتح خان سے ملایا ہوگا۔'

شفیق کی بیوی عائشہ نیچے قالین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے چائے کے برتن اور بسکٹ میز پر لا کر رکھ دیے تھے لیکن کسی نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں، اور نہ ہی اس نے گل مینہ سے چائے لینے کا اصرار کیا۔

'ٹھیک ہے، وہ اس کے ساتھ جو کرتے ہیں، کر لیں، پھر سر ہی میرے حوالے کر دیں، تاکہ میں اسے دفنا سکوں۔ اس کے باپ کی قبر نہیں ہے، کم از کم بیٹے کی قبر تو ہو جس پر میں کبھی کبھار آ کر پھول چڑھا سکوں،' گل مینہ نے کہا۔

عائشہ اس گفتگو کے دوران خاموش رہی لیکن اس کے رخسار آہستہ آہستہ بھیگتے چلے گئے۔ اس نے منہ پھیر کر دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ لیں۔

'تمھاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے،' شفیق نے کہا۔ 'لیکن میرا مشورہ ہے کہ تم واپس وزیرستان چلی جاؤ۔ تمھیں نہیں پتہ کہ کیا حالات چل رہے ہیں، تمھارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے

Scanned with CamScanner

گا۔ الٹا تمھارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ مجھے تو اسی بات پر حیرت ہے کہ انھوں نے تمھیں اتنی جلدی چھوڑ کیسے دیا۔' شفیق نے اپنی قید کے دوران بہت سے واقعات دیکھے اور سنے تھے۔ اسی لیے اس گل مینہ کی اتنی فکر تھی۔

عائشہ نے منھ دوسری طرف پھیر کر ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ شفیق نے اس کی طرف دیکھا مگر خاموش رہا۔ اس نے واپس آنے کے بعد عائشہ کو اپنی کہانی سنانے کے علاوہ گل مینہ اور فتح خان کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا تھا۔

'مجھے کوئی پروا نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے،' گل مینہ کہہ رہی تھی۔ 'میری آدھی زندگی فتح خان کے باپ کے ساتھ ختم ہوگئی تھی، بقایا آدھی فتح اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اب میرے لیے کچھ نہیں بچا۔ اس لیے میں کسی بھی صورت خالی ہاتھ واپس نہیں جاسکتی۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے۔'

عائشہ نے ہچکیوں کے درمیان کہا، 'اگر بہت بڑے قاتل کو پھانسی ہوتی ہے تب بھی مرنے کے بعد لاش وارثوں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ یہ تو بچہ تھا، ہمارے ارسلان سے بھی چھوٹا، غلط ہاتھوں میں پڑ گیا۔ مرنے کے بعد سارے مقدمے، ساری سزائیں ختم ہوجاتی ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ انھوں نے مرنے والے کے جسم کا واحد بچا ہوا حصہ بھی قید کر رکھا ہے؟ گل مینہ بہن کی بات سو فیصد صحیح ہے، وہ جو ٹیسٹ کرتے ہیں، کر لیں، اس کے بعد سرتوان کو واپس لوٹا دیں۔'

بات غلط اور صحیح کی نہیں ہے، بات تو یہ ہے کہ ان سے کون پوچھ سکتا ہے؟ وہاں تو نہ پولیس کی چلتی ہے نہ حکومت کی۔ اور تو اور، ان کے سامنے عدالتیں تک پر نہیں مار سکتیں۔ اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ معاملہ آگے بڑھانے یا اصرار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، الٹا نقصان ہوجائے گا۔ وہ لوگ بہت طاقتور ہیں۔'

'یہ کیسی طاقت ہے جو صرف ایک بے بس عورت ہی پر چلتی ہے؟ ہم طاقت کا مقابلہ طاقت سے نہیں کر سکتے، لیکن میں جانتی ہوں کہ معاملہ کیسے آگے بڑھایا جائے،' عائشہ نے کہا۔ 'دو

گلیاں چھوڑ کر کبوتروں والا جو گھر ہے، ان کا لڑکا اخبار میں کام کرتا ہے۔ تمھاری گمشدگی کی خبر بھی اسی نے اپنے اخبار میں لگائی تھی۔ اسی خبر کی وجہ سے پولیس نے کیس درج کیا تھا، ورنہ وہ تو ہمیں ہر بار ٹال کر واپس بھیج دیتے تھے۔ میں ارسلان کو بھیج کر اسے بلاتی ہوں۔ وہ خود گل مینہ سے بات کرے۔ اخبار میں بات آئے گی تو کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ آخر لوگوں کو بھی تو پتہ چلے کہ یہاں ہو کیا رہا ہے۔'

Scanned with CamScanner

74

فتح خان نے ہوٹل تاج محل میں زندگی میں پہلی بار پتلون شرٹ پہنی۔ اسے شرٹ تو پوری آ گئی البتہ پتلون ذرا ڈھیلی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پتلون پکڑ کر باہر نکلا اور کمانڈر کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ نصیب گل نے کمانڈر کی ہدایت پر شاپنگ بیگ میں سے سیاہ رنگ کی چمڑے کی بیلٹ نکالی اور فتح کی کمر کے گرد گھما کر اس کا کلپ بند کر دیا۔

کمانڈر نے اپنے بستر پر پورا ہاٹ کھول رکھا تھا۔ طرح طرح کی موٹی پتلی تاریں، بھورے رنگ کے پائپ، موٹی موٹی کیلیں اور پیچ۔ لیکن سب سے بڑھ کر سیاہ چمکدار لوہے کے گول گول چھوٹے بڑے کنچے۔ فتح کا ذہن کئی برس پیچھے چلا گیا جب وہ ارغنداب میں اپنے گھر کے باہر گلی میں حسن اور دوسرے لڑکوں سے کنچے کھیلا کرتا تھا۔ حسن کنچے کھیلنے کا کتنا ماہر تھا! دورے درمیانی انگلی کو تان کر تاک کر ایسا نشانہ لگاتا تھا کہ کئی گز دور رکھا کنچہ چڑیا کی طرح پھُر سے اڑا دیتا تھا۔ کسی وجہ سے فتح کی درمیانی انگلی پوری طرح پیچھے نہیں مڑتی تھی، اور اس سے پھینکا ہوا کنچہ نہ تو نشانے پر بیٹھتا تھا نہ ہی زیادہ دور جاتا تھا۔ اسے چھوٹے بچوں کی طرح انگشتِ شہادت ہی سے کام لینا پڑتا تھا، جس کی وجہ سے حسن اسے مذاق کا نشانہ بھی بناتا تھا: ”فتح خانا، تمھاری کنچے کھیلنے کی عمر نہیں ہے، جاؤ گھر میں جا کر ماں کی گود میں بیٹھو، یہ مردوں کا کام ہے، ہم جیسے مردوں کا،“ وہ چھاتی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہتا۔ پھر بھی فتح محلے کا واحد لڑکا تھا جو ڈٹ کر حسن کا مقابلہ کرتا تھا۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب اس نے بالآخر حسن کو کئی گھنٹوں تک جاری رہنے والے ایک سخت مقابلے کے بعد پہلی بار شکست دی تھی اور اس کے سارے کنچے جیت لیے تھے۔ اس دوران اس کی ماں نے کئی بار آواز دی لیکن وہ ایسا تاریخی لمحہ کیسے ہاتھ سے جانے دیتا۔ ماں کے کوسنوں کے باوجود وہ کنچوں سے چھن چھن بھری جیب لیے کیسا ساری گلی میں اتراتا پھرا تھا۔

فتح کے دل میں بے طرح خواہش امڈی کہ وہ کمانڈر کے بستر پر بکھرے ہوئے آہنی کنچوں میں سے ایک کو اٹھا کر ہاتھ میں تولے اور انگشتِ شہادت کی نوک پر چڑھا کر دیکھے، لیکن پھر کمانڈر کے انہماک اور نصیب گل کی سنجیدگی نے اسے باز رکھا۔

میز پر چائے اور کیک پڑے ہوئے تھے۔ کمانڈر پلنگ پر اپنا کام چھوڑ کر کرسی پر آ بیٹھا اور پیالی میں چائے ڈال کر اسے پرچ میں رکھا، اور پرچ فتح کو تھما دی۔ فتح کو محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھوں میں پرچ کپکپا رہی ہے۔ جب پیالی کھنکھنانے لگی اور اسے خدشہ ہوا کہ کہیں چائے چھلک نہ جائے تو اس نے جلدی سے اسے واپس میز پر رکھ دیا اور نصیب گل کی طرف دیکھا۔ وہ اور کمانڈر اس کی جانب دیکھے بغیر چائے پی رہے تھے۔

کمانڈر اٹھ کر فتح کے قریب آ گیا اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”یاد رکھو فتح تم ایک عظیم کارنامہ سرانجام دے رہے ہو، اپنے لیے، اپنے خاندان کے لیے، اپنی قوم کے لیے، ملک کے لیے، مذہب کے لیے، اور سب سے بڑھ کر اپنے اللہ کے لیے۔ یہ موقع کسی کسی خوش نصیب کو ملتا ہے۔ کم ہی مائیں ایسی ہوتی ہیں جو ایسے شیر کو جنم دیتی ہیں۔ یہ سمجھو کہ تمھارے نام پر لاٹری نکل آئی ہے۔ بس تم نے ایک قدم اٹھانا ہے اور دوسرا قدم سیدھا جنت میں پڑے گا۔ سوچو وہ کتنے بدنصیب ہیں جو پیچھے رہ گئے ہیں جو مزید پچاس ساٹھ سال گھسٹ گھسٹ کر جیتے رہیں گے اور پھر ایک دن کسی نہ کسی بیماری سے اپاہج ہو کر بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔ مرنا تو انھوں نے بھی ہے لیکن وہ چوہے کی زندگی اور کتے کی موت ہے۔“

فتح خان خاموشی سے سنتا رہا۔ نصیب گل بھی کچھ نہیں بولا اور آہستہ آہستہ چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔

کمانڈر نے اب ایک موٹا سوا سنبھال لیا تھا اور تمام چیزوں کو کپڑے کے اندر سی رہا تھا۔ کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد آخر اس نے ایک جیکٹ اور واسکٹ کے درمیان کی کوئی چیز تیار کر لی۔ نصیب گل کونے میں جائے نماز پر بیٹھا اس چھوٹے سے قرآن کی تلاوت کر رہا تھا جو اسے

Scanned with CamScanner

پلنگ کے ساتھ والی دراز میں رکھا ہوا ملا تھا۔ کمانڈر واسکٹ لیے احتیاط سے چلتا ہوا فتح کے پاس آیا۔ وہ خود بخود کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مکانیکی انداز میں ایک بازو بلند کیا پھر دوسرا اور کمانڈر نے اسے واسکٹ پہنا دی۔ واسکٹ بہت بھاری تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس نے بیس کلو آٹے کا تھیلا کندھوں پر اٹھایا ہوا ہے۔

نہ جانے کہاں سے اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ پلنگ کے ساتھ پڑی سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر دیکھے کہ واسکٹ اس پر کیسی لگ رہی ہے، لیکن پھر اس نے خود ہی اس خواہش کو احمقانہ قرار دے کر ذہن سے جھٹک ڈالا۔

واسکٹ کے بعد اسے نیلے رنگ کی جیکٹ اوڑھائی گئی جو اس کے ناپ سے کہیں بڑی تھی۔ کمانڈر جیکٹ کی زپ بند کرتے ہوئے اسے ہدایات دیتا رہا: 'بس میری طرف دیکھتے رہنا، جب میں اشارہ دوں تب ڈور کھینچ دینا۔ میرے کہے بغیر کچھ نہ کرنا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھبرانا بالکل نہیں۔'

فتح خان کبھی دوستوں کے ساتھ ارشنداب دریا میں نہانے جاتا تو کانوں میں پانی چلا جاتا اور قریب سے بات کرنے والا بھی ایسے لگتا جس گلی کے دوسرے کنارے سے بول رہا ہے۔ اسے اب بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا کہ شاید اس کے کان بند ہو گئے ہوں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کمانڈر بہت دور کہیں سے بول رہا ہے، اور اس کی کچھ باتیں تو بالکل سنائی نہیں دے رہی تھیں حالانکہ کمانڈر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

فتح نے دیکھا کہ نصیب نے دوسری طرف منہ پھیر لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جذبات کی نمی تھی یا غم کی، فتح اندازہ نہیں لگا سکا۔

جب ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو کمانڈر نے فتح کا ہاتھ پکڑا اور اسے سیڑھیوں سے یوں اتارا جیسے گاؤں کی عورتیں دلھن کو قدم قدم چلا کر ڈولی میں بٹھاتی ہیں۔

نیچے گلی میں بہت بھیڑ بھاڑ تھی۔ موٹر سائیکلوں، رکشوں، کاروں کے ریوڑ کے ریوڑ

بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ عصر کی نرم دھوپ دکانوں کے شیشوں سے چمک رہی تھی۔ کبھی کبھی ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا گالوں سے ٹکراتا تھا۔ نصیب گل نے کندھوں پر اپنا اور فتح دونوں کے بیگ اٹھائے ہوئے تھے۔ اس نے فتح کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑ لیے، اور نہ جانے کیا کہتا رہا لیکن فتح نے صرف اس کے ہونٹ ہلتے دیکھے، کسی بات کی سمجھ نہیں آئی۔ کمانڈر نے انھیں الگ کیا اور فتح کا ہاتھ تھام کر مشرق کی سمت چل پڑا۔ فتح نے مڑ کر دیکھا، نصیب گل وہیں کھڑا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ اس کا بیگ غلطی سے نصیب گل کے کندھے ہی پر رہ گیا ہے۔ اس نے سوچا کہ شاید نصیب گل کو اپنی غلطی کا اندازہ ہو جائے گا اور وہ آگے بڑھ کر اس کا بیگ اسے تھما دے گا، لیکن نصیب گل وہیں بت بنا کھڑا رہا۔

سڑک کے دونوں طرف کھمبے اور دیواریں رنگ رنگ کے پوسٹروں سے بھری ہوئے تھے۔ جگہ جگہ بینر ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ان میں اکثر بینروں اور پوسٹروں پر ایک ہی عورت کی تصویر چھپی تھی جس کے گلے میں پھولوں کے ہار تھے اور اس نے دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کر رکھا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد جا کر جب وہ سڑک کا موڑ مڑے تو زبردست شور کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں، جیسے آگے کوئی بہت بڑا بلوہ ہو رہا ہو۔ سینکڑوں، ہزاروں یا شاید لاکھوں لوگ مل کر چیخ رہے تھے، سیٹیاں بجا رہے تھے، تالیاں پیٹ رہے تھے۔ اس ہنگامے میں ایک عجیب قسم کی رسہ کشی جاری تھی۔ ایک عورت کی تیز آواز لاؤڈ سپیکروں پر بلند ہوتی تھی اور سڑک کے دونوں جانب اینٹوں والی دیواروں پر سے گونجتے ہوئے شور پر حاوی ہو جاتی تھی، لیکن چند لمحوں بعد شور دوبارہ اس پر غلبہ پا لیتا تھا۔

Scanned with CamScanner

مس رخسانہ، آپ ہی ہینڈل کر رہی تھیں یہ کیس نا؟ ہر طرف ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اس عورت نے۔ مجھے اوپر سے فون آرہے ہیں کہ آخر ہم نے اسے چھوڑا ہی کیوں؟'

رخسانہ کو اس معاملے کی تیسری بار وضاحت دینا پڑ رہی تھی۔ اس کی نو سالہ سروس کا ٹریک ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ اب تک اس کے پاس جو کیس آئے تھے، وہ اس نے سب کے سب حل کیے تھے۔ لیکن یہ کیس حلق میں ہڈی کی طرح پھنس گیا تھا۔ اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ صرف اور صرف اسی کیس کی اہمیت ہوتی تھی جو اس وقت چل رہا ہو، ماضی کی کامیابیوں کی داستانیں یہاں نہیں چلتی تھیں۔

یہ قبائلی عورت اس کے ہاتھوں سے نکل کر اب ہر چینل پر نظر آنے لگی تھی۔ اور تو اور، کل نیویارک ٹائمز میں بھی اس کے بارے میں ایک لمبی چوڑی سٹوری چھپی تھی، جس میں اس کی زندگی کی تمام کہانی بیان کی گئی تھی۔ رخسانہ کے پاس اطلاع تھی کہ سی این این اور بی بی سی والے بھی اس کا انٹرویو کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تمام مقامی اخباری ادارے اور ٹیلی ویژن چینل اس کی خبر شہ سرخیوں میں چلا رہے تھے۔

'بیوہ اپنے نوعمر بیٹے کا سر دفنانا چاہتی ہے'

'خودکش حملہ آور کی ماں کی فریاد'

'دہشت گرد کی بھی ماں ہوتی ہے'

'دہشت گرد کا سر کس کی ملکیت ہے؟'

ٹیلی ویژن پر اس قسم کے ٹکر اور اخباروں میں سرخیاں ہر جگہ نظر آتی تھیں۔

ایسی صورتِ حال میں مولوی کیوں پیچھے رہتے؟ انھوں نے بھی بیانات دینا شروع کر

دیے تھے کہ موت کے بعد تمام سزائیں ختم ہو جاتی ہیں، مرنے کے بعد مجرم کی لاش کے واحد وارث اس کے لواحقین ہوتے ہیں اور حکومت کو کوئی حق نہیں کہ وہ لواحقین کا یہ حق پامال کر سکے، اور یہ کہ کسی بھی مسلمان کی لاش، چاہے وہ کتنا بڑا مجرم کیوں نہ ہو، دفنائے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی، لاش کی بے حرمتی انسانیت کی توہین ہے، وغیرہ۔

'سر، میں نے اسے چھوڑنے سے پہلے آپ سے ڈسکس کیا تھا۔ ہمارے پاس اسے مزید اپنے پاس رکھنے کا جواز نہیں تھا۔ ہم جو انفارمیشن اس سے لے سکتے تھے وہ پہلے ہی لے چکے ہیں۔ وہ ان پڑھ قبائلی عورت ہے، اس کے ذہن میں یہ باتیں آ ہی نہیں سکتیں۔ اسے کوئی استعمال کر رہا ہے۔'

'کون استعمال کر رہا ہے؟ کیوں استعمال کر رہا ہے؟' ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔ 'یہی معلوم کرنا تو ہمارا کام ہے۔ تم کہہ رہی ہو وہ قبائلی عورت ہے، پھر وہ میڈیا تک کیسے پہنچ گئی، اور جگہ جگہ انٹرویو کیسے دیتی پھر رہی ہے؟'

'سر وہ پیٹر شفیق جسے ہم نے شمالی وزیرستان سے پکڑا تھا، وہ اسے اپنے گھر لے گیا تھا،' رخسانہ نے کہا۔ 'اس کے بعد وہ کئی دفعہ ہمارے ہیڈ کوارٹر کے گیٹ تک آتی رہی ہے کہ اس سوئی سائیڈ بامر کا سر اس کے حوالے کر دیا جائے، وہ اسے دفنانا چاہتی ہے۔ بس یہیں کہیں سے وہ میڈیا کے ہاتھ لگ گئی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ایک میڈیا گروپ پنجے جھاڑ کر ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اسی نے زیادہ ہائپ کری ایٹ کیا ہے۔ بعد میں پھر بھیڑ چال شروع ہو گئی۔'

'جو ہوا، ہوا لیکن اب ہم مزید نیگیٹو پبلسٹی افورڈ نہیں کر سکتے، پہلے ہی اس ایسی نیشن کی وجہ سے ہر انگلی ہماری طرف اٹھ رہی ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ انکاپسی ٹینس ہے، دوسرے کہہ رہے ہیں کہ اسے قتل ہی ہم نے کروایا ہے، دونوں صورتوں میں ہمارا ہی امیج بگڑ رہا ہے۔ اوپر سے یہ نئی مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔ وی مسٹ سٹاپ دس وومن ایٹ اینی کاسٹ۔'

'تو پھر وہ سر اس کے حوالے کر دیں؟ جان چھڑائیں؟' رخسانہ نے کہا۔

Scanned with CamScanner

'نہیں سر، آئی بیگ ٹو ڈفر، آئی ایم افریڈ مس رخسانہ صاحبہ معاملے کی گریوٹی کا پورا پورا اندازہ نہیں کر پا رہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر وہ سر اس کو دے دیا تو یہ لوگ اسے ایکسپلائٹ کریں گے، شہید ڈیکلیئر کر کے اس کا مزار بنا دیا جائے گا، وہ دوسرے سوئی سائیڈ بامرز کے لیے انسپریشن اور ریلی اینگ کرائی بن جائے گا سر۔'

یہ راجہ جاوید اکرم تھا، کسی سٹنگ ایم این اے کا بھتیجا یا سالا۔ اسے ہر بات میں یقراطیت جھاڑنے کا بڑا شوق تھا۔ ابھی حال ہی میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر انویسٹی گیشن کی پوسٹ خالی ہوئی تھی۔ بظاہر تو ایسا لگتا تھا کہ وہ پوسٹ بنی ہی رخسانہ کے لیے ہے، مگر گل مینہ والے واقعے کی وجہ سے اس کی پوزیشن بڑی ڈانواڈول ہو گئی تھی۔ اس پوسٹ پر جاوید بھی نظریں لگائے بیٹھا تھا، جو یوں تو اس سے بہت جونیئر تھا اور اس کا ٹریک ریکارڈ بھی رخسانہ کی ٹکر کا نہیں تھا لیکن گل مینہ والے واقعے کی وجہ سے اسے سر خیمے کے اندر گھسانے کا موقع مل گیا تھا، اور اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ پورے کا پورا اندر گھس آئے۔ اس کے اندر ایک اور خوبی بھی تھی کہ وہ مرد تھا، اور اس لائن میں کسی عورت کا اپنے لیے مقام بنانا آسان نہیں تھا۔ یہ رخسانہ ہی جانتی تھی کہ اسے یہاں تک پہنچنے کے لیے کسی بھی مرد سے دوگنا زیادہ محنت کرنا پڑی تھی۔ اب اگر اس کی بجائے اس کے جونیئر کو یہ پوسٹ مل گئی تو اس کے لیے ڈیپارٹمنٹ میں سر اٹھا کر کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔

'جی سر، راجہ صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں،' یہ آواز بڑی بڑی مونچھوں والے مقصود گھمن کی تھی۔ یہ مونچھیں رخسانہ کو ہمیشہ جوتے پالش کرنے والے برش کی یاد دلاتی تھیں۔ اس کی سوچ ابھی تک کسی دیہاتی تھانیدار سے آگے نہیں بڑھی تھی اور وہ جاوید کی ہر بات کی تائید کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتا تھا۔ گل مینہ کو لیاقت باغ سے اسی نے گرفتار کیا تھا، اور وہ ہر جگہ یہ بات جتانا ضروری سمجھتا تھا۔ 'یہ سر میڈیا کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اس کی ویڈیو اور تصویریں دنیا بھر میں نشر کر دیں گے۔ دہشت گرد اس کے پوسٹر چھاپ کر گلی گلی چپکا دیں گے۔ آپ جانتے ہیں وہ لوگ میڈیا اٹینشن کے کتنے بھوکے ہیں۔ وہ یہ سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔'

'ایک اور بات بھی ہے،' جاوید اکرم بولا۔ 'اگر ایک سران کے حوالے کر دیا تو دوسرے لوگ، دہشت گردوں کے دوسرے لواحقین بھی سامنے آ سکتے ہیں۔ ہر کوئی کہے گا کہ اس کو دے دیا ہے تو ہمیں بھی دو۔ ہم کس کس کی ڈیمانڈز پوری کرتے پھریں گے۔'

'میں آپ سے ایگری کرتا ہوں،' ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔ 'سران کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ رخسانہ، تم ایسا کرو کہ اس عورت کو یہاں بلواؤ، یا اس سے وہیں جا کر بات کرو، کسی طرح اس کا منھ بند کرواؤ۔ پیسے دو، دباؤ ڈالو، ڈراؤ، دھمکاؤ، کچھ بھی کرو۔ ظاہر ہے سختی نہیں کی جا سکتی، ورنہ میڈیا اور ہیومن رائٹس والے کتے مہینوں تک بھونکتے رہیں گے، اس لیے کچھ اور سوچو۔ جاوید، آپ پلان بی تیار کر کے کل دوپہر مجھ سے ڈسکس کرو۔'

'اس عورت کو میں پکڑ کر لایا تھا،' مقصود گھمن کو موقع مل گیا۔ 'اس لیے میں جانتا ہوں کہ وہ کتنی ڈھیٹ ہے۔ اس نے تو کتنا عرصہ زبان تک نہیں کھولی تھی۔ مس رخسانہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود۔ اس لیے یہ کام آسان نہیں ہوگا۔'

'رخسانہ، ڈو یو تھنک یو کین ہینڈل دِس؟' ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔ 'اگر تمھیں کسی کی مدد چاہیے، کسی قسم کے ریسورسز چاہییں، مین پاور، کیش، سب تمھارے ڈسپوزل پر ہیں، لیکن یہ قصہ ہر حال میں جلد سے جلد ختم ہونا چاہیے۔ بائی ہک آر بائی کروک۔ مجھے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر رپورٹ چاہیے۔ ویٹ دل بی آل،' انھوں نے کہا اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

'یس سر، میں پوری کوشش کروں گی،' رخسانہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور دوسروں کے میٹنگ روم سے نکلنے کا انتظار کرنے لگی۔

Scanned with CamScanner

77

گل مینہ ایک سپاہی کے پیچھے پیچھے چلتے راہداری میں آ گئی۔ شفیق بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ یہاں میڈم رخسانہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ وہ گل مینہ کو الگ لے گئی۔

'دیکھو گل مینہ، یہ بات بہت ضروری ہے، تم ایک بار پھر قسم کھا کر وعدہ کرو کہ میں تمھیں فتح خان کی قبر دکھا دوں تو تم واپس وزیرستان چلی جاؤ گی۔ میں تمھیں اچھے پیسے بھی دے دوں گی، تمھارا گزارا ہو جائے گا، لیکن تم نے آج کے بعد میڈیا سے بات نہیں کرنی، دیکھو میری نوکری کا معاملہ ہے۔'

گل مینہ نے رخسانہ کی طرف دیکھا۔ اس کی سانسوں سے سگریٹ کی تیز بدبو آ رہی تھی اور دور برآمدے میں جلتے زرد بلب کی روشنی میں آنکھوں کے نیچے حلقے نمایاں نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی عمر سے دس سال بڑی لگ رہی تھی۔

گل مینہ دیر تک رخسانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا، 'یہ ایک قبائلی عورت کی زبان ہے۔ تم صرف اپنا وعدہ پورا کرو، یہ سر کٹ جائے گا، زبان نہیں پھرے گی۔'

'چلو پھر جلدی کرو۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو میری نوکری تیل ہو جائے گی،' رخسانہ نے مڑ کر شفیق کی طرف دیکھا، 'شفیق تم ہماری واپسی تک ادھر ہی رہو۔'

'نہیں، یہ ہمارے ساتھ جائے گا،' گل مینہ نے کہا اور شفیق کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ رخسانہ نے ہاتھ میں پکڑی ڈبیا سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور چل پڑی۔ دو راہداریاں گھومنے کے بعد وہ سیڑھیاں اتر کر گھاس کے میدان میں آ گئے جس کے بیچوں بیچ اینٹوں کی بنی ہوئی روش چند سو فٹ دور ایک اور عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ شام سے جاری بارش اب اتنی مہین پھوار کی شکل اختیار کر گئی تھی، جس سے فوری طور پر بھیگنے کا خدشہ نہیں تھا۔ البتہ ہوا تیز اور خوب

ٹھنڈی تھی۔ دور عمارت کے آگے لگے بلب کی زرد بیمار روشنی دھند کا پردہ چاک کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ آگے آگے میڈم رخسانہ، اس کے پیچھے گل مینہ اور آخر میں شفیق تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے سرخ اینٹوں سے بنی عمارت کے قریب پہنچ گئے۔

رخسانہ سیدھی عمارت کے اندر جانے لگی، گل مینہ اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی، جب کہ شفیق اس کے پیچھے تھا۔ تینوں بالکل خاموش تھے۔

گل مینہ کو معلوم نہیں تھا کہ فتح خان کو دیکھنے کے بعد اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ کیا وہ اس سے لپٹ جائے گی، اور بین شروع کر دے گی؟ یا پھر خشک آنکھوں سے فاتحہ پڑھ کر واپس آ جائے گی۔ فتح خان کی صورت بار بار اس کی آنکھوں کے آگے تیر جاتی تھی۔ اسے اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ ان میں سے زیادہ تر تصویریں اس وقت کی تھیں جب وہ بہت چھوٹا تھا۔ اس کے بڑے ہونے کے بعد کی بہت کم تصویریں اس کے سامنے آتی تھیں۔ پچھلے دو تین دن سے خاص طور پر ایک منظر بار بار اسے یاد آتا تھا۔ وہ آٹھ نو مہینے کا تھا اور وہ اسے دالان میں چارپائی پر سوتا چھوڑ کر کسی کام سے ہمسائی کے گھر چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ گھر لوٹی تو کوئی آواز نہ ہونے کی وجہ سے سمجھی کہ شاید وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ لیکن قریب جا کر دیکھا تو وہ بستر پر لیٹا اپنی موٹی موٹی روشن آنکھوں سے اسے ٹک ٹک گھور رہا تھا۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔ جیسے وہ اسے ملامت کر رہا ہو کہ وہ اسے یوں اکیلے گھر میں چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی، اگر کچھ ہو جاتا تو؟ میں چارپائی سے گر جاتا تو؟ کئی لمحے یونہی گھورنے کے بعد اس نے اوپر اٹھنے کی کوشش میں ہمک کر اپنی کمر اکڑا کر کمان کر لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب دیکھ کیا رہی ہو، اٹھا لو۔ گل مینہ نے اسے اٹھا کر اس کے ترو تازہ کُپاسے گالوں پر چٹاک چٹاک سے بوسے ثبت کر دیے۔

گل مینہ کے گالوں پر آنسو رواں ہو گئے۔

رخسانہ نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر تک وہ اندر موجود کسی شخص سے بات کرتی رہی۔ دروازہ کھل گیا، اور وہ تین سیڑھیاں چڑھ کر ایک لمبی راہداری میں آ گئے۔ ایک اور دروازہ،

Scanned with CamScanner

اور گل مینہ کی ناک سے تیز بو ٹکرائی اور سیدھی دماغ تک چڑھ گئی۔ اس قسم کی بو گل مینہ نے میران شاہ کے ہسپتال میں سونگھی تھی جہاں دادا اسے علاج کروانے لے گئے تھے۔ البتہ یہ بو اس سے کہیں زیادہ کڑوی اور چبھتی ہوئی تھی۔

وہ تینوں ایک خاصے بڑے، نیم تاریک، بغیر کھڑکیوں والے کمرے میں کھڑے تھے۔ کمرا بے حد ٹھنڈا تھا، ریڑھ کی ہڈی میں جھرجھری پیدا کرنے کی حد تک ٹھنڈا۔ شاید کسی نے اس موسم میں بھی وہاں ٹھنڈک پیدا کرنے والی مشین لگا رکھی تھی۔ گل مینہ کو سردی زیادہ لگتی تھی، اس نے اس وقت صرف ایک ہلکی سی چادر اوڑھ رکھی تھی جو اس ٹھنڈک کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھی لیکن اسے اس وقت سردی کی پروا نہیں تھی۔

کمرے میں کئی میزیں ترتیب سے پڑی تھیں۔ یہ میزیں اتنی لمبی تھیں کہ ایک دیوار سے شروع ہو کر دوسری دیوار تک پہنچ گئی تھیں۔ ان پر طرح طرح کے شیشے کے برتن پڑے تھے جن کے اندر سے نلکیاں آجا رہی تھیں۔ آلات اور بجلی سے چلنے والی مشینیں ان کے علاوہ تھیں جن کی تاریں میزوں کے نیچے لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ مشینوں میں ٹی وی لگے ہوئے تھے جن پر انگریزی میں کچھ لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مشینوں کے چلنے کی گھر گھر کی ہلکی ہلکی مگر مستقل آواز کمرے میں پھیلی ہوئی میں گھل رہی تھی۔ کمرے میں کوئی شخص موجود نہیں تھا۔

گل مینہ کی نظریں آہستہ آہستہ سامنے والی دیوار پر مرکوز ہو گئیں۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کی اونچی، بغیر پٹ والی الماریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان الماریوں میں شیشے کے مرتبان قطاروں میں رکھے ہوئے تھے، جو پانی یا کسی اور بے رنگ سیال سے لبالب بھرے ہوئے تھے۔۔۔ اور ان مرتبانوں کے اندر کیا تھا۔۔۔؟ گل مینہ نے آنکھیں پھاڑ کر زیادہ روشنی آنکھوں میں جذب کرنے کی کوشش کی۔ چہرے؟ انسانی چہرے؟ سر؟

میڈم رخسانہ نے اسے مرتبانوں کے قریب جانے کا اشارہ کیا۔ گل مینہ نے قدم اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کا اوپری دھڑ تحلیل کرتے ہوئے آگے بڑھا، پیر سُن ان سنی کرتے ہوئے

وہیں کے وہیں چپکے رہے۔ گل مینہ اگر جلدی سے میز کا کونا پکڑ نہ لیتی تو اوندھے منہ زمین پر ڈھیر ہو جاتی۔ اس نے بڑی مشکل سے جیسے اپنے پیر کھینچ کر فرش کی دلدل سے نکالے اور انھیں گھسیٹتی ہوئی میز کا سہارا لے کر ایک ایک قدم آگے بڑھی۔ ایسے ہی جیسے کبھی وہ صحن میں پڑی چارپائی کے بازو کا سہارا لے کر ہر قدم تول تول کر کچی زمین پر رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔

وہ مشکل سے چلتی مرتبانوں والی الماریوں کے قریب پہنچ گئی۔ شفیق ایک ہیولے کی طرح ساتھ ساتھ تھا۔ میڈم رخسانہ دروازے کے پاس ہی کھڑی رہی۔ بواب تیز ہو کر سوئیوں کی طرح ناک میں چبھنے لگی تھی۔ رخسانہ نے بٹن دبا کر ایک اور بلب جلا لیا۔ اب سب کچھ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی نظریں ایک مرتبان سے دوسرے مرتبان پر تیزی سے دوڑ رہی تھیں۔ ہر مرتبان میں ایک جیسے چہرے بے نور سفید آنکھوں سے دائمی ٹکٹکی باندھ کر سامنے دیکھتے۔۔۔ کچھ پر کھرونچوں کے نشان، جو پہلے کبھی سرخ رہے ہوں گے لیکن اب سیاہ پڑ گئے تھے۔۔۔ دو تین کے سروں پر زیادہ بڑے زخم تھے جن سے خون رسنا کب کا بند ہو چکا تھا کیوں کہ مرتبان کے سیال میں کسی قسم کی سرخی کی آمیزش نہیں تھی۔۔۔ زیادہ تر گالوں پر سبزے کا آغاز۔ ہونٹوں پر ہلکی سی روئیدگی۔ نقوش میں ہلکا سا تذبذب، جیسے بچپن اور جوانی کی سرحد پر کھڑے فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹ جائیں۔

ایسا لگتا تھا جیسے یہ سب گروپ فوٹو کھنچوانے کے لیے ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا ملا کر اور آگے پیچھے سانس روکے ہوئے ساکت کھڑے ہوئے ہیں۔ ابھی فوٹوگرافر اپنے کیمرے کو تیار کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ 'ایک، دو، تین' کہہ کر بٹن دبا دے گا۔ روشنی کا جھماکا ہوگا اور تصویر مکمل ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک بار پھر سکول کے کھلنڈرے لڑکوں کی طرح ہنستے کھیلتے، ایک دوسرے کو دھکے دیتے، ایک دوسرے کی ہتھیلیوں پر ہاتھ مارتے ہوئے ادھر ادھر بکھر جائیں گے۔

گل مینہ کے پاس فتح خان کی ایک ایسی ہی تصویر تھی جو اس نے فریم کروا کر دیوار پر

Scanned with CamScanner

ٹانگ رکھی تھی۔ یہ تصویر اس نے ساتویں جماعت میں اپنے ساتھی طلبہ کے ساتھ کھنچوائی تھی۔ اس میں پندرہ سولہ لڑکے تھے، لڑکوں نے فٹ بال ٹیم کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ لڑکوں کی تین قطاریں تھیں۔ پہلی قطار میں وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے دو قطاروں میں لڑکے یوں کھڑے تھے کہ اکثر کے صرف سر نظر آ رہے تھے۔ فتح خان دوسری قطار میں دائیں سے تیسرے نمبر پر کھڑا تھا۔

گل مینہ کو احساس ہوا کہ مرتبانوں میں پڑے چہروں کی شکلیں آپس میں ملتی جلتی ہیں۔۔۔ یا ممکن ہے اس سیال میں رہنے کی وجہ سے ایک جیسی ہو گئی ہوں۔۔۔؟ یا ہو سکتا ہے یہ سب کے سب آپس میں بھائی ہوں۔۔۔؟ کسی ایک ماں کی اولاد۔۔۔؟ پھر اس نے خود ہی اس خیال کو جھٹک دیا۔ ایک ماں کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔؟ سب الگ الگ ماؤں کے جگر کے ٹکڑے ہیں جو کسی نے لا کر شیشے کی دیواروں میں قید کر دیے ہیں۔

اور پھر گل مینہ کی نظریں ایک مرتبان پر جم گئیں۔ اس کے قدموں تلے فرش بہتے دریا میں چلتی کشتی کی مانند ہچکولے کھانے لگا، جیسے اب الٹا کہ تب الٹا۔ اسے ایک بار پھر گرنے سے بچنے کے لیے میز کا سہارا لینا پڑا۔

77

فتح اور کمانڈر ہجوم اور لاؤڈ سپیکر سے آنے والے تقریر کے تیز شور کے درمیان ہونے والی آنکھ مچولی کے دوران چلتے رہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے ہر قدم پر شور بڑھتا جا رہا ہے۔ سڑک تھوڑا گھومی تو فتح نے دیکھا کہ یہ سارا شور شرابا دائیں طرف میدان میں بلند بھوری اینٹوں والی دیواروں کے پیچھے سے آ رہا ہے۔ دیواروں کے آگے پولیس والے کھڑے تھے۔ کمانڈر نے فتح کو سڑک کے کنارے ایک سوزوکی وین کے پیچھے کھڑا کر دیا اور اسے وہاں سے نہ ہلنے کی تلقین کرتے ہوئے آگے چلا گیا۔ اب شور اس قدر بلند ہو گیا کہ کانوں میں درد ہونے لگا۔ کچھ دیر کے بعد کمانڈر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا واپس آ گیا۔ 'جلدی چلو، جلدی،' اس نے کہا۔ 'وقت آ گیا ہے۔ یاد رکھنا جب میں اشارہ کروں تب۔۔۔'

آگے سڑک پر پولیس کی سفید گاڑیاں کھڑی تھیں جنھوں نے ٹریفک کی راہ روک دی تھی، لیکن پیدل لوگ آ جا رہے تھے۔ کمانڈر فتح کو لے کر آگے بڑھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں موبائل فون تھا جو اس نے کانوں کے ساتھ لگایا تھا لیکن بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ اینٹوں والی دیوار کے سامنے جا کر رک گئے۔ اندر سے لاؤڈ سپیکر سے آنے والی آواز ماند پڑ گئی۔ ہجوم کا شور البتہ اب بھی دریا کی طرح جاری تھا۔ پانچ دس منٹ گزرے۔ پھر دیوار میں بڑا سیاہ پھاٹک چرچرا کر کھلا اور اس میں سے قطار میں گاڑیاں نکلنے لگیں۔ اب سڑک پر لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ایک سفید رنگ کی سیاہ شیشوں والی بڑی گاڑی جب پھاٹک سے نکلی تو لوگوں نے نعرے لگانا شروع کر دیے:

'بھٹو دے نعرے وجن گے۔'

کمانڈر نے فتح خان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور اسے لے کر آگے بڑھنے لگا۔

'جے جے جے بھٹو'

Scanned with CamScanner

اب کمانڈر نے فون جیب میں رکھ لیا تھا۔ آس پاس لوگ جمع ہونے لگے، ان میں سے بیشتر نے ہاتھوں میں جھنڈے، بینر اور ڈنڈے اٹھائے ہوئے تھے جن پر باتصویر کارڈ لگے ہوئے تھے۔

'جب تک سورج چاند رہے گا بھٹو تیرا نام رہے گا۔'

سفید رنگ کی گاڑی پھاٹک سے نکل کر بائیں طرف پہنچ کر مڑنے لگی، لیکن اب سڑک لوگوں سے بھر چکی تھی اس لیے گاڑی کی رفتار سست پڑ گئی۔ کمانڈر ایک ہاتھ میں فتح خان کو لیے اور دوسرے ہاتھ سے لوگوں کو دھکیلتا ہوا سفید گاڑی کے قریب جانے لگا۔

'نہ جھکنے والی بے نظیر، نہ بکنے والی بے نظیر۔'

لوگ گاڑی کے چاروں طرف تھے۔ گاڑی بے حد سست روی سے چل رہی تھی۔ اب گاڑی کی چھت پر لگے لاؤڈ سپیکر سے بھی نعرے گونجنے لگے۔ لوگوں نے جنون کے عالم میں ان کا جواب دینا شروع کر دیا۔

'بھٹو کی تصویر بے نظیر بے نظیر۔'

اسی وقت فتح نے دیکھا کہ گاڑی کی چھت کھلی اور اس میں سے سفید دوپٹے اور نیلی قمیص میں ملبوس ایک دراز قد گوری چٹی عورت باہر نکلی، اور زور سے زور سے ہاتھ ہلانے لگی۔ لوگ پاگل ہو گئے۔

'چاروں صوبوں کی زنجیر بے نظیر بے نظیر۔'

کمانڈر نے فتح کا ہاتھ چھوڑ دیا اور چیخ کر کہا، 'فاتح ح ح، وقت آ گیا ہے، جب میں اشارہ کروں، تب۔'

اسی وقت فتح کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے زور سے چٹکی بھری ہے اور وہ کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ گیا ہے۔ اس پر دو باتیں یوں بیک وقت افشا ہوئیں کہ یہ کہنا ناممکن تھا کہ کون سی پہلی آئی اور کون سی بعد میں۔ ایک تو یہ کہ یہ عورت کوئی اور نہیں بلکہ بے نظیر بھٹو ہے، اور دوسرا یہ

کہ وہ کسی اور کو نہیں بلکہ بے نظیر بھٹو کو مارنے کے لیے آیا ہے۔

'آ گئی آ گئی آ گئی بھٹو، چھا گئی چھا گئی چھا گئی بھٹو۔'

فتح کو یاد آیا کہ اس کی ماں دیوانگی کی حد تک بے نظیر بھٹو کی قائل تھی اور اسے قبائل کے اور ملک کے سارے مسئلوں کا حل سمجھتی تھی۔ اس نے فتح سے کہلوا کر انگور اڈا میں حجرے کی باہری دیوار پر لگے ہوئے بے نظیر کے پوسٹروں میں سے ایک منگوایا تھا اور اس کی پشت پر گیلا آٹا تھوپ کر اسے چولہے کے اوپر فتح کی اقبال والی تصویر کے نیچے دیوار پر چسپاں کر دیا تھا۔

'نعرہ نعرہ بھٹو، جیے جیے جیے بھٹو۔'

'تو میرا مشن اس عورت کو ختم کرنا ہے،' فتح نے سوچا۔ 'لیکن خطیب صیب تو مسلسل یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ اسے اسلام کے ایک بدترین دشمن اور ذلیل ترین منافق کو جہنم رسید کرنا ہے جس نے امریکہ کے ساتھ مل کر دنیا بھر کے مسلمانوں کی زندگیاں حرام کر رکھی ہیں اور جو امریکی ڈرون جہازوں کے لیے جاسوسی کرتا ہے اور اسی کی نشان دہی پر وہ آ کر ٹھیک ٹھیک نشانہ لگاتے ہیں۔ انھی ڈرونوں نے خطیب صیب کی نورانی داڑھی خون میں تر بتر کر دی، میرے کئی ساتھی طالبوں کے جسم پارچہ پارچہ کر دیے۔ تو کیا یہ عورت امریکیوں کے لیے مخبری کرتی ہے؟ یہ ان کی جاسوس ہے؟'

'بھٹو کی تصویر بے نظیر بے نظیر۔'

فتح نے جیکٹ سے باہر نکلتی ڈوری تھام لی۔

فتح نے مڑ کر دیکھا۔ سڑک کی دوسری طرف کمانڈر ایک سرخ گاڑی کے پیچھے آدھا چھپا اسے زور زور سے اشارے کر رہا تھا: 'وقت آ گیا ہے، بدلے کا وقت، انتقام کا وقت، سرسراتے لبادوں والی حوروں کا وقت، سرسبز جھاڑیوں اور زیر و برش سے بنے ہوئے باغیچوں کا وقت، انگور کے خوشوں اور شہد کے پیالوں کا وقت۔ دودھ کی نہروں، ہرنیوں کی قلانچوں، کونجوں کی ڈاروں کا وقت۔ سفید محلوں، پھولوں کی قطاروں اور جھیل میں برف پوش پہاڑیوں کے آنکھوں کو خیرہ کر

Scanned with CamScanner

دینے والے عکسوں کا وقت۔'

فتح نے ڈوری اپنی شہادت کی انگلی پر لپیٹ لی۔

لیکن یہ تو یہاں اس شہر میں موجود ہے، اسے میرے مدرسے کا کیا پتہ، یہ تو کبھی اس علاقے میں گئی بھی نہیں ہوگی۔ اور اماں؟ اماں اس سے کتنی محبت کرتی ہے، اگر اسے پتہ چلا کہ میں نے اس عورت کو مارا ہے تو وہ کتنی ناراض ہوگی، مجھے دو ہتڑوں سے پیٹے گی اور پھر صحن میں بال کھول کر بیٹھ کر باپ کو کوستے ہوئے بین کرے گی، جیسے اس نے باپ کے مرنے کی خبر ملنے پر کیا تھا۔

ڈوری پر فتح کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، کمانڈر اب سرخ گاڑی کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر اور چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا لیکن ہجوم کے بے پناہ شور اور گاڑی کے لاؤڈ سپیکر سے بلند ہوتے نعروں کی وجہ سے اسے کچھ سنائی نہیں دیا۔

'جیے جیے جیے بھٹو۔'

'بھٹو دے نعرے وجن گے۔'

'کون بدلے کا ملک کی تقدیر؟'

'بے نظیر، بے نظیر۔'

اتنے میں بھوری داڑھی اور سر پر سرخ ٹوپی پہنے ایک لڑکا فتح کے پہلو سے نکلا اور بازو سفید گاڑی کی طرف اٹھا دیا۔ فتح خان نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ نشانہ باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

'اے لے کیا کل لئے ہو؟' فتح نے چیخ کر پشتو میں کہا، اور بائیں ہاتھ سے اس کا بازو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن اس نے فتح خان کا ہاتھ جھٹک کر گاڑی کی طرف فائر کر دیا۔

ڈوری فتح خان کے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی پر لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے پہلے انگلی سے ڈوری نکالنے کا سوچا، لیکن اس کا وقت نہیں تھا۔ اس نے لڑکے کو قلادے میں بھر کر ڈوری کھینچ دی۔

گل مینہ نے دیکھا کہ مرتبان کے سیال میں تیرتے ہوئے اس کے سیاہ چمک دار بال روشن ماتھے پر سرسرا رہے تھے۔۔۔ وہی ماتھا، جسے اس نے ہزاروں بار چوما ہوگا۔۔۔ ناک کا ہلکا سا خم اپنے باپ زرجانان کی طرف اشارہ کر رہا تھا، تو دوسری طرف گالوں سے شوخی ابھی پوری طرح رخصت نہیں ہوئی تھی۔ ساتویں جماعت کی گروپ تصویر میں فتح خان دوسری قطار میں دائیں سے تیسرے نمبر پر کھڑا تھا۔ یہاں اس کا مرتبان سب سے اوپر والی قطار میں دائیں طرف سب سے پہلے نمبر پر تھا۔ ٹھوڑی پر ایک زخم کے علاوہ چہرہ بالکل صاف تھا۔

اس کے پیچھے کھڑے شفیق نے بھی فتح خان والا مرتبان دیکھ لیا تھا۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

گل مینہ الماری کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ اب اس کی ٹانگیں نہیں کپکپا رہی تھیں۔ کون لوگ ہیں وہ جنھوں نے میرے معصوم بچے کو اس کام پر مجبور کیا؟ وہ بچہ جس کا دل پھول توڑنے پر بھی دکھتا تھا، کس طرح اس حال کو پہنچ گیا؟ اور وہ بھی اس قدر بھیانک طریقے سے؟

شفیق گل مینہ کے قریب آ گیا۔ 'بہن جی، فتح خان نے ایک ماہ تک میرے ساتھ کام کیا ہے،' اس کی آواز لرز رہی تھی۔ 'یقین جانو، اس قدر ذہین بچہ تھا کہ اسے ایک چیز سکھاؤ تو چار سیکھ لیتا تھا۔ کبھی اسے کسی کام کا دوبارہ نہیں کہنا پڑا۔ میرے درجنوں شاگرد رہے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی اس قدر ہوشیار اور سمجھ دار نہیں تھا، جتنا فتح۔'

شفیق اور بھی کچھ کہتا رہا لیکن گل مینہ کے کانوں میں یہ آوازیں ایسے آ رہی تھیں جیسے دریا میں ڈوبتے ہوئے شخص کو کنارے پر کھڑے لوگوں کی بات چیت سنائی دیتی ہے۔

'میں نے اس کی تصویر جان کر نہیں بنائی تھی، بلکہ اس لیے بنائی تھی کہ اس کی شکل مجھے

Scanned with CamScanner

سب سے زیادہ یاد تھی کیوں کہ وہ ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ مجھے بالکل نہیں پتہ تھا کہ اسی نے پچھلے دنوں۔۔۔'

تو یہ وہ قبرستان ہے جسے دکھانے کا وعدہ میڈم رخسانہ نے کیا تھا؟ مگر یہ کیسا قبرستان ہے جس میں شیشے کی قبریں ہیں جن میں مٹی کی جگہ پانی بھرا ہے۔ یہ کیسی قبریں ہیں جہاں سنگِ مرمر کی لوحوں کی بجائے کاغذ کی چھوٹی چھوٹی چٹیں لگی ہیں۔ نہ جانے ان پر کیا لکھا ہے۔ باپ کا نام، تاریخ پیدائش، اللہ رسول کا نام، جواں مرگ کے بارے میں کوئی شعر؟ یہ کیسی قبریں ہی جن سے لپٹا بھی نہیں جا سکتا، ان پر پھول رکھے جا سکتے ہیں، نہ چراغ جلائے جا سکتے ہیں۔ میرے دل میں سالہا سال سے ایک قبر تازہ کھدی ہوئی ہے۔ ابھی تک اس کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی۔ اس نئی قبر کے لیے جگہ کہاں سے آئے گی؟

'وہ شام کو کام ختم کرتے وقت ہر چیز صاف ستھری کر کے اپنی جگہ پر رکھ دیتا تھا، اور صبح سویرے میرے آنے سے پہلے ہی ساری چیزیں تیار کر دیتا تھا۔ میرے بتائے بغیر ہی اسے پتہ ہوتا تھا کہ کس وقت کس چیز کی ضرورت پڑے گی۔'

گل بینہ کے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ فتح خان کی یادیں، اس کی پیدائش، پہلی بار مسکرانا، پہلا لفظ، پہلا قدم۔ ملیشیا کے کپڑے اور سیاہ ٹوپی سر پر جما کر، چمڑے کی چھوٹے چھوٹے چپل پہن کر، گلے میں بستہ لٹکا کر پہلی بار سکول جانا۔ یہ ساری تصویریں اس کے ذہن میں ایک کے بعد ایک کر کے آتی تھیں اور رکے بغیر سیاہی کے مرغولوں میں مدغم ہو جاتی تھیں۔

'اس نے صحیح طریقے سے برش پکڑنا اور رنگ کرنا اتنی تیزی سے سیکھا کہ میں حیران رہ گیا۔ دوسرے شاگردوں کو شروع میں مارنا پیٹنا پڑتا ہے لیکن اسے کبھی ڈانٹنے تک کی نوبت نہیں آئی۔'

یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی قبر ہونی چاہیے۔ کہیں بھی، کیسی بھی قبر۔ جہاں میں آ کر بین کر سکوں۔ اس کے ساتھ باتیں کر سکوں۔

'مہینے کے آخر تک تو وہ مجھے کئی ایسے مشورے دینے لگا تھا جو خود میرے ذہن میں بھی نہیں آئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو بہت بڑا پینٹر بن سکتا تھا۔ اور مجھے ابھی ابھی خیال آیا ہے کہ اس نے آخری دن صبح سویرے میرے آنے سے پہلے آ کر پینٹنگ کے ایک حصے کو سرخ رنگ دیا تھا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن اب۔۔۔' شفیق کا گلا رندھ گیا۔

گل بینہ نے اچک کر فتح خان کے مرتبان تک پہنچنے کی کوشش کی۔ وہ اس کی پہنچ سے باہر تھا۔ رخسانہ دروازے کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے بولی، 'یہاں کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔ تمھیں نہیں پتہ کہ میں کتنی مشکلوں سے تمھیں یہاں لے کر آئی ہوں۔ ورنہ یہاں تو باہر کا پرندہ بھی پر نہیں مار نہیں آ سکتا۔'

لیکن گل بینہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے الماری مضبوطی سے تھام لی اور اسے جھٹکے دینے لگی۔ رخسانہ نے تیزی سے قریب آ کر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن گل بینہ کے اندر نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ اس نے بھاری الماری کو ہلا کر رکھ دیا۔ رخسانہ نے اس کے کندھے پکڑ لیے لیکن گل بینہ نے آخری ہلا ایسا دیا کہ الماری دھڑام سے نیچے آ گری۔ گل بینہ اور رخسانہ اس کے نیچے آنے سے بال بال بچے۔ الماری گرنے سے اس کے اندر رکھے مرتبان کمرے کے فرش پر زوردار چھناکے کے ساتھ چکنا چور ہو گئے اور ان کے اندر موجود سیال دھل دھل بہنے لگا۔ شیشے ٹوٹنے کے بعد ان میں مقید سر آزاد ہو گئے اور فرش پر لڑھکنے لگے۔

ایک میز کے کونے میں لوہے کی چھوٹی سی تکون پر شیشے کا ایک چونچ دار برتن رکھا تھا جس میں پیشاب کی رنگت کا کوئی مائع ابل رہا تھا۔ برتن کے نیچے گیس کے ننھے سے شعلے کی نیلی زبان لہرا رہی تھی۔ مرتبانوں میں بند سیال کے چند چھینٹے اس پر گرے تو ایک ہلکا سا جھماکا ہوا۔ ایک چنگاری نیچے گری۔ فرش پر بہتے سیال نے اتنی تیزی سے آگ پکڑی جیسے آسمانی بجلی کی شاخیں بادلوں میں لہراتی ہیں۔ آن کی آن میں شعلوں کی لپکتی ہوئی زبانیں دوسری الماریوں میں

Scanned with CamScanner

رکھے مرتبانوں تک بھی پہنچ گئیں۔ مرتبان ایک ایک کر کے دھماکوں سے پھٹنے اور زمین پر گرنے لگے۔ جب کوئی مرتبان جلتی آگ میں گرتا تو اس کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹ جاتا اور اس کے اندر پڑا سرآتش بازی کے گولے کی طرح ہوا میں اچھل جاتا تھا۔ آناً فاناً درجنوں سرفٹ بالوں کی طرح چھت سے، دیواروں سے یا ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر زمین پر لڑھکنے لگے۔

چند لمحوں کے اندر اندر کمرہ دہکتے ہوئے جہنم کا نمونہ بن گیا۔

کئی گھنٹوں کے محنت کے بعد عمارت میں بھڑکنے والی آگ بجھا دی گئی۔ اس روز چھٹی تھی اس لیے جانی نقصان کچھ زیادہ نہیں ہوا۔

البتہ عمارت کے شمالی کونے کے ایک کمرے کے خاکستر سے اکتالیس کھوپڑیاں ملیں، جن میں سے صرف تین اپنے اپنے دھڑوں سے منسلک تھیں۔

Scanned with CamScanner

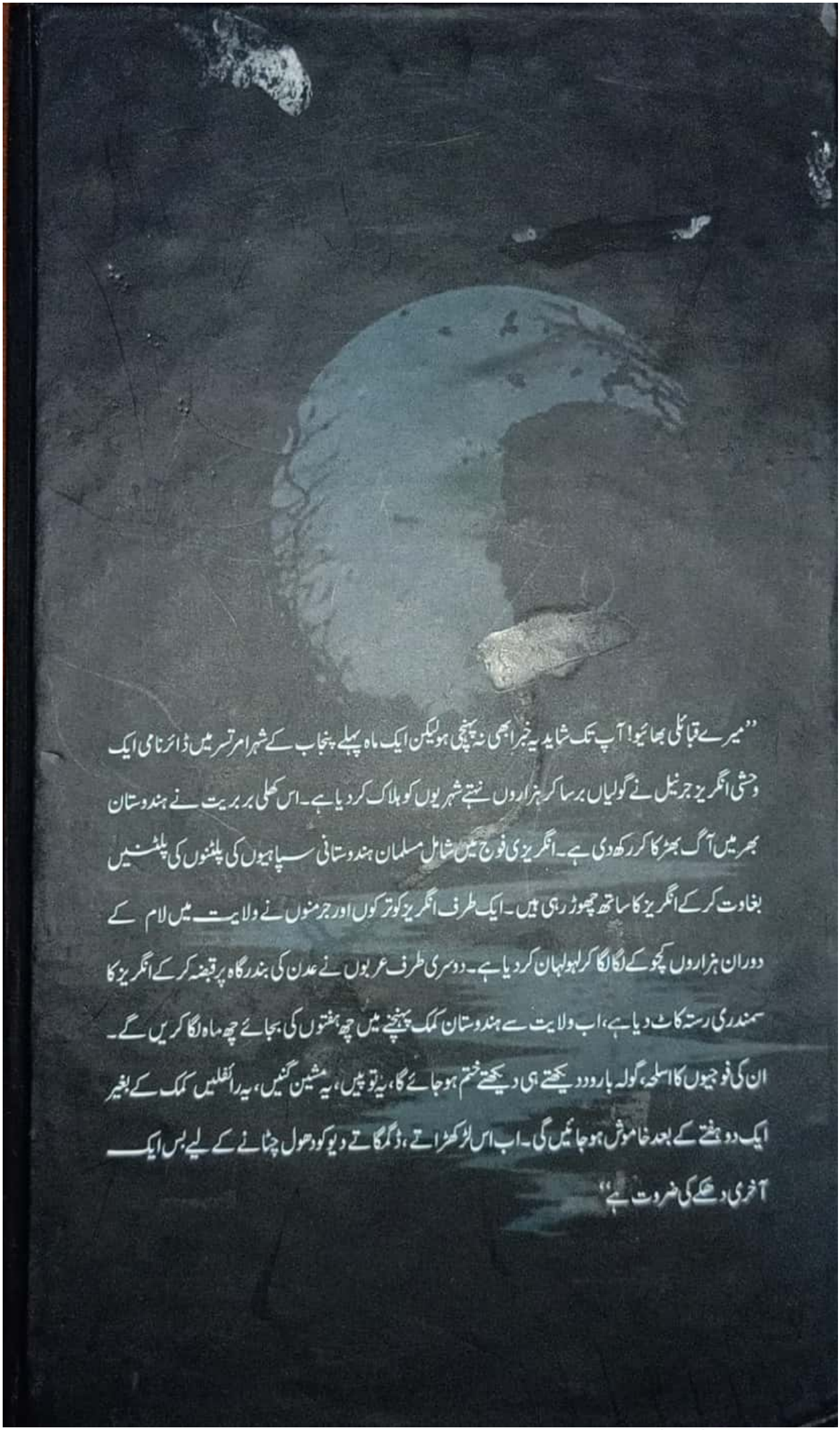

''میرے قبائلی بھائیو! آپ تک شاید یہ خبر ابھی نہ پہنچی ہو لیکن ایک ماہ پہلے پنجاب کے شہر امرتسر میں ڈائر نامی ایک وحشی انگریز جرنیل نے گولیاں برسا کر ہزاروں نہتے شہریوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس کھلی بربریت نے ہندوستان بھر میں آگ بھڑکا کر رکھ دی ہے۔ انگریزی فوج میں شامل مسلمان ہندوستانی سپاہیوں کی پلٹنوں کی پلٹنیں بغاوت کر کے انگریز کا ساتھ چھوڑ رہی ہیں۔ ایک طرف انگریز کو ترکوں اور جرمنوں نے ولایت میں لام کے دوران ہزاروں کچوکے لگا لگا کر لہولہان کر دیا ہے۔ دوسری طرف عربوں نے عدن کی بندرگاہ پر قبضہ کر کے انگریز کا سمندری رستہ کاٹ دیا ہے، اب ولایت سے ہندوستان کمک پہنچنے میں چھ ہفتوں کی بجائے چھ ماہ لگا کریں گے۔ ان کی فوجیوں کا اسلحہ، گولہ بارود دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جائے گا، یہ توپیں، یہ مشین گنیں، یہ رائفلیں کمک کے بغیر ایک دو ہفتے کے بعد خاموش ہو جائیں گی۔ اب اس لڑکھڑاتے، ڈگمگاتے دیو کو دھول چٹانے کے لیے بس ایک آخری دھکے کی ضرورت ہے''